افلاطون

حیات، تعلیمات وفلسفہ
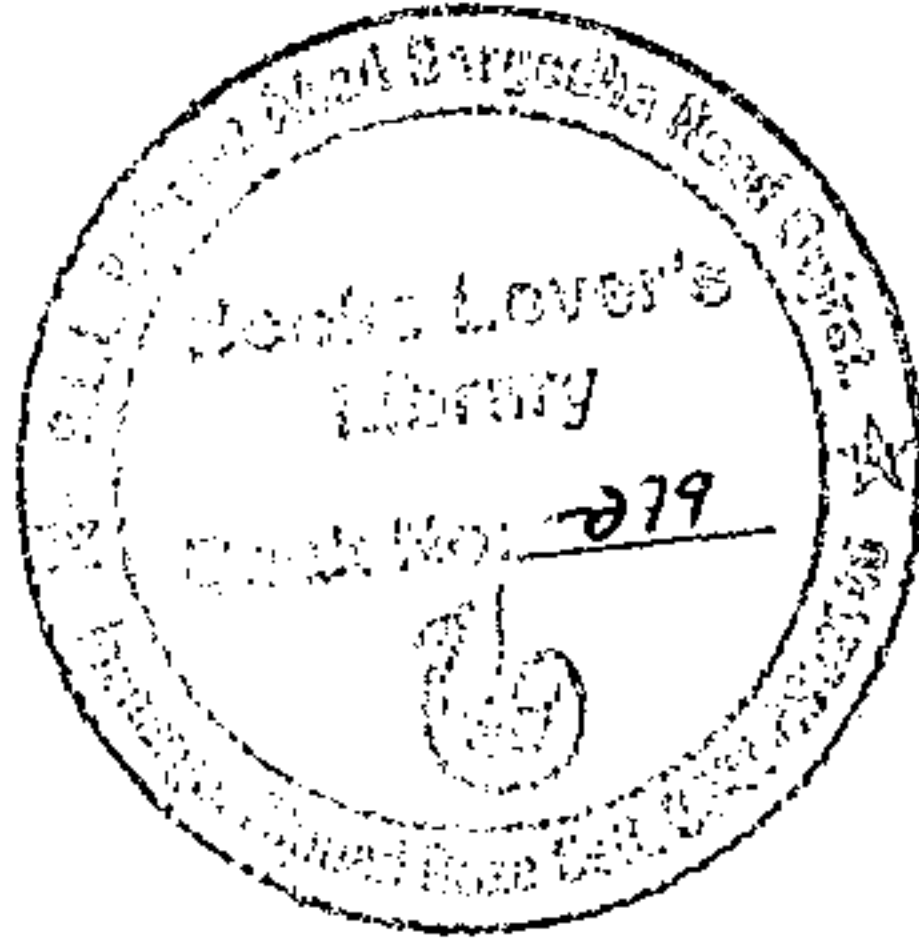
یونانی فلاسفر، سقراط کے شاگرد اور ارسطو کے استاد

افلاطون کی مکمل سوانح عمری اور نظریاتِ فلسفہ کا مجموعہ

افلاطون (PLATO) (427ق م تا 347ق م)

حیات، تعلیمات و فلسفہ

کامران اعظم سوہدروی (ایم اے)

CITY BOOK POINT

Naveed Square, Urdu Bazar, Karachi

Ph # 021-32762483,

Email: citybookurdubazaar@gmail.com

باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت اور معیاری کتاب

بیاد

HASAN DEEN

ادارہ City Book Point کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں ادارے کا مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہونا لازمی نہیں۔

نام کتاب :افلاطون(plato) حیات، تعلیمات وفلسفہ

مصنف :کامران اعظم سوہدروی

ناشر :سٹی بک پوائنٹ

کمپوزنگ :عبداللہ کمپوزنگ سینٹر

اشاعت :2013ء

قیمت :-/400روپے

فہرست

☆☆☆☆☆

Books Lover's
Library
Book No: 279

افلاطون (نظم)

کلام: کامران اعظم سوہدروی

خرد کا راز داں، حِلمت کا پاسباں ہے کوئی
جہانِ فلسفہ کی عجب داستاں ہے کوئی

مکالماتِ فلاطون کا ہے طرز، نیا
مکاں کے درمیاں ہے پھر بھی لامکاں ہے کوئی

ہر ایک لفظ میں نہاں ہے کاروانِ گماں
نوائے کائنات، محرمِ جہاں ہے کوئی

تمام نقش میں ہے سوزِ چار سُو کا الم
وجودِ زیست سے اُٹھتی ہوئی فغاں ہے کوئی

رہا ہے بزمِ ہست و بود کا جو حلقہ نشیں
کسی کا علم ہے، عمل ہے اور گماں ہے کوئی

ملا ہے رنگ، حقیقت کا زندگی کو ابھی
نہیں تقدیر سے، تدبیر سے نالاں ہے کوئی

نشانِ منزلِ مراد کی طلب ہے اسے
اگرچہ فرد فرد ہے وہ کارواں ہے کوئی

''فلاطون'' کے عنوان کے تحت اقبال نے ضرب کلیم میں دو اشعار لکھے ہیں

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مرد دانشمند
حیات ہے شبِ تاریک میں شرر کی نمود
حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

افلاطون نامہ

رہے گا فکر ترا اس جہاں میں خوار و زبوں
اگر احساس میں آیا نہ سوزِ افلاطوں

فلاطوں کی خرد ہے مری داستاں میں ابھی
کہ میرے شوق میں عہدِ عتیق رازِ جنوں

یہ فلسفۂ فلاطون یا وحدت کا بیاں
کسی کی یاد سے ملتا ہے زندگی میں سکوں

مری خرد میں نہیں نقشِ فلاطوں کی رمق
مرا بیرون جو نہیں ہے آشنائے دُروں

مثالِ افلاطون، دیکھ کائنات اگر
نشانِ علم ہے، تماشا ہائے کن فیکوں

کلام: کامران اعظم سوہدروی (ضلع گھونکی، سندھ)

دیباچہ

افلاطون حقیقی معانوں میں فلسفہ کا سرخیل وبانی ہے کیوں کہ اسی کے توسط سے ہم کو یہ مواد تحریری صورت میں ملتا ہے اور آج کا جدید فلسفہ اسی فلسفہ قدیم کا عکاس ہے اور اسی قدیم فلسفہ سے جدید راہیں متعین کی جاسکتی ہیں جو آج ہمارے درمیان تحریری صورت میں موجود ہے۔ اس سے پہلے تحریر نقوش نہیں مرتب کیے گئے تھے۔

مغربی فکر پر عمیق ترین اثرات مرتب کرنے والا نہایت تخلیقی فلسفی افلاطون ایتھنز کے ایک ارسٹوکریٹک گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ارسٹون ایتھنز کے ابتدائی بادشاہوں کی نسل سے تعلق رکھتا تھا اور ماں Perictione چھٹی صدی قبل مسیح کے قانون دہندہ سولون کی دور پار کی رشتہ دار تھی۔ افلاطون ابھی بچہ ہی تھا کہ باپ مرگیا اور ماں نے Pyrilampes سے شادی کر لی جو ریاست کار پیریکلیز کا قریبی ساتھی تھا۔

عہد جوانی میں افلاطون سیاسی اولوالعزمی رکھتا تھا لیکن ایتھنز کی سیاسی قیادت سے مایوس ہو گیا۔ انجام کار وہ سقراط کا شاگرد بنا اور اسی کا بنیادی فلسفہ اور جدلیاتی انداز بحث اپنا لیا یعنی سوالات' جوابات اور اضافی سوالات کے ذریعہ سچائی کی جستجو' افلاطون نے 399 ق م میں ایتھنی جمہوریہ کے ہاتھوں سقراط کی موت اپنی آنکھوں سے دیکھی شاید وہ اپنی حفاظت کے پیش نظر عارضی طور پر ایتھنز سے چلا گیا اور اٹلی' سسلی اور مصر میں گھومتا پھرتا رہا۔ 387 قبل مسیح میں افلاطون نے ایتھنز میں اکیڈمی کی بنیاد رکھی جسے عموماً یورپ کی پہلی یونیورسٹی کہا جاتا ہے۔ اس نے ایک جامع نصاب مہیا کیا جس میں فلکیات و حیاتیات' ریاضی' سیاسی نظر اور فلسفے جیسے موضوعات شامل تھے۔ ارسطو ادارے کا ممتاز ترین طالب علم تھا۔

فلسفہ اور عملی سیاسیات کو ملانے کا ایک موقعہ تلاش کرتے ہوئے افلاطون 367 ق م میں سسلی گیا اور سیراکیوس کے نئے حکمران ڈائیونی سیئس اصغر کو فلسفیانہ حکومت کا فن

سکھانے لگا۔ تجربے ناکام رہے' افلاطون 361 ق م میں دوبارہ سیراکیوس گیا لیکن اس بار بھی سسلی کے امور میں مشغولیت سے زیادہ کامیابی نہ ہوئی' اس نے اپنی زندگی کے آخری برس اکیڈمی میں لیکچر دیتے اور لکھتے ہوئے گزارے۔

افلاطون معروضی عینیت (Objective Idealsim) کا بانی تھا۔ عینیت پسندانہ نظریہ دنیا کا دفاع کرتے ہوئے وہ اپنے دور کی مادیت پسندانہ فکر سے برسر پیکار رہا۔ اس نے سقراط' فیثا غورث' پارمینائیڈز اور ہیراکلیتس کی تعلیمات کو بہت زیادہ استعمال کیا۔ ہستی یا وجود (Being) کی وضاحت کرنے کی خاطر افلاطون نے اشیاء کی غیر مادی امثال کے وجود کا نظریہ وضع کیا۔ وہ ان امثال یا تمثیلات کو "Forms" یا "Ideas" (اعیان) کا نام دیتا اور وجود کے ساتھ شناخت کرتا ہے یوں سمجھ لیں کہ وہ سایوں کی بنیاد پر اصل چیزوں کی مادی حیثیت کو کھوجتا ہے۔ اس کے مطابق ''امثال'' یا ''مادہ'' کی پیداوار حسی ادراک کی دنیا ایک درمیانی حیثیت رکھتی ہے امثال ابدی ''ماورائے افلاک'' ہیں وہ نہ جنم لیتے اور نہ ختم ہوتے ہیں وہ زمان ومکان پر انحصار رکھتے ہیں۔ قابل ادراک اشیاء عارضی' نسبتی اور زمان ومکاں پر منحصر ہیں روحِ عالم کی تعلیم افلاطون کی تکوینیات (علم کائنات) کا مرکز ہے اور جس میں آباد روح کی تجسیم نو اُس کی نفسیات میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ افلاطون مختلف قابل ادراک اشیاء کی بنیاد پر علم کی اقسام بیان کرتا ہے۔ صرف حقیقی طور پر موجود ''امثال'' کا معتبر علم ہی ممکن ہے' اس قسم کے علم کا منبع لافانی روح انسانی کا دنیائے امثال سے آگاہ رہنا ہے۔ ہم حسی اشیاء اور مظاہرہ کا علم حاصل نہیں کرسکتے بلکہ محض ایک قیاسی ''رائے'' قائم کرنا ہی ممکن ہے۔ افلاطون نے امثال اور قابل ادراک اشیاء کے درمیان میں استدلالی علم سے قابل رسائی ریاضیاتی معروضات کو رکھا۔ شناخت اور آگہی کا طریقہ کار جدلیات ہے جسے افلاطون ایک دورخہ عمل سمجھتا تھا' درجہ درجہ عمومی نوعیت کے تصورات سے اعلیٰ ترین تصورات تک جانا اور پھر نہایت عمومی تصورات سے درجہ بدرجہ نیچے کی طرف کم سے کم عمومیت کی جانب آنا' اس عمل میں نیچے کی طرف آنا صرف اشکال (اعیان) سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں قابل ادراک اشیاء ملوث نہیں۔

افلاطون ایتھنی ارسٹوکریسی کا نمائندہ تھا۔ معاشرے کے بارے میں اس کی

تعلیمات نے ایک مثال ارسٹوکریٹک ریاست کی تصویر کشی کی جس کی بنیاد غلام داری محنت پر تھی۔

افلاطون کے مطابق مثالی ریاست تین طبقات پر مشتمل ہے، ریاست کا انتظامی ڈھانچہ تاجر اور کاروباری طبقہ چلاتا اور قائم رکھتا ہے۔ حفاظتی ضروریات عسکری طبقہ اور سیاسی قیادت فلسفی بادشاہ فراہم کرتا ہے، کسی شخص کے طبقے کا ایک تعین ایک تعلیمی علم سے ہوتا ہے جو پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا اور اس شخص کی دلچسپی اور قابلیت سے مطابقت رکھنے والی تعلیم کا زیادہ سے زیادہ اعلیٰ درجہ حاصل ہونے تک جاری رہتا ہے۔ سارا تعلیمی عمل کامیابی سے انجام دینے والے افراد فلسفی بادشاہ بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے ذہن اس طرح ترقی یافتہ ہوتے ہیں کہ وہ اشکال کو سمجھنے اور یوں دانش مندانہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت افلاطون کے تعلیمی نظام کا اصل مقصد فلسفی بادشاہ پیدا کرنا ہے۔ کارل مارکس نے کہا کہ افلاطون یونانی ''پولس'' (شہری ریاست) کی تشکیل میں تقسیم محنت کے کردار سے پوری طرح آگاہ تھا۔

افلاطون نے روایتی فضائل اخلاق (Virtues) کو مثالی ریاست کے طبقاتی ڈھانچے سے منسلک کر دیا۔ صبر و استقامت دستکار طبقے کی منفرد خوبی ہے، ہمت و حوصلہ عسکری طبقے کا وصف ہے، اور دانائی حکمرانوں کا امتیازی نشان ہے۔ چوتھی خوبی انصاف بحیثیت عمومی معاشرے کی کردار سازی کرتی ہے۔ عادل ریاست وہ ہے جس میں ہر طبقہ دیگر طبقات کی سرگرمیوں میں مداخلت کئے بغیر اپنا اپنا کام کرے۔

افلاطون روح انسانی کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے: منطقی حصہ، ارادہ اور اشتہائیں۔ عادل شخص وہ ہے جس میں منطقی عنصر، ارادے کی حمایت سے، اشتہاؤں (Appetites) کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہاں بھی ریاست کے تین طبقاتی ڈھانچے والی واضح صورت (تمثیل) موجود ہے جس میں صاحب بصیرت فلسفی بادشاہ سپاہیوں کی مدد سے باقی معاشرے پر حکومت کرتے ہیں۔

افلاطون کی اخلاقیات (اخلاقی نظام) کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ نیکی عمل ہے اور یہ سکھائی جا سکتی ہے، اور اسے نظریۂ امثال کے حوالے سے سمجھنا چاہیے۔ جیسا کہ پیچھے کہا

گیا، افلاطون کے لئے منطق ''صورت'' نیکی کی صورت ہے، اور اس صورت کا علم اخلاقی فیصلہ سازی میں رہنمائی کا ماخذ ہے۔ افلاطون نے یہ بھی کہا کہ نیکی یا اچھائی کو جاننا ہی نیکی کرنا ہے۔ اس اخذ کردہ نتیجے کا منبع افلاطون کا یہ یقین ہے کہ اخلاقی آدمی حقیقی طور پر مسرور آدمی ہے، اور چونکہ افراد ہمیشہ اپنی ہی مسرت چاہتے ہیں اس لئے وہ ہمیشہ اخلاقی کام ہی کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

آرٹ اور آرٹسٹ کے بارے میں افلاطون کا نکتۂ نظر بنیادی طور پر مخاصمانہ تھا: اگرچہ اس نے آرٹ کی مخصوص مذہبی اور اخلاقی اقسام کو منظور کیا۔ یہاں بھی اس کا نکتۂ نگاہ نظریۂ امثال سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً ایک خوبصورت پھول ہمہ گیر تمثال ''پھول پن'' اور ''خوبصورتی'' کی نقل ہے۔ مادی پھول میں سے حقیقت یعنی امثال کا ایک مرحلہ خذف ہوگیا۔ چنانچہ پھول کی تصویر میں حقیقت کے دو مراحل کا فقدان ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب ہوا کہ آرٹسٹ علم سے دو مراحل پیچھے ہے، اور واقعی افلاطون نے آرٹسٹوں پر گاہے بگاہے یہی اعتراض کیا کہ وہ کچھ کرتے ہیں اس کا حقیقی علم نہیں رکھتے۔

فلسفہ کی تمام تاریخ میں افلاطون کا اثر بہت گہرا ہے۔ اس کی موت کے بعد Speusippus اکادمی کا سربراہ بنا۔ اکادمی 529ء تک قائم رہی جب بازنطینی شہنشاہ جسٹینیئن اول نے بت پرستانہ (پاگان) تعلیمات کا الزام عائد کر کے اسے بند کیا۔ پہلی صدی عیسوی کے سکندریائی فلسفی فیلو جوڈیئس کے کام میں یہودی فکر پر افلاطون کا اثر واضح ہے۔ تیسری صدی عیسوی کے فلسفی پلوٹینس کے قائم کردہ نوفلاطونی مکتبۂ فکر نے افلاطونیت کو نئی صورت دی۔ ماہرین الٰہیات سکندریہ کا کلیمنٹ، اوریگن اور سینٹ آگسٹائن افلاطونی طرزِ فکر کے ابتدائی مسیحی نمائندے تھے۔ مسیح دینیات کے علاوہ قرونِ وسطیٰ کی اسلامی فکر پر بھی افلاطونی نظریات کا گہرا اثر مرتب ہوا، جیسا کہ ہم متعلقہ مضامین میں غور کریں گے۔

نشاۃ ثانیہ کے دوران افلاطونی اثرات کا بنیادی مرکز فلورنس کی اکیڈمی تھی جو پندرہویں صدی میں قائم ہوئی۔ اکیڈمی کے ارکان نے مارسیلیو فی چینو کی زیرِ قیادت اصل یونانی زبان میں افلاطون کا مطالعہ کیا۔ انگلینڈ میں افلاطونیت کو سترہویں صدی میں رالف Cudworth اور ''کیمبرج فلاطونیوں'' نے دوبارہ زندہ کیا۔ بیسویں صدی میں الفرڈ

نارتھ وائٹ ہیڈ جیسے مفکرین بھی افلاطون کے اثر میں آئے۔ وائٹ ہیڈ نے تاریخ فلسفہ کو محض ''افلاطونی فکر کے حواشی کا ایک سلسلہ'' قرار دیا۔ افلاطون نے جس فلسفیانہ افکار کی بنیاد رکھی، وہی آج جدید فلسفے کا شاخسانہ ہے۔

افلاطون کے نظریات میں حقیقت وتصورات کا گہرا رجحان ان کو دیگر فلاسفہ سے ممیز کرتا ہے، کتاب کا انتساب محمود احمد کاشمیری (م، 16 فروری 2013ء) اور خالد مجید مہر (سماجی وسیاسی کارکن) کے نام کرتا ہوں۔

کامران اعظم سوہدروی
0307-3386433
(ضلع گھوٹکی، سندھ)

تعارف

ایتھنز (ATHENES)

جنوب مشرقی یونان میں شہر، ملک کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر، یہ تین طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے، دو چھوٹی چھوٹی ندیاں شہر کے اندر سے گزرتی ہیں۔ اپنے بندرگاہ پاریئس کے ساتھ یہ ایک متحدہ میٹروپولیٹن خطہ تشکیل دیتا ہے۔ ایتھنز یونان کی معاشی ثقافتی اور سیاسی زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ 2000ء میں شہر کی آبادی 3116000 تھی، یونان کی صنعتی سرگرمی کا ایک بہت بڑا حصہ آس پاس مرکوز ہے۔ اگرچہ شہر کا پیشتر حصہ انیسویں صدی کے وسط سے بعد کا ہے، لیکن قدیم دور کے شہ پارے اب بھی موجود ہیں۔ ایکروپولس سب سے نمایاں ہے، ایک چپٹی چوٹی والی پہاڑی جس پر پارتھینون اور پانچویں صدی قبل مسیح سے تعمیر کی گئی، متعدد دیگر خوبصورت عمارات کے آثار ملتے ہیں۔ ایتھنز کا ایکروپولس نوحجری ادوار سے آباد ہے، 1400 ق م میں بھی اسے مائی سینے، تیرنس، اور کانسی کے دور کے دیگر قلعوں کی طرح فصیل بند کیا گیا تھا، بعد کے آنے والے تاریک دور میں (1200 تا 900 ق م) مائی سینیائی یونانیوں کے درمیان وسیع جنگ و جدل کے دوران ایتھنز ایٹیکا میں چھوٹی چھوٹی متعدد ریاستوں میں سے ایک تھا۔

نویں صدی قبل مسیح کے وسط میں آ ر پ س کا علاقہ ایتھنز کی شہری ریاست میں شامل ہوگیا، جب بادشاہت کی جگہ اشراف کی چندسری حکومت نے لی تو عام لوگوں کو چند ایک ہی حقوق حاصل تھے۔

شہر کو اریوپیکس (بوڑھوں کی مجلس) کنٹرول کرتی تھی، جو تین مجسٹریٹ یا آرکنز تعینات کرتے، یہ آرکنز جنگ مذہب اور قانون کے لئے ذمہ دار تھے، اس نظام سے نالاں سائیلون نے 632 ق م میں مطلق العنان حکومت قائم کرنے کی ایک کوشش کی، کافی نزاع

کے بعد بالآخر 594ق م میں سولون کو متفقہ طور پر آرکن بنایا گیا، سولون نے ایک مجلس، ایک عوامی اسمبلی اور قانونی عدالت میں قائم کیں، تاہم اس کی اصطلاحات جزواًہی کامیاب ہوئیں، 560ق م میں آمر پسی سٹرائس نے اشرافیہ کی حمایت کے ساتھ ایتھنز پر کنٹرول حاصل کیا، اس نے اگورا (بازار) میں سولون کی مجلس کے اجلاس کی جگہ کو وسیع کروایا، اور ایتھنا کا ایک نیا معبد تعمیر کروایا، جو شہر کی سرپرست دیوی تھی، 480ق م میں فارسیون نے ایتھنز کو لوٹا اور تقریباً تباہ کر کے رکھ دیا، ایتھنی رہنما تھیمسٹوکلیز نے فارسی حملہ آوروں کو سلامس کے مقام پر شکست دینے کے بعد شہر کی بحالی شروع کر دی، اور فصلیں بنوائیں، پھر اس کام کو پیریکلیز نے جاری کروایا، موخرالذکر نے ایتھنز کو کسی بھی اور جمہوری حکمران کی نسبت زیادہ عظمت عطاء کی، ایتھنز ایک سامراجی قوت بن گیا، اس کے درباروں نے سارے ایجیائی علاقے سے آنے والے مقدمات کی سماعت کی، شہر کی ثقافت عالی شان تھی، ڈایونی سس کے تھیٹر میں عظیم ٹریجڈیز اور کامیڈیز پیش کی گئیں۔اپنے عہد عروج میں اس کی آبادی 2 لاکھ تھی، جن میں 50 ہزار مرد باقاعدہ شہری تھے، بقیہ عورتیں، غیر ملکی اور غلام ـــــ شہری کا درجہ نہیں رکھتے تھے، تباہ کن پیلونیشیائی جنگ (431 تا 404ق م) میں سپارٹا کے ہاتھوں شکست کے بعد شہر کا زوال شروع ہوا، روایتی نظریات پر سوال اٹھانے کے جرم میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کیا گیا، اور ریاسیت کا ایک ماحول طاری ہوگیا، پھر وہ فلسفہ ترقی کرتا گیا چوتھی صدی قبل مسیح میں افلاطون کی اکیڈمی اور ارسطو کا لائیم، آئیسوکوئیس اور دیگر نے علم بدیع کو ایک فن لطیف بنادیا، 338ق م میں مقدونیہ کے ہاتھوں اپنی خودمختاری کھودینے کے باوجود ایتھنز بدستور ایک اہم ثقافتی مرکز بنا رہا، 146ق م میں یہ رُوم کے قبضہ میں آگیا، لیکن 86ق م میں رومنوں کی لوٹ مار کا نشانہ بننے سے پہلے تک رومنوں سے اچھے تعلقات قائم رکھے، اس سب کے باوجود ایتھنز مرکز علم رہا، تیسری صدی عیسوی میں گوتھوں نے اسے نقصان پہنچایا، جنہیں مشکل کے ساتھ مار بھگایا گیا، 529عیسوی میں عیسائی شہنشاہ جسٹینین نے پاگان (بت پرست) فلسفیانہ مکاتب فکر کو بند کردیا، اور شہر کی کلاسیکی روایت کو بالکل ختم کر کے رکھ دیا، بازنطینی عہد کے دوران ایتھنز ثقافتی لحاظ سے تھس ہوگیا، شہر کے بہت سے فن پارے قسطنطنیہ منتقل کردئے گئے، اور

معبد عیسائی کلیسا بن گئے، بازنطینی شہنشاہ گاہے بگاہے ایتھنز آتے لیکن شہر زیادہ تر نظر انداز اور فلاکت زدہ رہا، بازنطینی میلیسیوں نے 1204ء میں جب قسطنطنیہ فتح کیا، تو ایتھنز ایک فرانسیسی جاگیر بن گیا، کپٹالان 1311ء میں یہاں قابض ہوئے، لیکن فلورنسی سلطنت نے چودہویں صدی میں ایتھنز کا مکمل کنٹرول حاصل کر لیا تب ایھتنا دیوی کے اہم معبد کے طور پر تعمیر ہونے والا پارتھینون مسجد میں بدل دیا گیا، عثمانی حکومت کے تحت شہر بدستور یونانیوں کا اختیار رہا، یہاں ترکوں یونانیوں اور سلاووں کی ملی جلی آبادی رکھی تھی، 1687ء میں ایک بارود خانہ پھٹ جانے سے پارتھینون کو شدید نقصان پہنچا، یونانی جنگ آزادی (1821ء 1819ء) نے شہر کو عثمانی حکومت سے آزاد کروادیا، اور اسے جدید یونان کا دارالحکومت بنادیا، بادشاہ اوٹو کے عہد حکومت (62-1832ء) میں جرمن معماروں بالخصوص ایڈورڈ شوبرٹ نے شہر کو کافی حد تک دوبارہ تعمیر کروایا، بیسویں صدی میں ایک اہم یورپی تجارتی و صنعتی مراکز بن کر ابھرنے سے قبل یہ اپنی قدیم عمارات کی وجہ سے سیاحوں کی لئے بہت پرکشش تھا، آج یہ شہر آبادی میں اضافے اور فضائی آلودگی کا شکار ہے۔

(ماخذ_عالمی انسائیکلوپیڈیا:82-281)

ایتھنز۔ بعہد افلاطون، سیاسی حالات و پس منظر

افلاطون کے زمانے میں ایتھنز کی حکومت اپنے زوال کی منازل طے کر رہی تھی، شہری ریاستیں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور ہر شہری ریاست مختلف الخیال طبقات میں بٹ چکی تھی۔ ایک طبقہ شہری ریاست پر حکمرانی کرنے والوں کا تھا، جبکہ دوسرا رعایا کا، حکمران جابر تھے، اور رعایا محکوم و مجبور۔ حکمران اخلاقی ضوابط سے بے نیاز ہو کر اپنے مفادات کا تحفظ کرتے تھے، جبکہ محکوم لوگ کمزور سے کمزور تر اور غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے تھے، اس طرح ہر شہری ریاست میں حکمرانوں اور رعایا کے درمیان بیگانگی اور نفرت کی خلیج روز بروز وسیع ہو رہی تھی ان حالات میں جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں سقراط کی موت کے بعد افلاطون جمہوریت پسندوں کا دشمن بن ہو گیا، اور اس نے دولت مندوں کے ذریعے ایتھنز کو سیاسی زوال سے بچانے کے لیے سیاسی مفکر کی حیثیت اختیار کی۔

تعارف خاندان (آباءواجداد)

افلاطون ایک معزز اور امیر گھرانے میں پیدا ہُوا تھا، DIOGENES LAERTIUSC روایات کے مطابق افلاطون کا باپ(ARISTON) اریسٹون کے آباءواجداد کا تعلق یونان کے بادشاہ کورڈس(CORDUS) کے گھرانے سے تھا، اور اس کے علاوہ میسینیا(MESSFNIA) و میلاتھس(MELANTHUS) سے بھی ان کا موروثی رتعلق بنتا تھا، جو کہ بادشاہ تھے،

افلاطون کی والدہ پیریکٹیون(PERICTION) کا نسلی تعلق مشہور ایتھینن لاء میکر(قانون دان)(LAWMAKER) اور گیتوں کے شاعر سولون سے بنتا تھا،

پیرکٹیون____چارمیڈیس کی ھمشیرہ تھی، کریٹیاس کی بھی رشتہ دار تھی، دونوں تھرٹی ٹائینٹس(THRITY TYRANTS) کی مشہور شخصیت تھیں،

افلاطون کے والد کے اس کے علاوہ دیگر 3 بچے تھے،

2 بیٹے تھے(1) ایڈی مینٹس(ADEIMANTUS)

(2) گلاؤکان(GLAUCON)

اور ایک بیٹی تھی(1) جس کا نام پوٹون(POTONE)

سپیوکی پس(SPEUSIPPUS) کی ماں پوٹون تھی، سپیوسی وہی شخصیت ہے، جو افلاطون کی فلسفیانہ اکیڈمی کا اس کے بعد سربراہ بنا۔

ری پبلیکا کے مطابق ایڈی مینٹس اور گلاؤکان دونوں افلاطون سے بلحاظ عمر بڑے بڑے تھے، ایک اور روایت کے مطابق گلاؤکان کی عمر افلاطون سے کم تھی،

پیدائش

اس بات پر وسیع پیمانے پر اتفاق رائے ہے کہ قدیم یونانی فلاسفر (PLATO) افلاطون 427، قبل مسیح میں ایتھنز میں پیدا ہوا بعض روایات کے مطابق وہ 429 اور 423 ق م کے درمیان ایجینا(AEGINA) میں پیدا ہوا،

والد

پورے یونان میں افلاطون کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ دیوتا ''اپالو'' کا بیٹا ہے، اپالو نے اس کے باپ ارسٹون (ARISTON) کو یہ خوشخبری خواب میں دی تھی،

نام

والد نے اس کا نام ارسٹوکلیز رکھا تھا مگر یہ افلاطون کے نام سے مشہور ہُوا کیوں کہ اس کا جسم کسرتی بھرا ہوا تھا، اور شانے بہت چوڑے تھے، یونان زبان میں PLATO کا مطلب بھی چوڑے شانے والا ہے،

ارسٹون (ARISTON) افلاطون کے دادا کا بھی نام تھا،

ابتدائی حالات

افلاطون ابھی چند سال کا تھا، جب اس کا باپ فوت ہوگیا، جس پر اس کی ماں نے ایک مشہور سیاسی رھنما پیری کلیس کے ایک قریبی دوست سے دوسری شادی کرلی، اور اس طرح افلاطون کا بچپن ایک بڑے سیاسی گھرانے میں گزرا

ایتھنز کا دور

پیلوپونے سوسی جنگ

افلاطون کے بچپن کا زمانہ ایتھنز شہر کے پرآشوب دور میں گزرا، ایتھنز اس سیاہ دور میں جنگ کی اس تباہ کاریوں کا پوری طرح شکار ہو چکا تھا، ہوطرف خون ہی خون تھا، راکھ اور ملبے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

بطور فوجی

افلاطون کے لڑکپن اور جوانی کا سب سے اہم واقعہ پیلوپونے سوسی جنگ تھی، جس

میں اسنے سپاٹا کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اور وہ گھڑ سوار فوج میں شامل تھا، جنگ میں ایتھنز کو شکست ہوئی، اور اس کی عظمت خاک میں مل گئی، اسی جنگ کے دوران ایتھنز میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، جس کے باعث اس وقت کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا، اور اس کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔

حالات پُر آشوب

ایتھنز پر ایک طرف خارجی جنگیں اپنا اثر دکھا رہی تھیں اور دوسری طرف داخلی مفاسد سر اٹھائے ہوئے تھے، جمہوریت کے باعث اشراف امراء بے بس تھے، لیکن جنگ کے تھوڑے عرصہ بعد ہی امراء کی حکومت قائم ہونے پر ایتھنز کی فضاء ایک بھرپور خون کے دھبوں سے داغدار ہوگئی تھی، یہ حکومت تیس امراء پر مشتمل تھی، جس میں افلاطون کے بہت سے رشتہ دار شامل تھے، سپارٹا کی ایماء پر برسر اقتدار آنے والے اس ٹولے میں اس کے ماموں کریٹیاس اور اسکے تایا کارمیڈس کی اندھیر نگری اور آخر میں جمہوریت کے دعویداروں کے سقراط کے ساتھ بہیمانہ سلوک نے افلاطون کو سیاست سے متنفر کردیا اور وہ عملی سیاست سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہوگیا۔

تعلیم

افلاطون کے پہلے استاد کا نام کریٹی لس تھا، جس نے افلاطون کو ہراقلیتوس کے نظریات کا علم دیا، افلاطون نے مروجہ تعلیم کے مطابق فن موسیقی سیکھا اور مذہبی و اخلاقی اصولوں پر مبنی ہومر کی نظموں کو حفظ کیا، اس وقت یونان میں غیر ملکی سوفسطائی امراء کے ذہنوں پر حکومت کر رہے تھے، اور ہر مضمون پر درس دینے کے عوض بے انتہا دولت کما رہے تھے، ان کے اخلاقیات کے درس میں یہ بات خاص طور پر شامل تھی، کہ ریاست حکمرانوں کی خواہشات کی غلام ہے، لہٰذا افلاطون نے سوفسطائیوں کے نظریات سے مکمل واقفیت حاصل کی، اور فیثا غورث کی تصانیف پر بھی غور کیا، یہی وجہ ہے کہ افلاطون کی کتاب الجمہوریہ میں پیش کیا گیا، فلسفہ فیثا غورث کے فلسفے سے ملتا جلتا ہے افلاطون فیثا غورث کی تھیوری آف لمٹ

سے کافی متاثر تھا، اور اسی باعث اس نے فیثا غورث کے اس فلسفہ کو کہ انسانی معاشرہ دانائی دنیاوی عزت اور دھن دولت کے تین حصوں میں منقسم ہے، اپناتے ہوئے انسانی روح کو دانائی جذبہ اور جسمانی بھوک میں تقسیم کیا، اسی دوران افلاطون اپنے ماموں کریٹیاس اور تایا کارمیڈس کے ذریعے سقراط تک پہنچا، اور اس کی شاگردی میں مختلف علم وفنون کا مطالعہ کیا۔

سقراط سے شرف تلمذ

سقراط سے افلاطون کا تعلق بیس برس کی عمر میں شروع ہوا اور آٹھ سال کے گہرے دوستانہ ارتباط میں اس نے تمام دیگر تلامذہ کے مقابلے میں زیادہ عمدگی سے استاد کی تعلیم کی اصل روح کو اخذ کیا، افلاطون کے مزاج کی تشکیل میں دراصل سقراط کی تعلیمات کا بڑا گہرا دخل تھا، افلاطون سقراط کو استاد بھی سمجھتا تھا اور دوست بھی۔

کہا جاتا ہے کہ افلاطون نے جوانی میں چند ایک المیہ ڈرامے بھی لکھے تھے، لیکن سقراط کے زیر اثر آنے کے بعد انہیں ضائع کر دیا۔

سقراط کی سزائے موت کے اسباب سیاسی تھی، اس لئے اس کے شاگردوں کو ایتھنز سے ہجرت کرنا پڑی۔

مگارا روانگی

سقراط کے سیاسی قتل کے بعد دیگر تلامذہ کی طرح افلاطون کو بھی مگارا جانا پڑا، مگارا کے ایک مقام یوکلیڈ میں رہ کر اس نے پارمینڈیز کے فلسفے کا تفصیلی مطالعہ کیا۔

قیروان ومصر روانگی

میگارا میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ قیروان اور مصر چلا گیا اور وہاں فلسفے اور ریاضی کا علم حاصل کر کے واپس ایتھنز آیا۔

سسلی واٹلی روانگی

پھر جنوبی اٹلی اور سسلی گیا اور وہاں کے سیاسی ومعاشرتی نظاموں کا تجزیہ کیا، اٹلی

میں اس کی ملاقات فیثا غورث سے ہوئی اور وہ فیثا غورثی فلسفے سے روشناس ہوا۔ ٹازن ٹائم کے فیثا غورث نو آبادی کے لوگوں سے ربط وضبط کے باعث وہ ریاضی میں اقلیدس کے قاعدوں کے طریقوں کا قائل ہوا، وہ فیثا غورث کے اعداد وشمار کے فلسفہ سے اس قدر متاثر تھا، کہ ایک بازنطینی کے مطابق علم ہندسہ سے ناواقف شخص کو افلاطون کو اکادمی میں داخل نہیں ملتا تھا۔

افلاطون جب سسلی پہنچا تو اس وقت وہاں ڈیونی سی اوس کی حکومت تھی، وہ ایک مطلع العنان بادشاہ تھا، اس نے سرکار تھیج اور یونانی ریاستوں سے اچھے تعلقات استوار کرر کھے تھے، اس کے دربار میں علم دوستی اور فن پروری عروج پر تھی، اور طبقہ اشراف جس میں اس کا بہنوئی ویون بھی شامل تھا، کا کافی اثر ورسوخ موجود تھا، ویون فیثا غورثی جماعیت سے تعلق رکھتا تھا، اور اسی واسطہ سے افلاطون کو لوئی سی اوس کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔

افلاطون نے ابتداء میں تو بادشاہ پر اپنے خیالات کا بہت اچھا اثر ڈالا، لیکن پھر محلاتی سازشوں اور اشراف پارٹی کی مخالفت کے باعث بادشاہ کے زیر عتاب ٹھہرا، اور اسے شہر بدر کر کے یونان جانے والے ایک جہاز پر چڑھا دیا گیا۔

اسی جہاز سے سپارٹا کا سفیر بھی واپس جا رہا تھا، ان دنوں سپارٹا اور ایتھنز میں دوبارہ جنگ چھڑ گئی تھی، سپارٹا کے سفیر کو درپردہ ہدایت دی گئی، کہ افلاطون کو کسی طرح ٹھکانے لگا دے، سفیر نے راستے میں اسے آئی گینا کے جزیرے پر اتار کر غلاموں کی منڈی میں پہنچا دیا، ان دنوں آئی گینا کی حکومت جنگ میں سپارٹا کی حامی تھی اور یہ قرارداد منظور ہو چکی تھی کہ اگر جزیرہ پر کوئی ایتھنز کا کوئی باسی نظر آئے تو اس کی گردن اڑا دی جائے۔

اس سے پہلے کہ افلاطون پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ایک قیروانی فلسفی انسی اس جو سیری نیک سکول کا بانی تھا، اور افلاطون کو اس کے نظریات کے حوالے سے جانتا تھا، کی علم دوستی کام آئی اور اس نے قیمتی غلام کو خرید کر آزاد کر دیا۔

ایتھنز واپسی

اس طرح وہ سسلی میں غلاموں کی منڈی سے رہا ہو کر واپس ایتھنز آ گیا۔

افلاطون کا استاد۔۔۔سقراط (469 تا 399 ق م)

ایک تعارف

افلاطون کے وسیلہ سے مغربی فلسفہ کو نہایت گہرائی میں متاثر کرنے والا فلسفی، وہ ایتھنز میں ایک سنگ تراش سوفرونکس کے گھر پیدا ہوا، اس نے ادب موسیقی اور جمناسٹکس میں باقاعدہ ابتدائی تعلیم حاصل کی، بعد میں وہ سوفسطائیوں کے علم بدیع و معانی (RHETORIC) اور جدلیات سے واقف ہوا، آیونیائی فلسفیوں کے افکار اور ایتھنز کے عمومی کلچر سے آشنائی پیدا کی، شروع میں سقراط نے اپنے باپ والا پیشہ اپنایا اور تین گریسز (یویوں) کا مجسمہ بنایا، سپارٹا کے ساتھ پیلوپونیشائی جنگ میں وہ پیدل فوج میں شامل ہوا، اور پوٹیڈیا (432 تا 430 ق م)، ڈیلم (424 ق م) اور ایمفی پولس (422 ق م) کی لڑائیوں میں غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کیا، سقراط زبانی بحث کو تحریر پر فوقیت دیتا تھا، لہٰذا اپنی بالغ زندگی کا زیادہ عرصہ ایتھنز کی گلیوں اور بازاروں میں دلیل بازی کرتے ہوئے گزرا، سقراط ظاہری شکل وصورت میں غیر پرکشش اور کوتاہ قامت مگر نہایت جفاکش اور خوب مضبوط تھا۔ سقراط یقین رکھتا تھا کہ دیوتاؤں نے اسے فلسفہ کو مقصد حیات بنانے اور تعلیم دینے کے ذریعے اپنے ملک کی بہترین انداز میں خدمت کرنے کا فریقہ سونپا ہے۔ لہٰذا وہ اہل ایتھنز کو تجزیہ نفس میں لگانے اور ان کی روحانی نگہداشت میں مصروف ہو گیا۔

اخمد عقیل روبی سقراط کے بارے میں یوں لکھتے ہیں۔

"فلسفے کی تاریخ میں ایک فلسفی ایسا گزرا ہے جس نے دل کھول کر باتیں کیں لیکن کاغذ پر ایک حروف نہیں لکھا۔ ہزاروں سالوں سے اس کا ذکر فلسفے کی ہر کتاب میں ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یونان نے اس سے بڑا آدمی پیدا نہیں کیا۔ اس کا نام سقراط ہے اور ایسا سعادت

مند شاگرد بھی شاید دنیا میں ایک ہی ہے جس نے اپنے استاد کے ایک ایک حرف کو لکھ کر استاد کو زندہ جاوید بنا دیا اور خود بھی ناموری حاصل کی اور فلسفے کا اہم ترین رکن بن کر وہ کل بھی زندہ تھا اور آج بھی زندہ ہے اس کا نام افلاطون تھا جو سقراط کا شاگرد تھا۔

سقراط 469 قبل مسیح میں یونان کی سب سے ترقی یافتہ ریاست ایتھنز میں پیدا ہوا۔ اس ایتھنز میں جہاں کے لوگ اپنے آپ کو ذہانت کا دکاندار (Shopkeeper of Wisdom) کہتے تھے۔ ایتھنز کا یہ سنہری دور تھا۔ فلسفہ، فنونِ لطیفہ، علم وحکمت اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس سنہری دور میں سقراط ایک سنگتراش کے ہاں پیدا ہوا۔ ماں دائی تھی، سقراط بڑے پُرمزاح انداز میں کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنی ماں کا کاروبار سنبھال لیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو فکر وفہم کی دائی کہا کرتا تھا۔

سقراط نے کسی اکیڈمی میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ نہ اس کا کوئی استاد تھا۔ بس وہ خود ہی چیزوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں سوال ابھرتے رہے' وہ لوگوں سے ان کے جواب پوچھتا رہا' سوال در سوال کرتا رہا اور اسی جستجو اور تلاش میں اسے اس کی منزل مل گئی۔ اس کے ذہن میں شروع ہی سے ہر ایک چیز کی وجہ، اس کی ابتداء اور انتہا جاننے کی لگن پیدا ہوگئی تھی۔ کائنات کیا ہے؟ یہ کائنات بنی کیسے؟ انہیں بنانے والا کون ہے؟ ہم کیسے سوچتے ہیں؟ کیا سوچنے کی ساری صلاحیت، خون، ہوا اور آگ میں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوالات اینکسا گورس نے بھی اٹھائے تھے، جس کا کہنا یہ تھا کہ ساری کائنات عقل کل نے بنائی ہے۔ چنانچہ سقراط نے اینکسا گورس کو پڑھنا شروع کر دیا لیکن بعد میں اس سے اختلاف کرنے لگا۔ سقراط کا کہنا یہ تھا کہ وہ ساری کائنات کو عقل کل کی تخلق قرار دیتا ہے لیکن پھر ک ائنات کو ایتھنز اور ہوا کی تخلیق دیتا ہے اور عقل کل سے منحرف ہو جاتا ہے۔ سقراط کا یہ کہنا ہے کہ عقل کی ہی وجہ تخلیق کائنات ہے اور عقل کل سے مراد خدا کی ذات ہے۔ سقراط پہلا یونانی فلاسفر تھا جس نے خدا کے ایک ہونے کا تصور دیا۔

(To,Ti) ایک یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''یہ کیا ہے۔'' بس یہی وہ چابی تھی جس سے سقراط نے چیزوں کی اصلیت کا تالا کھولا اور اپنی منزل کو پالیا اور فلسفے کی بنیاد رکھی۔ وہ بنیاد جس پر جدید اور آنے والے فلسفے اور فکر کی عمارت کھڑی ہے۔ سقراط نے سوال کیے،

ں دیئے اور انسانوں کو روشنی کی طرف لے گیا۔
سسرو (Cicero) نے اس کے بارے میں ٹھیک ہی کہا ہے:
"He Brought Philosophy Down from Heaven to Earth
(''یہ سقراط ہی تھا جو فلسفے کو آسمان سے زمین پر لے آیا۔'')
اس سے مراد شاید یہ ہے کہ سقراط نے اپنے خیالات کو حمایت میں جو دلائل دیئے، جو
یں دیں وہ ساری کی ساری زمینی تھیں، اردگرد کی زندگی سے ان کا تعلق تھا، وہ نظر آتی
ں چنانچہ جو چیز سامنے ہو، وہ نظر آتی ہو، اس پر یقین کرنے میں عقل کو الجھن کا شکار نہیں
پڑتا۔ یہی وجہ تھی کہ سقراط کے اردگرد اس کے چاہنے والے نوجوانوں کا ایک حلقہ جمع
یا اور یہی وجہ اس کی موت کا سبب بنی اور اس نے سارے ایتھنز کی مخالفت مول لے

سقراط نے جو جوانی میں تین جنگوں میں بھی حصہ لیا۔ یونان میں ایک قانون یہ بھی تھا
ہ ہر آدمی کو ایک خاص عمر کے بعد فوج میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ چنانچہ سقراط نے جنگ میں
ولیت اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ اپنے ساتھیوں کی جانیں بچائیں۔ ایک جنگ میں
ب سب فوجی شکست کے بعد اپنے گھر کی طرف بھاگ رہے تھے اس وقت بھی سقراط اپنی
لہ پر ڈٹا رہا اس کے ایک ساتھی نے واپس ایتھنز آ کر سب لوگوں کو بتلایا کہ اگر ہمارا ہر فوجی
قراط جیسا ہوتو ہمیں جنگ میں شکست نہ ہوتی اور ہماری چھاؤنی تباہ نہ ہوتی۔ سقراط نے
رف تین جنگوں میں حصہ لیا چوتھی جنگ میں وہ شامل نہ ہوا اور اپنے حکمرانوں سے کہا:
''اس جنگ میں ہمیں بہت بھاری شکست ہوگی میرا علم غیب مجھے یہی کہتا ہے''
سقراط کی پیش گوئی پر حکمرانوں نے یقین نہ کیا، یونانیوں کو اس جنگ میں بہت نقصان
اٹھانا پڑا۔
ان جنگوں میں یونان کو کوئی فائدہ پہنچا یا نہیں لیکن سقراط کو سیدھا راستہ مل گیا۔ اس کے
ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ ایک رات جنگ کے میدان میں جب سب فوجی سو رہے تھے سقراط
مشرق کی طرف منہ کر کے ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑا رہا جب سورج نکلا تو اس نے لمبی
سانس لی اور کہا:

''میں نے اسے پالیا ہے'' شاید اس نے عقل کل کو پالیا تھا اور پھر سقراط نے ایتھنز کی گلیوں اور بازاروں میں اپنے خیالات کا پرچار کرنا شروع کر دیا۔

نوجوان

سقراط کے حلقہ احباب میں زیادہ تر نوجوان شامل تھے۔اگلاتھن، السی بائی ڈیز، افلاطون اس میں نمایاں تھے، ان سب میں افلاطون کو امتیازی حیثیت حاصل تھی، افلاطون اور سقراط کا ملنا ایک معجزہ تھا۔

افلاطون اور سقراط دونوں ایک عرصہ دور دور رہے۔افلاطون پہلوانی کرتا رہا، ڈرامے لکھتا رہا اور دوستوں میں بیٹھ کر گپیں ہانکتا رہا جبکہ سقراط جنگوں میں دادشجاعت لیتا رہا۔جب وہ جنگ سے واپس آیا تو ایک ماہ تک ایک خواب اسے مسلسل آتا رہا اور وہ یہ تھا کہ ایک سنہری پروں والا پرندا ایک مخصوص گیت گاتا ہوا اس کے اردگرد چکر لگاتا تھا اس کی چونچ میں ایک پھول کا ہار تھا وہ گیت گا کر سقراط کے گلے میں ڈال دیتا اور پھر غائب ہو جاتا۔سقراط کو یہ خواب مسلسل ایک کرب میں مبتلا کرتا رہا۔ایک دن وہ ایتھنز کے ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے ایک خوبصورت نوجوان آتا دکھائی دیا جو وہی گیت گا رہا تھا جو پرندہ خواب میں گاتا تھا۔سقراط اس کی طرف بڑھا اور اسے گلے سے لگا لیا۔دونوں کی یہ ملاقات ایک لافانی رشتے میں بدل گئی۔اس نوجوان کا نام افلاطون تھا۔جو اس کی باتیں سن کر امر ہو گیا اور استاد کی باتیں لکھ کر استاد کو امر کر دیا۔

سقراط نے دو شادیاں کیں۔پہلی خاتون کا تعلق معزز خاندان سے تھا جس میں ایتھنز کی بڑی حیثیت تھی۔اس خاتون کا نام میرٹو (MYRTO) تھا۔ایتھنز میں ایک بار بارپلیگ کی بیماری پھیلی۔میرٹو چل بسی۔سقراط نے دوسری شادی 50 سال کی عمر میں کی۔دوسری خاتون کی سقراط کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔کہتے ہیں وہ بڑی تیز مزاج، غصیلی اور منہ پھٹ تھی۔سقراط کے سارے جاننے والے یہی کہتے ہیں کہ اس نے سقراط سے سیدھے منہ کبھی بات نہ کی اور سقراط اس کی جلی کٹی باتیں سن کر ہمیشہ ہنس دیا کرتا تھا۔اس خاتون کا نام زین تھپی (XANTHIPPE) تھا، اس نے سقراط کی جھولی میں تین بچے ڈالے اور بے شمار گالیاں......!

ایک بار سقراط کے ایک ساتھی زینٹس تھنز (ZNTISTHENES) نے اس

سے پوچھا:

''استاد۔تمہاری بیوی زمانے بھر کی تند مزاج اور منہ پھٹ عورت ہے اس کے ساتھ کیسے گزارا ہوتا ہے۔''

سقراط نے جواب دیا:

''میں اس کے ساتھ لوگوں کو سدھارنے کی تربیت حاصل کر رہا ہوں اگر اسے راہ راست پر لے آیا تو پوری دنیا کو راہ راست پر لے آؤں گا۔''

ایک بار اس نے زین تھپی کے بارے میں کہا:

''میں سرکش گھوڑے پر سواری کر رہا ہوں۔ جو زین تھپی کے ساتھ گزارا کر سکتا ہے، وہ دنیا میں سب سے نباہ کر سکتا ہے۔'' سقراط نے جب لوگوں سے سوالات کا سلسلہ شروع کیا اور انہیں ان کی غلطیوں سے آگاہ کیا تو یونانی اس کے خلاف ہو گئے۔ سقراط نے حکومت اور انتظامیہ پر تنقید کی تو سارے اعلیٰ افسران اس سے نفرت کرنے لگے، دیکھتے ہی دیکھتے لکھنے والا ارسٹوفینز (Aristophenes) تھا۔ اس کے جملے کی کاٹ بہت تیز تھی۔ وہ طنز اور مزاح کا بہت بڑا لکھاری تھا اس کی تحریریں آج بھی شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ سقراط کا بڑا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے سقراط کو کردار بنا کر ڈرامے لکھے اور سقراط کے نظریات اور طرزِ استدلال کا کھل کر مذاق اڑایا۔ اس کے ڈرامے (Clouds) اور (Frogs) بہت مشہور ہیں۔

سقراط معمولی شکل وصورت کا مالک تھا بلکہ بدصورت کہنا زیادہ بہتر ہوگا مگر اس بدصورتی میں دنیا کا سارا حسن شامل تھا۔ ایتھنز کے لوگ ظاہری خوبصورتی کے قائل تھے لیکن سقراط جسمانی لحاظ سے بھدا، بے ڈول تھا۔ اس کے دوست اسے مینڈک کہہ کر پکارتے تھے اور پورے ایتھنز میں وہ (Frog Face) کے نام سے مشہور تھا۔ سقراط انہیں یہ سمجھاتا رہا کہ میں باہر سے نہ سہی لیکن اندر سے خوبصورت آدمی ہوں۔

''اگرچہ میری گردن میرے کاندھوں میں دھنسی ہے۔ میری داڑھی بے ترتیب ہے، ناک چپٹی ہے، پیشانی چھوٹی ہے، لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ مجھے دیوتاؤں نے بنایا ہے اور دیوتاؤں کی یہی مرضی تھی۔''

ان خارجی بدصورتیوں کے باوجود اس سے اچھا، نیک اور ذہین آدمی پورے ایتھنز میں کوئی نہ تھا۔ اس کے دوستوں کا کہنا تھا کہ سقراط سے زیادہ نیک، شریف، عالم اور متوازن فکر رکھنے والا آدمی انہوں نے ساری دنیا میں نہیں دیکھا۔ اس کے اندر سچائی تھی۔ اس نے کسی کو تکلیف نہ دی بلکہ دوسروں کی تکلیفیں خود برداشت کیں۔ یہاں تک کہ جب اسے زہر کا پیالہ دیا گیا تو پیالہ دینے والے کی طرف سقراط نے دیکھ کر کہا:

''تم دنیا کے شریف ترین اور نیک آدمی ہو۔''

اور وہ آدمی دیوار کے ساتھ لگ کر زاروقطار رونے لگا۔

سقراط نے جن نظریات کو ایتھنز کے لوگوں میں عام کیا وہ نظریات ایتھنز والوں کو قبول نہ تھے۔ سقراط جب بھی کسی سے بحث کرتا تھا، اسے اپنے نظریات سنانے کی دعوت دیتا تھا اور پھر دلائل دے کر ان نظریات کو غلط ثابت کرتا تو وہ سقراط کے خلاف ہو جاتا تھا' جلد ہی سارا ایتھنز اس کے خلاف ہو گیا۔

سقراط کے بارے میں اس کے شاگردوں کے درمیان یہ بات بڑی مشہور تھی کہ ایک غیبی آواز اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ سقراط کہا کرتا تھا کہ جب بھی وہ کوئی غلط کام کرنے لگتا ہے، غیبی آواز اسے روک دیتی ہے۔ چنانچہ یہی غیبی آواز تھی جس نے مجھے سیاست میں حصہ لینے سے روکا۔ جب مجھے عدالت میں پیش ہونا تھا اور اپنے خلاف عائد کردہ الزامات کے بارے میں کچھ کہنا تھا تو غیبی آواز نے مجھے عدالت میں جانے سے روکا نہ مجھے تقریر کرنے سے روکا اس کا مطلب ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، اسی میں میری بھلائی ہے۔ اس غیبی آواز نے شاگردوں کے انتخاب میں بھی سقراط کی رہنمائی کی اور ایسے شاگردوں کو اپنے حلقہ احباب میں شامل کرنے سے روکا جو اہل نہ تھے اور پھر اسی غیبی آواز نے اسے لوگوں میں اپنے خیالات عام کرنے کی دعوت کا حکم دیا اور اپنے نفس کی اصلاح کا مشورہ دیا اور بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ روح کی پاکیزگی ہی اصل حیات ہے۔ اس نے صاف الفاظ میں واضح کیا کہ ہر حکم مجھے غیبی آواز نے دیا ہے جو میرے نزدیک خدا کا درجہ رکھتا ہے اور مختصر الفاظ میں یہ بات سمجھائی:

''چاہے بوڑھا ہو یا جوان، اپنے مال و جسم کو اولین قرار نہ دے بلکہ روح اور نفس کی

پاکیزگی کو پہلا مقام دے۔'' اور پھر سقراط نے نیکی، بدی، ذلت، برائی، انصاف، ظلم، ضبط نفس، بہادری، بزدلی، ریاست، سیاست، سیاستدانوں اور سیاسی قیادت کے بارے میں بھرپور انداز میں اپنے نظریات بیان کئے۔

سقراط کے ایک دوست زینوخان نے، سقراط کے اس پہلو کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا۔

''سقراط ہمیشہ محبت کی زبان استعمال کرتا تھا۔ اس کی نظر کبھی بھی انصاف کی ظاہری خوبصورتی پر نہ تھی۔ وہ ہمیشہ عقلی خوبصورتی کو عزیز رکھتا تھا اور اخلاقی تعلیم ہمیشہ اس کے پیش نظر ہوتی تھی۔''

افلاطون کی مشہور زمانہ کتاب ''ریاست'' میں سقراط کے ان ہی خیالات کی تشریح ہے۔ اس پر آنے والے دنوں میں نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا الزام لگا لیکن اس نے کبھی بھی نوجوانوں کو گمراہی کے رستے پر نہ ڈالا۔ بلکہ یہی درس دیا کہ ''وہ جو بدصورت ہیں، بدصورتی کو اپنی نیکیوں سے دور رکھیں اور جو خوبصورت ہیں وہ اپنی خوبصورتی پر برائیوں کے دھبے نہ پڑنے دیں۔''

سیاست پر اس کے اعتراضات بڑے مدلل تھے۔ حکومت کو درست راستے پر چلانے کا فارمولا آج بھی اس کے بنانے ہوئے اصولوں پر کامیابی سے رواں دواں ہے۔ سقراط نے سیاست اور سیاسی قیادت کو صاف صاف بتلایا۔

''جب اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے اور اس میں تعمیر اور جہاز رانی کے مسائل پر بحث ہوتی ہے تو ان مسائل کے حل کے لئے انہیں طلب کیا جاتا ہے جو تعمیر اور جہاز رانی کے بارے میں علم رکھتے ہیں لیکن جب حکومت چلانے کا مرحلہ آتا ہے تو ہر اس شخص کو بلا لیا جاتا ہے جو اہل نہیں ہوتا۔ حکومت کا کام اسے سونپ دیا جاتا ہے جو حکومتی اور ریاستی امور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور پھر ریاست کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ یہی بات آگے چل کر سقراط نے اسمبلی کے ممبران کے بارے میں بھی کہی۔ سقراط کہتا ہے:

''اسمبلی، احمقوں، معذوروں، ترکھانوں، لوہاروں، دکانداروں اور منافع خوروں پر مشتمل ہے جو ہر وقت یہ سوچتے رہتے ہیں کہ کیسے سستی چیز مہنگے داموں بیچ کر منافع کمایا

جا سکے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے عوام کے مسائل کے بارے میں ایک دفعہ بھی نہیں سوچا ہوگا۔" (یہ بات دھیان میں رہے کہ سقراط کے زمانے میں ایتھنز شہر کے دکاندار، تاجر اور مختلف کاریگر اسمبلی میں ممبر ہوتے تھے اور جب اسمبلی کا اجلاس ہوتا تھا تو تمام شہر کی دکانیں اور بازار بند ہوتے۔)

ایتھنز کی انتظامیہ نے سقراط کی ان باتوں کو اپنی توہین تصور کیا۔ جگہ جگہ سقراط کے بارے میں سازشوں کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس کے دوستوں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ مشہور ڈرامہ نگار یوری پیڈیز سقراط کا بہت قریبی دوست تھا وہ بھی سقراط کی طرح آسمانی دیوتاؤں کے خلاف تھا۔ اس نے سقراط کی پیروی کرتے ہوئے یہ کہا کہ آسمانی دیوتا اگر برائی کے مرتکب ہوتے ہیں تو میں انہیں دیوتا تسلیم نہیں کرتا۔ اس نے ایک ڈرامہ (Trojon Women) لکھا' جس میں یونانیوں کی فوجوں کو ایک لڑائی میں عورتوں، بوڑھوں اور بچوں پر ظلم کرتے اور انہیں زنجیریں پہنا کر غلام بناتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ انتظامیہ نے اسے یہ ڈرامہ ایتھنز کی ریاست میں اسٹیج کرنے کی اجازت نہ دی کیونکہ اس میں یونانی فوجیوں پر کڑی تنقید کی گئی تھی۔ یوری پیڈیز نے کہا میں یہ ڈرامہ ہر صورت اسٹیج کروں گا چنانچہ اس نے جہاں ایتھنز کی ریاست کی سرحد ختم ہوتی تھی اور ایتھنز کا قانون اس پر لاگو نہیں ہوتا تھا وہاں جا کر ڈرامہ اسٹیج کیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ڈرامے لکھنے والوں میں صرف ایک آدمی تھا اور اس کا نام سقراط تھا۔

ایتھنز کے لوگوں کو سقراط پر سب سے پہلا اعتراض یہ تھا کہ اس نے نوجوان نسل کے اخلاق کو بگاڑ دیا ہے۔ سقراط کے مداح زیادہ تر نوجوان لڑکے تھے۔ سقراط نے کھل کر مذہبی دیوتاؤں پر تنقید کی' ایک خدا کا تصور پیش کیا جو ایتھنز کے لوگوں کو برا لگا۔ ایتھنز کے روایتی دیوتاؤں پر اعتراضات سقراط کی عادت تھی اور وہ اس عادت کو نہ بدل سکا۔ ایتھنز کی اسمبلی کے فیصلوں پر اس نے کھل کر تنقید کی اور ان قوانین کو للکارا جو انسانی حقوق کے قاتل تھے۔ حکومت اور حکومت سے متعلقہ لوگ اس کے خلاف ہو گئے اور سقراط کو عدالت میں بلا لیا گیا۔ مقدمہ اس عہد کے ایک شاعر میلی ٹس نے کیا تھا۔ سقراط پر الزامات یہ تھے کہ وہ دیوتاؤں اور مذہبی رسومات کی تذلیل کرتا ہے اور نئی نسل کے اخلاق کو بگاڑ رہا ہے۔ سقراط کا

مقدمہ سننے کے لئے 501 ممبران کی جیوری بنائی گئی، پورا ایتھنز یہ مقدمہ سننے کے لئے عدالت میں آیا، اور تو اور سقراط کی بیوی زین تھپی بھی آئی۔ وہ بھی اس کے خیالات سے متفق نہیں تھی اور اکثر یہ کہا کرتی تھی۔

"سقراط جب بھی گھر آتا ہے، سودا سلف لے کر نہیں آتا بدنامی لے کر آتا ہے۔"

عدالت میں سقراط نے ہنس کر اور بے سکون سے اپنے اوپر لگے ہوئے الزامات کو رد کیا۔ اس کے خلاف بولنے والے سب کے سب جھوٹے اور لاعلم تھے اور سقراط نے ان کے جھوٹ کو عدالت میں بے نقاب کیا۔

سقراط نے عدالت میں صاف کہا کہ میں رو کر اور گڑگڑا کر اپنے خلاف عائد الزامات کی تفصیل نہیں دوں گا۔ میں مردانگی اور ہمت کے خلاف کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ میں نہ موت سے ڈرتا ہوں اور نہ مرنے سے۔ میرے لئے موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کا نام ہے۔ بہت جلد ایتھنز کے لوگوں کو یہ احساس ہوگا کہ انہوں نے ایک دانا، عقل منداور ذہین شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

(سقراط نے عدالت میں کہا کہ وقت بہت تھوڑا ہے۔ اس تھوڑے وقت میں جھوٹ کے اس پلندے کا جواب نہیں دیا جا سکتا، جو مجھ پر لاد دیا گیا ہے۔ میں اگلے جہان دیوتاؤں کے پاس اس امید پر جا رہا ہوں کہ مجھے وہاں انصاف ملے گا، جو مجھے یہاں نہیں مل رہا۔)

سقراط کی تعلیمات، جو ایتھنز کی گلیوں میں دیتا پھرتا تھا۔ یا عدالت میں اس کا وہ بیان جو اس نے ان الزامات کو رد کرنے کے لئے دیا جو اس پر لگائے گئے تھے یا جیل میں دوستوں اور شاگردوں کے ساتھ اس کی گفتگو یہ سب کچھ لافانی الفاظ میں کی گئی باتیں ہیں۔ سقراط نے عدالت میں صاف صاف کہا کہ یہ سب الزامات بے بنیاد ہیں میں سچی باتیں کرتا ہوں اور سچ مجھے غیبی طاقت نے عطا کیا ہے۔ میں ان چیزوں کی اصلیت کی تلاش میں رہتا ہوں جو آسمانوں کے اوپر اور زمین کے نیچے ہیں اور یہی بات میں دوسروں کو سکھاتا ہوں۔ میں کسی کو کچھ سکھانے کا معاوضہ نہیں لیتا۔ ویسے بھی میں کسی کو کیا تعلیم دے سکتا ہوں۔ مجھے تو خود کچھ نہیں آتا۔ سقراط نے بار بار عدالت میں کہا کہ ایک سلسلے میں میں دوسروں سے زیادہ عقل مند ہوں دوسرے جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ وہ کچھ نہیں جانتے لیکن میں جانتا

ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔

(سقراط نے عدالت میں تلاش حقیقت کی کہانی بیان کی اور کہا کہ مجھے حقیقت کی تلاش میں بہت مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ میں سیاست دانوں، المیہ نگاروں اور شاعروں کے پاس گیا۔ شاعروں اور ڈرامہ نگاروں سے میں نے ان کی تخلیقات سمجھنے کی کوشش کی مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑا ہے کہ انہیں خود بھی نہیں پتہ تھا کہ انھوں نے کیا لکھا ہے۔ جب میں نے انہیں ان کی اس کمزوری کا احساس دلایا تو وہ میرے خلاف ہو گئے میں نے باری باری سب لوگوں سے ان کے کام کے بارے میں پوچھا لیکن وہ نہیں جانتے تھے کے وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس طرح سب لوگ میرے خلاف ہو گئے۔ سقراط نے یہ فیصلہ سنا اور مسکرا کر کہا:

''اے ایتھنز کہ لوگوں! اب تمہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور کچھ دن بعد تم لوگوں کو احساس ہو گا کہ تم نے ایک عقل مند آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے''

اور پھر سقراط نے مسکرا کر جیوری ممبران کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا:

''اب رخصتی کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ہم اپنے اپنے راستوں کی طرف جا رہے ہیں۔ میں موت کے راستے کی طرف اور تم زندگی کے راستے کی طرف، کون سا راستہ درست ہے۔ نہ تم جانتے ہو اور نہ میں۔ جاننے والی صرف خدا کی ذات ہے''

سقراط پر ایک اور الزام یہ بھی تھا کہ اس نے خوبصورت نوجوان لڑکیوں کے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کیے ہیں۔ یہ بھی اس کے دشمنوں کا اس پر اوچھا وار تھا، دراصل یونان میں لڑکوں کے ساتھ عشق کی یہ وبا عام تھی، ڈیماستھنز نے ایک بار کہا تھا:

''مسرت کے لئے ہمارے پاس خوبرو لڑکے ہیں، جسمانی خواہشات کے لئے طوائفیں اور بچے پیدا کرنے کے لئے بیویاں ہیں''

لیکن سقراط کی لڑکوں کے بارے میں رائے مختلف تھی، السی بائیڈیز جو بہت خوبصورت تھا اور ہر وقت سقراط کے ساتھ رہتا تھا۔ لوگوں نے سقراط پر جب اعتراض کیا تو اس نے کہا:

''میں اسے ہر وقت اپنے پاس اس لئے رکھتا ہوں کہ یہ میری صحبت میں اچھا انسان بن جائے''

عدالت میں لوگ سقراط کی باتیں سن رہے تھے جیوری کے 501 ممبران کے ذہن

میں یہ فیصلہ موجود تھا۔ سقراط نے ان سے کہا بھی کہ مجھے پتا ہے کہ میلی ٹس کو میرے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی تحریک کس نے دلائی ہے۔ پھر اس نے لوگوں سے کہا کہ ایک دانا اور عقل مند آدمی پر یہ الزامات نہیں لگائے جا سکتے، میں دانا اور عقل مند ہوں اور یہ بات میں نہیں کہتا غیبی طاقت کہتی ہے۔ سقراط نے اپنی بات ثابت کرنے کے لئے اپنی زندگی کا ایک واقع سنایا۔ اس نے کہا کے وہ ایک بار ڈیلفی کے عبادت خانے میں گیا تھا اور بڑی ہمت، جرأت اور عاجزی سے پوچھا تھا کہ کیا پورے ایتھنز میں مجھ سے زیادہ عقل مند شخص موجود ہے؟ پجارن نے جواب دیا تھا کہ نہیں! ایتھنز تم سے زیادہ کوئی عقل مند نہیں۔ تم سب سے زیادہ عقل مند ہو اور پھر سقراط نے کہا کہ میرا گواہ شیف ران ہے۔ وہ مر گیا لیکن اس کا بھائی عدالت میں موجود ہے وہ گواہی دے سکتا ہے کیونکہ وہ میرے ساتھ تھا۔ میں حاسدوں اور کم عقل لوگوں میں پھنس گیا ہوں۔ جو میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ سقراط نے بہت دلائل دیئے لیکن جھوٹ نے سچ کی دلیلوں کو نہ سنا اور سقراط کو زہر کا پیالہ پینے کی سزا دے دی۔

جیل میں روزانہ سقراط کے دوست اس سے ملنے آتے تھے۔ وہ سقراط کی باتیں سنتے جن میں نیکی، خیر، زندگی اور موت پر روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ سقراط موت سے بالکل خائف نہ تھا اس کا کہنا تھا کہ موت میرا جسم فنا کر سکتی ہے میری روح کو نہیں مار سکتی۔ جو آگے سفر پر روانہ ہو جائے گی بقول میر تقی میر:

موت واماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

سقراط کے دوستوں نے داروغہ جیل سے ساز باز کی اور اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ سقراط کو جیل سے رہا ہونے میں مدد کرے گا اور سقراط دوسری ریاست میں چلا جائے گا جہاں ایتھنز کا قانون لاگو نہیں ہوتا اور سقراط کی جان بچ جائے گی۔ جب انہوں نے سقراط سے اس بارے میں بات کی تو وہ رضامند نہیں ہوا اور کہنے لگا۔

''اگر میں جان بچا کر بھاگ گیا تو مر جاؤں گا اور اگر زہر پی کر مر گیا تو قیامت تک زندہ رہوں گا۔''

چنانچہ سقراط نے زہر کا پیالہ پی لیا اور وہ آج تک زندہ ہے۔
سقراط نے زندگی میں اتر کر اسے جاننے کی کوشش کی۔ اس نے ہنر، فن، تخلیق، نیکی، بدی، عدل، انصاف، اچھائی، برائی، ضمیر، مذہب، روح، موت، خیر، شجاعت، سب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایلسی باڈیز کہا کرتا تھا کہ استاد سقراط دیکھنے میں بن مانس لگتا ہے لیکن اس کے اندر دیوتاؤں کا حسن موجود ہے۔ سقراط نے جو کہا افلاطون نے اپنے مکالموں اور تحریروں میں لکھ دیا اور اس کے خیالات جدید فلسفے کی بنیاد بنے بقول ول ڈیورانٹ۔

"Every school of .social thought had there,its representative, and its Origion"

سقراط کی کہانی، اس کی باتیں، اس کی محبت اور سوچ نے کل کو متاثر کیا، آج اس سے متاثر ہے اور آنے والا کل بھی اس سے متاثر ہوگا۔ آخر میں یہی کہوں گا کہ:

"his life story is a golden thread in the dark fabric of the world history"

(ماخذ۔ علم و دانش کے معمار: 67 تا 73)

سید یاسر جواد اپنی کتاب سو عظیم فلسفی میں صفحہ 91 تا 93 پر لکھتے ہیں
سقراط نے کہا "اپنے آپ کو پہچانو۔" ول ڈیوریٹ کی رائے میں اصل فلسفہ تبھی شروع ہوتا ہے جب انسانی ذہن اپنی طرف متوجہ ہو جائے اور خود کو پرکھنے کی صلاحیت پیدا کرلے۔ کیا اپنی ذات کا تجزیہ کرنا اور نتیجتاً کسی صریح یقین تک پہنچنا ممکن ہے؟ سقراط کا ایک مقولہ بہت مشہور اور مقبول ہے۔ "میں ایک بات بخوبی جانتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔" تو کیا تلاش ذات، ساری زندگی فلسفیانہ بحثوں کی نذر کرنے کا انجام محض "میں کچھ نہیں جانتا" ہے؟ شاید سقراط کا یہ جملہ اُس کی انکساری کا ثبوت ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو اُس میں اور بھی زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی۔ سقراط کی سب سے بڑی کامیابی سننے والوں کو سوچنے اور مسلمہ قوانین اور دستوروں کے بارے میں سوال اُٹھانے اور اُن پر شک کرنے کی تحریک دینا تھی۔

اگر آپ طے شدہ حالات پر سوال اُٹھانے اور نئی راہیں تلاش کرنے کے متمنی ہیں تو

عموماً سب سے پہلے اپنے قریب ترین لوگوں سے بیگانے ہو جاتے ہیں۔ آسمان کی وسعتوں میں سیاحت کرنے والا ذہن مسلسل حقیقی مادی حالات سے بے بہرہ رہتا ہے۔ سقراط کے ذریعہ معاش کے متعلق کسی کو معلوم نہ تھا، وہ اپنے بچوں اور بیوی کی بھی کوئی پروانہ کرتا۔ اُس کی بیوی ژان تی پے کا نام تاریخ میں ''جھگڑالو اور لڑاکی عورت'' کا ہم معنی بن گیا۔

سقراط نے کوئی کتاب نہ لکھی اور کوئی باقاعدہ فلسفیانہ مکتب قائم نہ کیا۔ اُس کی شخصیت اور انداز فکر کے بارے میں تمام قطعی معلومات کا ماخذ اُس کے دو ممتاز ترین شاگردوں کی تحریریں ہیں۔ ایک شاگرد افلاطون تھا جس نے کہیں کہیں اپنے نظریات بھی سقراط کے کھاتے میں ڈال دیے۔ دوسرا شاگرد ژینوفون، ایک نثر نگار تھا جو اُستاد کے متعدد عقائد کو سمجھنے میں غالباً ناکام رہا۔ افلاطون نے سقراط کو لاعلمی کے ایک ہجویہ پردے کے پیچھے چھپا ہوا اور ذہنی ہوشیاری اور دانائی کا حامل بیان کیا جس کے باعث وہ بڑی آسانی کے ساتھ دلائل پیش کرتا تھا۔

فلسفے میں سقراط کی حصہ داری بنیادی طور پر اخلاقی نوعیت کی تھی۔ انصاف، محبت اور نیکی جیسے تصورات کی معروضی تفہیم پر یقین اور حاصل کردہ خود آگہی اُس کی تعلیمات کی اساس تھی۔ وہ یقین رکھتا تھا کہ تمام برائی لاعلمی اور جہالت کا نتیجہ ہے اور کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے برا نہیں بنتا۔ چنانچہ نیکی علم ہے، اور راست بات کا علم رکھنے والا شخص درست رویہ ہی اختیار کرے گا۔ اُس کی منطق نے استدلال اور عمومی تعریفات کے لئے جستجو پر خصوصی زور دیا، جیسا کے نوجوان ہم عصر اور شاگرد افلاطون اور افلاطون کے شاگرد ارسطو کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ ان فلسفیوں کی تحریروں کے ذریعہ سقراط نے بعد کی مغربی فکر کے دھارے پر عمیق اثرات مرتب کیے۔

سقراط کی دوستی اور اثر میں آنے والا ایک مفکر اینٹی ستھینز تھا جس نے رواقی فلسفیانہ مکتب کی بنیاد رکھی۔ سقراط ارسطی پس (Aristippus) کا بھی استاد تھا جو تجربے اور مسرت کے سائرینائی (Cyrenaic) فلسفے کا بانی بنا۔ ایپی قورس کا زیادہ عالی شان فلسفہ ارسطی پس کی فکر کی ہی ترقی یافتہ صورت تھا۔ یونانی فلسفی Epictetus، رومن فلسفی سینیکا اکبر اور رومن شہنشاہ مارکس اور یلیئس جیسے رواقیوں نے سقراط کو اعلیٰ تر زندگی کی تجسیم اور راہنما خیال کیا۔

سقراط کی موت نے اس کی شخصیت کو اور بھی زیادہ پُرکشش بنا دیا۔ اگرچہ وہ ایک محب

وطن اور عمیق مذہب یقین کا حامل شخص لیکن بہت سے ہم عصر اُسے شک کی نظر سے دیکھتے اور ایتھنی ریاست و مروج مذہب کی جانب اُس کے رویے کو ناپسند کرتے تھے۔ 399 قبل مسیح میں اُس پر ریاست کے دیوتاؤں کو نظر انداز کرنے اور نئے معبود متعارف کروانے کا الزام عائد کیا گیا۔ (یاد رہے کہ سقراط اکثر ''باطنی داخلی آواز'' کا ذکر کیا کرتا تھا)۔ اُسے نوجوان نسل کا اخلاق بگاڑنے اور انہیں جمہوریت کے اصولوں سے دور ہٹانے کا مورد الزام بھی ٹھہرایا گیا، اور اُسے غلط طور پر سوفسطائیوں کے ساتھ بھی جوڑا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مزاحیہ شاعر ارسٹوفینز نے اپنے کھیل ''بادل'' میں اُس کا مذاق ایک ''دکانِ فکر'' کے ایسے مالک کے طور پر اڑادیا تھا جہاں نوجوان کو بدترین استدلال کی صورت میں پیش کرنا سکھایا جاتا تھا۔

افلاطون کی "Aplology" سے پتا چلتا ہے کہ سقراط نے مقدمے میں اپنا دفاع کرتے ہوئے کیا کہا۔ وہ بڑی بے باکی اور جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے نظریات پر ڈٹا رہا۔ ''منصفوں'' نے اُسے موت کی سزا دی، حالانکہ بہت کم لوگوں نے اس فیصلے کے حق میں ووٹ ڈالے تھے۔ ایتھنی قانونی دستور کے مطابق سقراط نے اپنی موت کے خلاف طنزیہ جوابی دعویٰ دائر کیا اور تجویز دی کہ اُسے بس تھوڑا سا جرمانہ ہی کر دیا جائے کیونکہ وہ ایک فلسفیانہ مشن کے حامل انسان کے طور پر ریاست کے لئے قابل قدر ہے۔ منصف اس تجویز پر اتنے سیخ پا ہوئے کہ سقراط کی سزائے موت کے حق میں ووٹوں کی تعداد کافی بڑھ گئی۔

سقراط کے دوستوں نے اُسے جیل سے بھگانے کا منصوبہ بنایا لیکن وہ قانون کی اطاعت کرنا اور اپنے نصب العین کی خاطر جان دینا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ اُس نے زندگی کا آخری دن دوستوں اور مداحوں کے درمیان گزارا اور شام کے وقت بڑے سکون سے زہر کا پیالہ پی لیا (جیسا کے اُس دور میں سزائے موت دینے کا دستور تھا)۔ افلاطون نے سقراط کے مقدمے اور موت کا حال اور "Crito", Apology" اور "Phaedo" میں بیان کیا ہے۔

ایتھنز میں اکیڈمی کا قیام

ایتھنز آکر افلاطون نے اس مدرسہ کو جہاں تدریس کی تھی، اکیڈمی کی شکل دیتے ہوئے، ایک باغ میں منتقل کر دیا، اس اکیڈمی میں ریاضی، قانون اور سیاسی نظریات کی تعلیم

دی جاتی تھی، تعلیم کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا، بلکہ عطیات کے ذریعے اکیڈمی کی ضرورت کو پورا کیا جاتا تھا، اس اکیڈمی میں باقاعدہ لیکچر وخطبات دیئے جاتے جو ذریعہ تعلیم تھے، اوراس اکیڈمی کے ارکان ہر ماہ مل کر کھانا کھاتے تھے۔

افلاطون نے اس اکیڈمی (PLATONIC ACADEMY) کو 387 ق م میں قائم کیا۔ افلاطون نے اپنی قائم کردہ اکیڈمی میں ریاضی، سائنسی علوم اور فلسفہ ومنطق پر جو لیکچرز دیئے تھے، زمانہ کے دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے۔

افلاطون کے بعد ہیلنسٹک کے دور میں اس سیکسٹکل اسکول کا درجہ حاصل رہا، 83 ق م میں فیلو آف لائریسا کی وفات کے بعد تک رہیں۔ رومن عہد میں بھی فلاسفروں نے افلاطون کے فلسفہ کی یہاں تدریس کی 410ء میں اس کی تجدید کی گئی اوراسے نیو پلاٹو نیزم کا نام دیا گیا 529ء کو یہ بھی جسٹینین عہد کے بعد مکمل طور پر بند کر دی گئی۔

دوبارہ سسلی روانگی

368 ق میں سسلی کے بادشاہ ڈیونی سی اوس کا انتقال ہوگیا، اور تخت پر اس کا بیٹا ڈیونی سی اوس دوم بیٹھا، ڈیون نے افلاطون کو اس نئے بادشاہ کی تربیت کے لئے بلایا، اگر چہ افلاطون اس پر رضامند نہ تھا۔ لیکن ڈیون کے اصرار پر وہ سسلی پہنچا، بدقسمتی سے ڈیون سی اوس دوئم اپنے مزاج میں انانیت اور حسد کے باعث ڈیون کی وفاداری کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا اوراس نے افلاطون کی نیت پر بھی شک کیا، لہٰذا افلاطون واپس ایتھنز چلا گیا۔

361 ق م میں ڈیونی سی اوس دوم کے اس وعدہ پر کہ وہ ڈیون کے بارے میں افلاطون کی خواہشات کا احترام کرے گا۔ ایک بار پھر سسلی گیا، لیکن بادشاہ نہ تو اپنے عہد پر قائم رہا، اور نہ ہی تعلیم میں کوئی دلچسپی لی، لہٰذا افلاطون اس بار دوبارہ ناکام واپس لوٹا۔

چند سال بعد ڈیون نے ڈیونی سی اوس دوم پر حملہ کر کے اسے تخت سے محروم کر دیا، لیکن یہ کامیابی عارضی ثابت ہوئی، اور صرف تین برس بعد ڈیون کو قتل کر دیا گیا، اوراس طرح افلاطون کی یہ امید کی تجر علمی کے ذریعے سوراکوسے کے شہریار کو مثالی حکومت بنایا جاسکتا ہے، ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

فلسفۂ افلاطون کا آغاز وارتقاء

اس نے اپنے آخری ایام میں صرف مابعد الطبیعات پر تنقیدی مقالات خیالات و نظریات سے استفادہ حاصل کیا، اسی لئے اس کی فکر پر خاندانی ماحول کے علاوہ فیثا غورث، سقراط اور سوفسطائیوں کے افکار کی جھلک نمایاں ہے، ایک متمول اور شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کی بناء پر وہ اعلیٰ مرتبہ کے حامل لوگوں کو حکومت کرنے کا حقدار اور جمہوریت کو بدترین طرز فکر حکومت قرار دیتا تھا۔

افلاطون سقراطی فلسفہ سیاسیات سے متاثر تھا، اسی کے بے شمار تخیلات وافکار کو اپنی کتب کی زینت پایا، اسی طرز میں سقراط نے بیان کیا تھا، افلاطون نے اپنی جملہ کتب مکالمات کی صورت میں آشکارا کیں، غالباً یہ انداز بیان سقراط سے مستعار لیا تھا، اس نے سقراط کی طرح تشبیہ اور مشابہت کے علاوہ استعاروں کو اپنی تحریرات میں اپنانے کے علاوہ اپنے تصورات کی بنیاد سقراط کے نظریات علم، نظریہ حقیقت اور نیکی کے علم پر رکھی۔ افلاطون نے سقراط کے اس نظریہ کو کہ ''ہر آدمی کا فرض ہے کہ وہ سچا اور حقیقی علم تلاش کرے جو انسان کی اپنی ذات میں پنہاں ہے،'' اپناتے ہوئے تخصیص فرائض کا فلسفہ پیش کیا، اور سقراط ہی کے اس نظریہ سے متاثر ہو کر کہ ''اشیاء'' کی حقیقت تصور اشیاء میں مضمر ہے اور خارجی صورت عارضی ہے'' سے متاثر ہو کر تصوریت کی اصطلاح استعمال کی۔

سیبائن کہتا ہے کہ افلاطون کے سامنے الجمہوریہ کی بنیادی شکل میں اس کے استاد سقراط کا یہ تصور کہ ''نیکی علم ہے'' موجود رہا۔

فاسٹر کے مطابق:

''افلاطون نے جو کچھ سقراط سے حاصل کیا وہی اس کے سیاسی فلسفہ پر چھایا ہوا ہے۔'' سقراط کے خیال کے مطابق حکومت صرف عالموں کا حق ہے، اور اسی تصور کی بنیاد پر

افلاطون نے عالموں کی حکمرانی کا فلسفہ پیش کیا اور یہی فلسفہ اس کی مثالی ریاست اور فلسفی حکمرانوں کے پس پردہ کارفرما ہے، بلاشبہ سقراط نے دنیا کے اس سب سے بڑے فلسفی و مصنف میں ایک شان اصلاح‘ اس بے مثل معلم میں شان فکر وتدبر اور اس مفکر اعظم میں شان پیغمبری پیدا کی۔‘‘

افکار سقراط کی تقلید

ڈیلفی کے نظریات کا پرچارک پہلے سقراط تھا، ڈیلفی دراصل مروجہ غیر انسانی اور غیر ہمدردانہ قوانین اور رسم ورواج کے خلاف ایک معتدل اجتہاد تھا، اس اخلاقی وضابطہ کا بنیادی نظریہ کسی چیز کی زیادتی نہیں بلکہ ہر چیز ایک حد کے اندر تھی، ڈیلفی کی اس اخلاقی تعلیم کے ذریعے نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی، انصاف اور بے انصافی کی وضاحت کی گئی تاکہ سماجی انصاف کا ایک حتمی اور آفاقی تصور قائم ہو سکے اسی اخلاقی تعلیم کو آگے بڑھاتے ہوئے سقراط نے ’’تھیوری آف نالج‘‘ اور پھر افلاطون نے ’’تھیوری آف آئیڈیاز‘‘ پیش کیں، تھیوری آف آئیڈیاز میں افلاطون نے اپنے استاد کے نظریات کو اپنے قالب میں ڈھالتے ہوئے حقیقی سماجی انصاف کے اصول پر مبنی ایک حتمی اور آفاقی تصور پیش کیا۔

افلاطون کے ان تصورات پر اس کے استاد سقراط کی گہری چھاپ ہے، نیک زندگی کا حصول اخلاقیات اور علم کی بالادستی کا تصور نظریہ عدل ومکالماتی طریقہ مطالعہ، جمہوری طرز حکومت سے نفرت، قانون اور فلسفی حکمرانوں کی تابعداری کے تصورات دراصل سقراط کے ہیں۔ جنہیں افلاطون نے اپنے تصورات میں شامل کر لیا ہے، سقراط کے نیک زندگی کے تصور کو افلاطون الجمہوریہ میں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ مثالی مملکت کا مقصد اور نصب العین نیک زندگی کا حصول ہے، اخلاقیات کی بالادستی کے سقراطی تصور کو افلاطون اس طرح بیان کرتا ہے کہ ’’معاشرے کا تصور اخلاقی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے‘‘۔ سقراط کے مکالماتی طریقہ جس کے ذریعے سقراط کے تمام تر تصورات کو فروغ حاصل ہوا کہ افلاطون نے اپنی تقریباً تمام تر تصانیف میں استعمال کیا ہے، ’’نیکی ایک علم ہے‘‘ کا تصور تاریخ میں سب سے پہلے سقراط نے پیش کیا، جسے یونان میں بڑی پذیرائی ملی، اور افلاطون بھی اس

تصور سے متاثر ہوا، ایتھنز کی جمہوری حکومت نے چونکہ سقراط کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کیا تھا، اس لئے افلاطون نے اپنے نظریات میں جمہوریت کو بدترین اور اشرافی طرز حکومت کو بہترین طرز حکومت قرار دیا، سقراط نے موت کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی قانون سے روگردانی کرنے سے انکار کر دیا تھا، جس سے افلاطون بے حد متاثر ہوا۔ افلاطون سوفسطائی مکتبہ فکر سے بھی متاثر ہوا۔ لیکن منفی انداز میں، اس نے سوفسطائی افکار پر زبردست تنقید کرتے ہوئے کہا کہ مملکت محور کل ہے، مملکت فرد کی فردیت کی ضامن ہے، ممکن ہی وہ اعلیٰ و برتر ادارہ ہے جس کی تکمیل کے لئے دیگر تمام ادارے اور افراد اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں، فرد مملکت کا ایک ادنیٰ جزو ہے، اور جزو ہونے کے ناطے اس کا صرف اتنا کام ہے کہ وہ کل کی مکمل تکمیل کے لئے دیگر اجزاء کے ساتھ مل کر سرگرم عمل رہے۔

افکار فیثا غورث کی چھاپ

افلاطون کے نزدیک صرف مخصوص لوگ اعلیٰ صفات اور صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لئے ان اعلیٰ صفات کے حامل لوگوں کو معاشرے میں اعلیٰ اور کم صفات کے حامل لوگوں کو کم مقام حاصل ہونا چاہیے، افلاطون کے معاشرے میں تین طبقاتی تقسیم اور اس تقسیم کی انسانی ذہن سے مطابقت کا تصور دراصل فیثا غورث کے انسانی روح کے تین حصوں کے تصور سے متشابہ ہے، فیثا غورث کے ہاں مادی فوائد، جاہ و حشمت اور عقل و دانش کے حامل تینوں گروہوں کو افلاطون نے معاشی فوجی اور فلسفی حکمراں کے تین طبقات میں منقسم کرتے ہوئے درجہ بندی کی ہے، جو فیثا غورث کے ہاں موجود نہیں ہے، فیثا غورث کی طرح ضروری قرار دیتا ہے اس کے خیال میں نظری اعتبار سے علم ریاضی کے ذریعے کسی بھی چیز کی حقیقت کو جانا جا سکتا ہے، جبکہ عملی اعتبار سے میدان جنگ میں فوجیوں کو بہتر طور پر منظم اور مخالفین پر عددی اعتبار سے فتح حاصل کی جا سکتی ہے، اس کے خیال میں ریاضی ہی کی مدد سے انسان عام محسوسات سے بلند ہو کر خالص خیالات کی دنیا میں داخل ہو سکتا ہے، اس کے نزدیک ایک ریاست اپنے ترکیبی عناصر میں اگر علم ہندسہ کے مطابق صحیح طور پر تقسیم ہو تو وہ کائنات کی مانند ہے، جو موسموں، مہینوں، سالوں اور دن رات کے چکر میں تقسیم ہے، اور یہی ہندسے کائنات کی حرکت کا احاطہ کرتے ہیں۔

فلسفہ افلاطون کا نظام کار اور تصورات

افلاطون کا فلسفہ دراصل سقراط کے فلسفے کا ایک منفرد و متحرک تسلسل ہے، اس کے نزدیک فلسفی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے افکار سے انسانی کردار اور سیرت کے لئے بصارت اور ہدایت فراہم کرے اور فلسفے سے اخلاقی قدروں کی اصلاح، علم کے ذریعے ہونی چاہیے اور صحیح ومناسب علم وہی ہے، جو پر حکمت و دانائی پر مبنی ہو، وہ اپنی تصانیف میں سقراط کے طرز کو اپناتے ہوئے مکالمات کے ذریعے تصورات کی تکمیل ممکن بناتا ہے، شخصی مکالمہ رفتہ رفتہ ادبیانہ صورت اختیار کرتے ہوئے مسلسل تقریر کا انداز اختیار کر لیتا ہے، اور اپنے فلسفے میں ضمیات اور افسانوں سے جان ڈالتا ہے، اس کے نزدیک سوفسطائیت میں پائے جانے والے نقائص کا علاج فقط فلسفیانہ علم اور فلسفیانہ زندگی سے ہوسکتا ہے علم ہمیشہ صحیح ہوتا ہے، لیکن استحضار صحیح بھی ہوسکتا ہے، اور غلط بھی بلکہ استحضار بھی علم اور جہل کے بین بین ہوتا ہے۔

افلاطون کے ہاں عام نیکی جس کا مدار رسم و رواج اور ادراک پر ہوتا ہے، حوادث کا تختۂ مشق ہوتی ہے، اور خیر اور شر دونوں کو صحیح سمجھتی ہے، اس کے محرکات ایسے ناپاک ہوتے ہیں کہ اس کے اندر اخلاق کی بنیاد تمام تر لذت اور منافع پر قائم ہوتی ہے، فقط علم ہی عمل کی درستی کا ضامن ہوسکتا ہے، کیونکہ عمل عامل کے خیالات سے متعین ہوتا ہے، اور کوئی شخص عملاً برا نہیں ہوتا، بصیرت عقلی زندگی کی غایت ہے، جس کے لئے باقی تمام چیزیں قربان کر دینی چاہئیں یہ خیال کہ ہر انسان خود ہی نیک و بد اور حق و باطل کا معیار ہے، صداقت کے منافی ہے، اور خود ہی اپنی تردید کرتا ہے، لذت کو زندگی کا اصل مقصد قرار دینا اور ہر فرد کا ذاتی منافع کو اس کے لئے جائز قرار دینا نیکی اور لذت میں غلط بحث پیدا کرنا اور مغیر مظاہر اور سرمدی حقیقت کے امتیاز کو مٹا دینا ہے، اصل علم اور خیر کی قیمت مطلق ہے، نفع و ضرر اور لذت مصیبت اضافی ہیں۔ افلاطون کے خیال کے مطابق فلسفے کا مدار عشق (EROS) پر ہے۔ جو فانی کو غیر فانی بناتا ہے، اور بنانا چاہتا ہے، محسوس سے معقول کی طرف اور جزو سے

کل کی طرف ترقی کرتا ہے، اور عقلی تصورت کا وجدان پیدا کرتا ہے۔ عقلی تصورات فکر برہانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ فکر دو طرح کا کام کرتا ہے، ایک تو یہ ہے کہ وہ جزئی سے کلی کی طرف اور اضافی سے مطلق کی طرف لے جاتا ہے، اور ثانیاً وہ ان کو الگ الگ کرتا ہے، یہ تقسیم جزئی اور کلی کے درمیان بہت سے واسطے پیدا کر دیتی ہے اور ہم کو تصورات کا باہمی ربط بتاتی ہے۔

پارمینائڈیز کے مکالمے میں افلاطون متناقضات کے ذریعے سے تصورات قائم کرتا ہے، اصطفاف میں وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا مدار اشیاء کے اختلاف کیفیت پر ہونا چاہیے اور اسے بتدریج قدم بہ قدم چلتے ہوئے کسی درمیانی کڑی کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔

کریٹلس میں افلاطون اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ منطق کو زبان کی صحت کا خیال رکھنا چاہیے، کیونکہ اشیاء کی ماہیت کو صحیح طور پر بیان کرنا زبان کی صحت پر مبنی ہے، لیکن تصورات کو برطرف کر کے محض الفاظ سے نتائج اخذ کرنا بھی غلط ہے، اس کے نزدیک فلسفہ فقط صحیح علم ہی کا ضامن نہیں ہے، بلکہ اخلاق کا بھی کفیل ہے، اس کے ذریعے سے انسان محسوسات کی زندگی سے بالاتر ہو جاتا ہے، اہم ترین بات عقلی تصورات قائم کرنا ہے، باقی تمام تعلیم و تربیت اس کے لئے ایک تیاری ہے، موسیقی اور جسمانی ورزش سے سیرت کی تہذیب ہوتی ہے، اسی طرح ریاضیاتی علوم سے فکر کی تربیت ہوتی ہے، کیونکہ وہ انسان کو محسوس سے نامحسوس کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ فلسفے کا اصل آلہ فکر بذریعہ تصورات یعنی منطق ہے، اس کے ہاں اصل وجود تصورات کا ہے، اور علم کا وجود فقط وجود ہو سکتا ہے، ہمارے ادراک کی حقیقت مدرکات کی حقیقت کے مطابق ہوتی ہے، فکر کا معروض محسوس کے معروض سے اتنا ہی جدا ہوگا، جتنا کہ فکر احساس سے جدا ہے۔ اس نقطہ نظر سے تفکر علمی کا امکان اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کہ تصورات کے مستقل وجود کو تسلیم کیا جائے ہر حالت میں ہم مجبور ہوتے ہیں۔ کہ اشیاء کے غیر محسوس جوہر کو ان کی محسوس نمود سے ممیز اور ممتاز اور الگ قرار دیں۔

تصورِ جوہرِ اشیاء

افلاطون کے نزدیک تصور اشیاء یا صورت اشیاء ہی جوہر اشیاء ہے، اس کے خیال

میں جب ہم مختلف اشیاء کے لئے ایک ہی نام استعمال کرتے ہیں تو وہ نام ان کے مشترک تصور یا حد کلی کو ظاہر کرتا ہے، اس کلی تصور کا وجود محض ہمارے فکر یا خدا کے فکر کے اندر نہیں ہے۔ یہ علی الاطلاق بذاتِ خود موجود ہے، اور اس میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، یہ ان اشیاء کا جواس سے بہرہ انداز ہوتی ہیں، سرمدی نمونہ ہے، لیکن ان سے الگ ہے، فقط عقل اس کا ادراک کرسکتی ہے، وجود مطلق حکمت کا حقیقی معروض ہے، ہر شے کے اندر جو وجود رکھتی ہے، اپنی وحدت کے باوجود صفات کی کثرت بھی پائی جاتی ہے، اور ہر دوسری چیز سے مختلف ہونے کی وجہ سے اس میں لامحدود عدم بھی پایا جاتا ہے، اسی لئے ہر تصور کی نسبت ہم کو یہ دریافت کرنا چاہیے کہ وہ کن دیگر تصورات سے متحد ہوسکتا ہے اور کن سے نہیں ہوسکتا۔

تصوّر وحدت و کثرت

افلاطون مکالمہ پار مینا ئڈیز میں بالواسطہ یہ ثابت کرتا ہے، کہ نہ کثرت بے وحدت ہوسکتی ہے، اور نہ وحدت بے کثرت نہ صرف اشیاء بلکہ سرمدی جواہر میں بھی وحدت اور کثرت اور محدودیت اور لا محدودیت پائی جاتی ہے، اسی طرح تصورات کے نا قابل تغیر و تبدل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان کو تغیر پذیز مظاہر کی حالت قرار نہیں دے سکتے، خیر کا تصور ہر قسم کے کمال اور ہر طرح کے وجود اور علم کی علت ہے، الٰہی عقل پوری طرح خیر کے منطبق ہے۔ ہستی حقیقی ایک قوت فاعلہ ہے، حرکت زندگی روح اور عقل سب اس کی بدولت ممکن ہیں۔

تصور صفات

افلاطون کی تمام تصانیف بشمول مکالمات میں نہ صرف جوہر بلکہ تمام ممکن اشیاء کے صفات اور افعال کے تصورات ملتے ہیں۔ نہ صرف فطری اشیاء بلکہ ان چیزوں کے بھی صفات مذکور ہیں۔ جوفن وصنعت کی پیداوار ہیں، اسی طرح اچھی چیزوں کے علاوہ بُری چیزوں کے تصورات بھی جو کلی حدود ہیں۔ ان میں موجود ہیں۔
عظیم فی نفسہ، اسم فی نفسہ، یہاں تک کے بستر فی نفسہ اور خلام فی نفسہ بھی اس میں

پائے جاتے ہیں۔اسی طرح گندگی وکثافت اور ظلم اور عدم کا تصور بھی ان میں ہوتا ہے،

تصّور خیر

افلاطون کے خیال میں جو چیز جس طرح ہے، وہ اس لئے ہے کہ اس کی بہترین شکل و صورت وہی ہوسکتی ہے، اور ہر چیز کا صحیح و درست تصور اسی وقت قائم ہوسکتا ہے، جب کے خیر کو اس کی انتہائی غایت قرار دیا جائے، خیر تمام وجود اور علم کی اساس اور اصل ہے، وہ ہر موجود کی حقیقت ہے اور ہر عالم کا علم، وجود کی اصل مطلق ہونے کی وجہ سے خیر اور خدا اہم ذات ہیں۔

تصور کامکمل وجود

افلاطون کے نزدیک اشیاء تغیر پذیر اور فنا پذیر ہوتی ہیں۔تصور خالص اور کامل ہوتا ہے، لیکن اشیاء ناقص ہوتی ہیں۔کامل وجود تصور میں پایا جاتا ہے، اشیاء وجود اور عدم کے مابین رہتی ہیں۔جس طرح کہ حسی ادراک علم اور جہل کے بین بین رہتا ہے، افلاطون کے مطابق، احساس کے نقص کی ہی توجیہہ ہوسکتی ہے، کہ کلیتاً تصور ہی اس کا ماخذ نہیں اس کے علاوہ اس کے اندر کچھ اور عنصر بھی داخل ہیں اشیاء کے اندر جتنی حقیقت یا کمال موجود ہوتا ہے، وہ تصور کی بدولت ہے، اس لیے اشیاء کے متفرق عناصر کی بدولت وہی ہوتی ہے، جو مظاہر حسی کو تصور سے الگ کرتی ہے، یہ عناصر لازماً لامحدود ولاموجود لامعلوم اور لاثابت ہوتا ہوگا،

تصّور مادہ

افلاطون کے ہاں مادہ مکان ہی کی ایک کثیف صورت ہے، مادہ اور اشیاء اس میں پیدا ہوتی ہیں، اجسام اس وقت بنتے ہیں جبکہ مکان کے کچھ حصے عناصر اربعہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔جب وہ ایک دوسرے میں تبدیل ہوتے ہیں۔

تصّور حقیقت

افلاطون کے ہاں جو چیز اشیاء کو تصورات سے ممتاز کرتی ہے وہ عدم ہے، لیکن دونوں

میں جو حقیقت ہے، وہ مشترک ہے، اشیاء کی تمام حقیقت تصورات کی موجودگی اوران سے بہرہ اندوز ہونے میں ہے، لیکن چونکہ تمام جسمانی صفات کا ماخذ عدم ہے، اس لیے وہ بھی ایک قسم کی ثانوی علت ہے جواندھا دھند اور غیر عقلی ہے، فطری مقاصد سے اس کا تعلق نہیں لیکن وہ ان کے حصول کے لیے ایک شرط مقدم بھی ہے، اور عقل کے لیے تحقیق مقاصد میں حدود اور موانع بھی پیش کرتی ہے، اشیاء میں تصورات کے علاوہ جو دوسرا عنصر ہے، اس کو بھی کسی نہ کسی قسم کا وجود کہنا پڑے گا خواہ وہ تصورات سے کتنا ہی مختلف ہو تصورات اور اشیاء ایک دوسرے سے الگ معلوم ہوتے ہیں۔ تصورات نمونے ہیں۔ اور اشیاء ان کی نقلیں یا ان کے پرتو ہیں۔

تصور تخلیق کائنات

افلاطون نے جو نظریہ کائنات کی تخلیق کے سلسلے میں پیش کیا جامع اور بھرپور انداز میں ہے۔ فلاسفہ نے اس فلسفہ کو ہر دور میں سراہا ہے، افلاطون کے خیال میں خالق عالم ایک زندہ ہستی کے نمونے پر روح کائنات کو اس کے عناصر ترکیبی سے مرکب کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ چار عناصر لیتا ہے اُن سے کائنات بناتا ہے اور اس کو حیوانات اور نباتات سے آباد کرتا ہے۔ عالم چونکہ عقل کی پیداوار ہے اس لئے وہ کسی مقصد کے لیے بنایا گیا ہے۔ مظاہر کی صحیح توجیہہ فقط علل غائیہ سے ہوسکتی ہے۔ مادی علل غائیہ کے عمل کے لیے محض شرائط واسباب ہیں۔

افلاطون کے مطابق کائنات کی تعمیر میں پہلے چار عناصر بنائے گئے۔ خائی نقطہ نظر سے اجسام کی مرائیت اور لمسیت کے لیے آگ اور مٹی کا ظہور ہوا۔ اس کے بعد ان کے درمیان واسطے کی ضرورت ہوئی۔ پانچ باقاعدہ اجسام میں سے چار آگ، پانی، مٹی اور ہوا کی اساس ہے۔ یہ اجسام نہایت باریک قائم الزاویہ مثلثوں سے بنے ہوئے ہیں۔ جب عناصر ایک دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں جو فقط تین اعلیٰ عناصر میں ممکن ہوسکتا ہے تو وہ مثلثوں میں تحلیل ہوجاتے ہیں اور پھر ان میں سے جدید صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ ہر عنصر کا ایک فطری مقام ہے جس کی طرف وہ ساعی رہتا ہے۔ کائنات کی تمام فضا ان کے مجموعے سے بھرپور ہے۔

افلاطون کائنات کو ایک مکمل کرہ تصور کرتا ہے' زمین اس کے نزدیک ایک ٹھوس کرہ ہے جو عالم کے وسط میں واقع ہے۔ ثوابت اور سیارے برجوں اور حلقوں میں جڑے ہوئے ہیں جن کی گردش کے ساتھ وہ گھومتے ہیں۔ جب تمام ستارے اپنی اصلی جگہ واپس آ جاتے ہیں تو ایک کونی سال ختم ہوتا ہے جس کی مدت دس ہزار برس ہے۔ ستارے معقول اور مسعود مخلوق ہیں۔ یہ مرئی دیوتا ہیں اسی طرح کل کائنات ایک محسوس ہے جس کے اندر تمام دیگر فطرتیں داخل ہیں۔ یہ مخلوقات میں سے کامل ترین وجود ہے اور فوق الاحساس وجود کا عکس ہے۔

تصور روح انسانی

روح انسانی کے فلسفہ کو افلاطون نے نہایت خوبصورت پیرائے میں قلمبند کیا ہے،

افلاطون کی نظر میں روح انسانی روح کائنات کی ہم جنس ہے جس میں سے وہ نکلی ہے۔ روح، بسیط اور غیر جسمی ہے وہ اپنی ذاتی حرکت سے جسم کو حرکت دیتی ہے۔ تصور حیات اس کا جز ولاینفک ہے اس لیے اس کا نہ کوئی آغاز ہو سکتا ہے اور نہ انجام۔ چونکہ روحیں جسم خاکی کے اندر ایک اعلیٰ عالم سے اتر کر آئی ہیں اس لیے اگر یہاں پر اُن کی زندگی پاکیزہ رہی ہے اور ان کے مقاصد بلند رہے ہیں تو وہ موت کے بعد پھر عالم بالا کی جانب عود کر جاتی ہیں اور جن کو اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے کچھ ایک دوسرے عالم میں جا کر سزا پاتی ہیں اور کچھ حیوانوں اور انسانوں کے جسموں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ چونکہ پہلی زندگی میں روح تصورات کو دیکھ چکی ہے اس لیے اس زندگی میں محسوسات کو دیکھ کر جو تصورات کی نقلیں ہیں اس کو تصورات یاد آ جاتے ہیں۔ اس کے خیال میں عقل روح کا الٰہی اور غیر فانی حصہ ہے جسم میں ہونے کے بعد روح ایک فانی حصہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے اس فانی حصے کے بھی دو شعبے ہیں ایک شجاعت اور دوسرا شمولیت عقل کا مقام سر کے اندر ہے' شجاعت کا مقام قلب کے اندر اور شمولیت کا مقام جسم کے نیچے کے حصے میں ہے۔

افلاطون کا فلسفۂ سیاست وریاست

افلاطونی فلسفہ سیاست کا طرز فکر

افلاطون سقراط کے سیاسی فلسفے سے بے حد متاثر تھے،اس نے سقراط کے بے شمار خیالات و اعتقادات کو اپنی کتب میں اپنے حوالے سے پیش کیا،اس نے اپنی جملہ کتب مکالمات کی صورت میں تحریر کیں جو سقراط ہی کا طریقہ کار تھا،

افلاطونی فلسفہ سیاست کی غرض وغایت

افلاطون کے زمانے میں ایتھنز کی حکومت اپنے زوال کی منازل طے کر رہی تھی،شہری ریاستیں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور ہر شہری ریاست مختلف الخیال طبقات میں بٹ چکی تھیں،ایک طبقہ شہری ریاست پر حکومت کرنے والوں کا تھا،جبکہ دوسرا رعایا کا،حکمران جابر تھے اور رعایا محکوم و مجبور حکمران اخلاقی ضوابط سے بے نیاز ہو کر اپنے مفادات کا تحفظ کرتے تھے جبکہ محکوم لوگ کمزور سے کمزور تر اور غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے تھے،اس طرح ہر شہری ریاست میں حکمرانوں اور رعایا کے درمیان بیگانگی اور نفرت کی خلیج روز بروز وسیع ہو رہی تھی،ان حالات میں جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں سقراط کی موت کے بعد افلاطون جمہوریت پسندوں کا دشمن ہو گیا،اور اس نے دولت مندوں کے ذریعے ایتھنز کو سیاسی زوال سے بچانے کے لئے سیاسی مفکر کی حیثیت اختیار کی۔

نظریہ جمہوریت

افلاطون کہا کرتا تھا کہ جمہوریت محض دھوکہ اور فریب ہے، عام لوگوں کی رائے کو حقیقت یا علم کا درجہ دینا جہالت ہے کیونکہ ”رائے تعصب اور تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں ہے،جمہوریت مستقل کشاکش اور فتنہ وفساد ہے“۔

افلاطون مضبوط مستحکم اور پائیدار حکومت کا قائل تھا، جس کی اس دور میں ایتھنز کو ضرورت تھی، وہ مملکت کے زوال کی پہلی نام ونمود، نمائش اور شان وشوکت کی خواہش کو قرار دیتے ہوئے کہتا ہے، کہ ''اس سے حکمران غافل ہو جاتے ہیں، اور خوشامدیوں میں گھر کر اپنے اعلیٰ مقاصد کو بھول جاتے ہیں۔ جس سے عام شہری خوف وہراس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مملکت چندسری ہو کر رہ جاتی ہے، اور جمہوریت کے لئے حالات سازگار ہوتے ہیں۔ جمہوریت سے گروہ بندی اور پھر سیاسی جماعتیں جنم لیتی ہیں۔ چالباز اور مکاران پارٹیوں کے لیڈر اور ان میں سے مطلق انسان یا جابر حکمران بنتے ہیں۔ جن کا دل عقل کی روشنی اور اخلاق کی رہبری سے محروم ہو جاتے ہیں۔

یونانی سیاست کا آغاز وارتقاء

سیاسی فکر کے آغاز کا تعین بڑا دشوار ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی خاص یا مخصوص علاقے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ لفظ Politics دراصل یونانی اصلاح پولس (Polis) سے اخذ شدہ ہے جس کے معنی ''شہری مملکت سے متعلق امور'' کے ہیں اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ سیاسی فکر کا باقاعدہ آغاز قدیم یونان سے ہوا تھا۔ یونان میں بیداری کی ابتداء ساتویں صدی عیسوی میں اس وقت شروع ہوئی جب کسان سونے اور چاندی کے سکے رائج ہونے کی وجہ سے بدحال ہوئے اور فوجی طبقہ کاشتکاروں پر چھا گیا۔ ساہوکاروں نے کسانوں کی زمینیں خریدلیں اور کاشتکاروں نے معاشی دشواریوں سے پیش نظر ان کی غلامی کو قبول کرلیا۔ اس نازک حالت میں ''ڈلفی'' کی غیبی آواز سے اخلاقی تعلیم شروع کی جس کا معاشرہ کے ہر طبقہ پر گہرا اثر پڑا اور اس تعلیم کے زیر اثر ایسے قانون ساز پیدا ہوئے جنہوں نے یونان کے لئے سیاسی دستور مرتب کئے۔ ریاست کی تھیوری (Theory) کا آئین پروٹے گورس اور یونان کی خاص ریاست ایتھنز کا آئین سولون (Solon) نے بنایا۔

یونان میں شہری ریاستوں کی ابتداء چھٹی صدی قبل مسیح اس وقت شروع ہوئی جب معاشی انقلاب موثر ہو چکا تھا۔ سپارٹا میں ایک فوجی اشرافی حکومت قائم ہوئی جسے لے کر گیس کے قوانین نے مزید مضبوط بناتے ہوئے کاشتکاروں کو زمینداروں کے عملاً غلام بنا

دیا۔ دوسری جانب ایتھنز کی ریاست میں سولن کے آئین نے جمہوریت کا بیج بویا۔ سولن نے حتی المقدور معاشرے میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب رہا۔ اس نے اپنی نظموں میں کہیں کہیں ان اصولوں کا ذکر کیا ہے جن کو وہ بہتر سمجھتا تھا اور جن کو اس نے ایتھنز کے دستوری قوانین بناتے وقت مدنظر رکھا تھا۔ اس نے کاشتکاروں کا قرضہ منسوخ کر کے ان کو سکھ کا سانس لینے کا موقع دیا۔ ہر فرد کو اس بات کا حق دیا کہ وہ محتاج اور بے بس لوگوں کی طرف سے عدالت میں انصاف طلب کرے۔ مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک جیوری مقرر کی جس کا انتخاب عوام میں سے ہوتا تھا۔

سولن کے شہر چھوڑ جانے کے بعد اس کا رشتہ دار پی سس ٹرے ٹس چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی مدد سے ایتھنز کا بادشاہ بنا۔ اس نے ان زمینداروں کی مالی مدد کر کے ان کی مالی مشکلات میں مزید کمی کی۔ اس نے وہ تمام ادارے قائم رکھے جو سولن کے آئین کے مطابق معرض وجود میں آئے تھے۔ بعد میں کلائیس تھینز نے ریاست کی آبادی کو نئے سرے سے اصولوں کے تحت تقسیم کیا اور کلیسا کو ملک کا فرمانروا بنا دیا۔ اس نے کلیسا کی منتخب کردہ دس کمیٹیوں کو عملی اختیارات دے کر مکمل جمہوریت نافذ کی۔

اسی دور میں سپارٹا میں شہریوں کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل تھا لیکن کھانا سب ایک ساتھ کھاتے تھے اور ہر شہری کو اناج وغیرہ کی ایک خاص مقدار اپنے حصے کے طور پر مہیا کرنا پڑتی تھی۔ شہری ایک خاص وردی پہنتے تھے اور ان کے کھانے کی چیزیں مقرر تھیں۔ کریٹ کے جزیرے میں تمام زمینیں ریاست کی ملکیت تھیں۔ ریاست ان پر کاشت کرواتی اور پیداوار شہریوں کے تصرف میں یکساں آتی تھی۔ ایتھنز کی ریاست چاندی اور پتھر کی کانوں اور جنگلوں کی مالک تھی اور اس میں شہریوں کی ملکیت پر ایک حد تک نگرانی رکھی جاتی تھی۔ مل کر کھانے اور زمین کی ملکیت میں شراکت کی پابند نہیں تھی اور نہ ہی تعلیم دینا ریاست کی ذمہ داری میں شامل تھا۔

سولن کے بعد فیثاغورث اور ''ای ادنیا'' کے فلسفیوں نے بہت سے ایسے اصول مدون کیے جن کا بعد کے آنے والے فلسفیوں نے گہرا اثر قبول کیا۔ فیثاغورث نے ماہر ریاضیات ہونے کے باوجود ایک خاص فلسفہ حیات روشناس کروایا جس کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ ''ایک عدد

اس وقت تک سالم رہتا ہے جب تک اس کے اجزاء برابر ہیں۔ ریاست کی بنا انصاف پر اس وقت تک رہتی ہے جب تک اس کے اجزاء میں مساوات ہو اور انصاف کا مقصد مساوات کا قائم رکھنا ہے۔ انسان کی تین قسمیں ہیں عقل پرست، شہرت پرست اور دولت پرست اور یہ تینوں قسمیں معاشرے اور ریاست کے اجزاء ہیں۔'' ہیریک لی ٹس نے کہا کہ ''انسان کو اپنی زندگی قانون کے مطابق بسر کرنا چاہیے تمام انسانی قوانین ایک قانون الٰہی پر مبنی ہوتے ہیں۔'' سوفسطائی پروٹے گوریس نے خیال ظاہر کیا کہ ''ریاست کی بنیاد اور اس کے قائم ہونے کی محرک انسانی ضروریات ہیں۔ ادب اور اخلاق کے اصول خدا کی طرف سے براہ راست نازل ہوتے ہیں اور ان کے بغیر ریاست کی حیثیت افراد کے ایک مجموعے سے زیادہ نہیں ہوسکتی اور اس کا مقصد صرف انسانی زندگی کی ادنیٰ ضرورتوں کو رفع کرنے تک محدود رہتا ہے۔ ریاست ایک تعلیمی ادارہ ہے اور ریاست قانون کے ذریعے سے سیاسی اور اخلاقی زندگی کو بہترین شکل دیتی ہے۔'' سوفسطائی فی لے نے کہا کہ ''تمام سیاسی دشواریوں کی وجہ معاشی بدنظمی ہے'' سوفسطائی ہپوڈے مس نے خیال ظاہر کیا کہ ''آبادی کو کسان، دستکار اور سپاہی کے تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے اور حاکموں کے انتخاب کا حق ان تینوں طبقوں کو یکساں ہونا چاہیے۔ مزید براں زمین کو بھی تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے ایک وہ جو کسان کی ذاتی ملکیت ہو۔ دوسری وہ جو ریاست کی ملکیت ہو جس سے سپاہی طبقے کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور تیسری وہ جو مذہبی اغراض کے لئے وقف ہوں۔''

ایتھنز کی جمہوریت کا نصب العین 441 ق م میں سپارٹا کی جنگ کے آغاز تک قائم رہا لیکن جلد ہی لوگ بے اصولی اور بے غرضی کی طرف راغب ہو گئے۔ سقراط اور افلاطون ایتھنز کی سیاسی اور اخلاقی تنزلی کی وجہ سے بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''تنزلی کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایتھنز کے لوگوں کو اخلاق و معاشرت کا صحیح علم حاصل نہ تھا جب تک ان کی ذہنیت پر ان کے رہبروں کی روایات اور قدیم اخلاقی تعلیم کا اثر رہا وہ سنبھلتے رہے لیکن ایرانی جنگوں میں فتح یاب ہونے کے ساتھ ہی عقلیت کا دور شروع ہوا اور عقل کی پرستش میں لوگ اس آئینِ حیات کو بھول گئے جس نے اس وقت ان کی رہنمائی کی تھی۔ چنانچہ یونان کی سیاسی اور اخلاقی زندگی میں انتشار پیدا ہوا اور ایک صدی کے اندر اندر نہ صرف ایتھنز کی عظمت

خاک میں مل گئی بلکہ تقریباً یونان کی تمام شہری ریاستیں تباہ ہو گئیں۔''

ایتھنز کے بگڑے ہوئے سیاسی اور اخلاقی فلسفے کے خلاف سب سے پہلے سقراط (470-399 ق م) نے بغاوت کی اور کہا کہ'' قانون کی پیروی ہر شخص کا اخلاقی فرض ہے اور قانونی سزا سے گریز کرنے کا اس شخص کو بھی حق نہیں ہے جسے یقین ہو کہ وہ بے گناہ ہے۔ مدبری ایک فن ہے جس میں بغیر استعداد اور تعلیم کے مہارت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ریاست اور سیاسی زندگی کا مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب ایسی شخصیتیں جن کا علم اور عمل کامل ہو اس کی رہبر اور حکمران بنائی جائیں۔ سیاسی قابلیت کوئی ادنیٰ چیز نہیں جس کا ہر کس و ناکس ہر درزی اور قلعی گر دعوے دار ہو سکے۔ ریاست کا کام ماہرین سیاست کے بغیر نہیں چل سکتا ہے اور سیاسی زندگی کی اصلاح ان لوگوں کے بغیر ممکن نہیں جو ہر علم و ہنر اور اخلاقی صفت میں کامل ہوں۔ ناجائز طرز عمل اور وہ زیادتیاں جو بے اصول حکمران کرتے ہیں ان کی ذات کو بھی اتنا ہی صدمہ پہنچاتی ہیں جتنا اداروں کو۔ سیاسی اقتدار ان ہی لوگوں کا حق ہے جو اس کی ذہنی اور جسمانی استعداد رکھتے ہیں۔ صرف فائدہ حاصل کرنے کو زندگی کا مقصد بنانا ایک انتہائی ادنیٰ معیار ہے۔''

ریاست کا وجود

سقراط کے بعد افلاطون نے اپنی تصنیف ''الجمہوریہ'' میں اخلاقی 'مافلسفیانہ' مافوق الطبعی 'مذہبی' تعلیمی' نفسیاتی اور تاریخی عقیدوں کی آمیزش سے ایک ایسا فلسفہ حیات مرتب کیا جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تشکیل کے لئے رہبری کی حیثیت رکھتا ہے۔ افلاطون کے مطابق ''ریاست کا قیام اس وجہ سے عمل میں آیا کہ انسان خود اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ ابتدائی شکل میں ریاست صرف ایک بستی ہوتی ہے۔ جس میں کاشتکار اور مختلف قسم کے دستکار آباد ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں محض آسودگی مدنظر ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ حفاظت کی ضرورت سپاہیوں کا ایک طبقہ پیدا کر دیتی ہے جس میں جسمانی خواہشوں کے علاوہ لوالعزمی اور جوش کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔ ترقی کرتے کرتے سپاہیوں میں ایسے افراد سامنے آتے ہیں جن میں دیگر اوصاف کے علاوہ عقل اور غور کا مادہ بھی ہوتا ہے اور جن کی شخصیت سب سے

زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ حکومت کرنے کا حق ان ہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ اس طرح معاشرے کا پہلا اصول معاشرے کے تین طبقے ہیں اور ہر طبقے کے سپرد وہ کام کیا جانا چاہیے جسے کی وہ اہلیت رکھتا ہو۔ اس اصول پر عمل کر کے ہر شخص اپنی سرشت کے مطابق سکون' آسودگی اور اطمینان حاصل کر سکتا ہے۔''

ریاست کے اجزاء

افلاطون کے نزدیک ''ریاست میں کامل ربط اور اتحاد' دانائی' ہمت اور اعتدال کے عناصر کو عدل کے ذریعے ہم آہنگ کرنے سے پیدا ہوتا ہے اور اگر افراد کمال حاصل کرنا چاہیں تو انہیں بھی اپنی طبیعتوں میں عدل کے ذریعے توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیے۔ ریاست میں کاشتکار اور دستکار جسمانی خواہش' سیاسی ہمت اور محافظ عقل جیسی حیثیت رکھتے ہیں۔ ریاست کو چاہیے کہ نچلے طبقے کی ذہنی پرورش اس عقیدے سے کی جائے کہ خدا نے محافظوں کو سونے سے' سپاہیوں کو چاندی سے اور نچلے طبقے کو تانبے سے بنایا ہے اور نچلے طبقے کا فرض ہے کہ وہ انسانیت کے بہتر عناصر کی اطاعت کرے۔ محافظوں اور سپاہیوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ اعلیٰ مرتبے کا حق ادا کر سکیں۔''

سربراہ ریاست کی عمر اور ذمہ داریاں

ریاست میں صفحہ نمبر 318 پر افلاطون نے بیان کیا ہے اور جب یہ پچاس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو اس وقت ان میں سے جو باقی ہوں اور جنہوں نے اپنی زندگی کے تمام اعمال میں اور علم کے ہر شعبے میں اپنے آپ کو ممتاز کیا ہو وہ بالآخر اپنے معراج کمال کو پہنچے۔ اب وقت ہے کہ وہ اپنی روح کی آنکھ کو اس عالمگیر روشنی کی طرف اٹھائیں جو ہر چیز کو منور کرتی ہے اور مطلق خیر کا نظارہ کریں۔ کیونکہ یہی وہ نمونہ ہے جس کے مطابق انہیں ریاست کو' افراد کی زندگی کو' اور خود اپنی بقیہ زندگی کو منضبط کرنا ہے۔ فلسفہ ان کا خاص مشغلہ ہو' لیکن جب باری آئے تو یہ سیاست کی مشقت بھی گوارا کریں اور عام مفاد کی خاطر حکومت بھی کریں' اس طرح نہیں کہ گویا یہ کوئی بڑی بہادری کا کام کر رہے ہیں بلکہ محض ایک فرض ادا کرنے کے طور پر۔

اور جب یہ ہر نسل میں اپنے جیسے لوگ پیدا کر دیں اور انہیں اپنی جگہ حکام ریاست کی جگہ پر چھوڑ جائیں تو اس وقت یہ مبارکوں کے جزیرے کو سدھار جائیں گے اور وہیں مقیم رہیں گے۔ اہل شہر کی طرف سے انہیں عمومی یادگاریں' قربانیاں اور اعزاز ملیں گے' اگر پیتھی ہاتف غیبی نے اجازت دی تو' تو نیم دیوتاؤں کی طرح ورنہ کم از کم متبرک اللہ والوں کی حیثیت سے۔

نظریۂ ریاست

افلاطون نے سوفسطائیوں کے اس نظریہ کہ ''ریاست حکمران طبقہ کی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ ہوتی ہے،......

کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''رعایا کی بھلائی ہی حکمرانوں کی بھلائی ہے اور ریاست اچھائی کے فروغ اور بہتر عوامی زندگی کے لئے تشکیل دی جاتی ہے،...... افلاطون انفرادیت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ تصوریت پسند بھی تھا، انفرادیت پسند ہونے کے ناطے وہ تسلیم کرتا تھا، کہ ''انسان نے ریاست اپنی ضرورت کی تکمیل کی خاطر تشکیل دی ہے، اور ریاست فرد کی طرح ایک عصریتی فرد ہے، اور یہ ریاست کا فرض ہے، کہ افراد کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق جسمانی اور روحانی نشوونما کے لئے بہترین مواقع فراہم کرے''......

جبکہ بحیثیت ایک تصوریت پسند اس کا کہنا ہے کہ ''کوئی ریاست اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک حکومت ایسے اشخاص کے پاس نہ ہو جو یہ جانتے ہوں کہ ریاست کی بہتری کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔''

اس کے نزدیک حکومت صرف عالموں کا حق ہے، اور تعلیم ہی وہ بہترین ذریعہ ہے جس سے نیک اور بہترین انسان پیدا ہو سکتے ہیں۔

محافظ کا کردار

افلاطون نے ادب میں موسیقی اور جسمانی نشوونما میں غذا اور حفظان صحت کے اصولوں کی تعلیم کا اضافہ کیا۔ محافظ بننے کے لئے سترہ سال کی عمر کے بعد دس سال تک ریاضیات، ہیئت اور پانچ سال تک فلسفے کی تعلیم ضروری دی۔ محافظوں کے لئے پندرہ سال

تک حکومت کرنا لازم قرار دیا جائے۔ محافظوں کی تعلیم کے لئے اس نے اور بہت ساری تجاویز پیش کیں جو اشتمالیت کے نام سے مشہور ہیں۔ اس نے اپنے نظام حیات میں کاشتکاروں کو تعلیم سے اور سپاہیوں اور محافظوں کو ان لذتوں سے ناآشنا رہنے پر مجبور کیا جو کاشتکاروں کے حصہ میں آئیں۔ اس نے تعلیم میں مرد اور عورت میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا اور دونوں کے لئے ایک ہی نصاب مرتب کیا۔ اس کے نظام حیات میں مرد یا عورت کوئی بھی محافظ بن سکتا ہے۔

ریاست میں نکاح کا تصور

افلاطون نے صحت مند اور تندرست اولاد پیدا کرنے کے لئے یہ اصول بنایا کہ سپاہیوں اور محافظوں کے طبقوں میں سے ان مردوں اور عورتوں کے عارضی نکاح کر دیئے جائیں جو جسمانی اور روحانی خوبیوں کے لحاظ سے شہریوں کے اعلیٰ نمونے ہوں۔ پیدائش کے وقت بچہ ماں سے جدا کر دیا جائے تاکہ کسی ماں کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس کا بچہ کون سا ہے۔ اس کے مطابق اس لاعلمی سے ہر ماں کی نظر میں وہ تمام بچے جن کی پیدائش کا زمانہ ایک ہوگا یکساں عزیز ہو جائیں گے۔ نکاح صرف عمر، صحت اور طبیعت کے لحاظ سے باہم مناسبت سے ہوگا۔ مرد و عورت کی یکجائی کی اجازت محافظ کی مرضی سے ہوگی اور وہ اولاد جن میں ذرا برابر نقص ہو کر تلف کر دی جائے گی۔ ریاست کی آبادی میں تناسب سے زیادہ اضافہ اور نکاحوں کی تعداد کو ایک خاص حد تک محدود کرنے کی ذمہ داری محافظوں پر ہوگی۔ شادی کے دس سال تک میاں بیوی کو تجربہ کار عورتوں کی نگرانی میں رکھا جائے گا۔

بادشاہ کے لئے فلسفی ہونا

افلاطون کے نزدیک شہروں بلکہ نوع انسانی کو اپنے مصائب سے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک دنیا میں فلسفی بادشاہ نہ ہوں یا بادشاہوں اور شہزادوں میں فلسفے کی روح اور فلسفے کی قوت نہ آ جائے۔ افلاطون کی دوسری تصانیف ''مدبر'' اور ''نوامیس'' ہیں۔ کتاب ''مدبر'' میں فلسفی کی جگہ ''مدبر'' لے لیتا ہے۔ اس کے نزدیک ''مدبر میں فلسفی کی تمام

صفات اور عملی علوم پر فضیلت حاصل ہونی چاہیے۔ مدبر کو اپنے ماتحتوں پر کام اقتدار حاصل ہونا چاہیے۔ اسے قانون کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔"

ریاست کا اقسام

یونان میں عام طور پر ریاستوں کی پانچ قسمیں بادشاہت' مطلق العنانی بادشاہت' اشرافیہ' چندسری اور جمہوریت مانی جاتی تھیں۔ افلاطون نے ان میں عینی بادشاہت اور بے آئینی جمہوریت کا اضافہ کیا۔ اس کے نزدیک تین طرح کی حکومتیں دستوری بادشاہت' اشرافیہ اور معتدل جمہوریت قانونی ہیں۔ عینی بادشاہت کا درجہ سب سے بلند ہے۔ اس کے بعد بادشاہت ہے جبکہ جمہوریت جبری ریاستوں میں غنیمت اور قانونی ریاستوں میں سب سے کم تر ہے۔

حقوق ملکیت

افلاطون کے نزدیک "ملکیت کا حق سب کا ہے لیکن اس پر ریاست کی نگرانی ہونی چاہیے۔ شہروں کی جو زمین دی جائے اس کا ایک حصہ شہر کے قریب اور دوسرا حصہ سرحد کے پاس ہونا چاہیے۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو زیادہ دولت پیدا کرنے سے روکے اور درست کاری اور تجارت ریاست کی نگرانی میں غیر ملکیوں کے سپرد کرے۔ عورتوں کو سیاسی حقوق کی تعلیم کے یکساں مواقع فراہم کرے اور ہر شخص کو مرضی یا پسند کی شادی کرنے سے روکے۔"

مثالی دستور

افلاطون کے نزدیک وہ دستور زیادہ پائیدار ہوتا ہے جس میں حکومت کے مختلف اصولوں کی آمیزش ہو اور اس بنا پر جمہوریت کی ایک ایسی آمیزش کا تصور پیش کرتا ہے جس میں دانائی اور آزادی دونوں شامل ہوں۔ اس نے حاکموں کی کارگزاری کی جانچ پڑتال کے لیے محتسبوں کی انجمن اور شہریوں کے اخلاق کی نگرانی کے لیے مجلس شبینہ تجویز کیں۔

توحید اور قانون کا احترام

افلاطون کے نزدیک ''سب سے اہم بات یہ ہے کہ خدا کی وحدت اور اس کی قدرت کاملہ پر یقین رکھا جائے۔ حقیقی اطاعت کے لیے لازمی ہے کہ شہری اپنے قانون کی دل سے قدر کریں اور ان کی مرضی حکومت کی مرضی کے تابع ہوں۔ قانون میں اس وقت تک تبدیلی یا ترمیم نہ کی جائے جب تک تمام حاکم' تمام شہری اور تمام غیبی آوازیں اس پر متفق نہ ہوں۔ قانون کے مطابق سزا دینے کا مطلب سزا پانے والے کی نیکی میں اضافہ یا بدی میں کمی ہوتا ہے۔''

ریاست میں تعلیم کی اہمیت

نوامیس میں وہ تعلیم کے اصول بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''بچوں کی تعلیم گہوارے سے شروع کرنی چاہیے اور گہوارے سے ہی تعلیم ریاست کی نگرانی میں ہونی چاہیے۔ تین سال کی عمر سے ورزش شروع کی جائے۔ چھ سال کی عمر میں سکول داخل کرایا جائے۔ ہر ضلع میں الگ سکول ہونا چاہیے اور سکول کے ساتھ ورزش گاہیں اور کھیل کے میدان ہونے چاہئیں۔ اسکول میں چار سال تک ابتدائی تعلیم دی جائے جس میں گھوڑ سواری' تیر اندازی اور نیزہ بازی سکھانا چاہیے۔ دس سال سے تیرہ سال تک ادب اور تیرہ سے سولہ سال تک موسیقی کی تعلیم دینی چاہیے۔ شادی کی اجازت پچیس برس تک نہیں ہونی چاہیے۔''

ترویج فلسفہ ریاست

افلاطون نے قدیم یونان کے استحکام کے لیے ایک مستحکم سیاسی نظام اور اس کے ادارت سے متعلق مثالی تصورات پیش کیے جو بالآخر یونانی معاشرتی عدم استحکام' متزلزل سیاسی حالات اور مختلف طرز ہائے حکومت کے خاتمے کا باعث بنے۔ اس کا تصور مثالی مملکت اس وقت کے سماجی حالات کی بہتری اور لوگوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر کے لئے ایک انفرادی فکری کوشش تھی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہا۔ اس کی مثالی مملکت کے تصور

کی اساس پر نہ صرف یونان نے سیاسی نظام اور ادارت کی بنیاد رکھی بلکہ انقلاب فرانس کے بعد تمام مغربی مملکتوں نے افلاطونی فلسفہ سیاسیات کی بنیاد پر سیاسی زندگی اپنائی اور آج بھی مغربی دنیا میں اس کے فلسفہ سیاست کے بہت سارے اصول کارفرما ہیں۔

ضابطہ اخلاق

افلاطون نے اہل یونان کو سوفسطائی نظریات کے باعث برپا ہونے والی اخلاقی پستی سے نکالنے کے لیے ایک ضابطہ اخلاق کی ضرورت پر زور دیا جو ہر جگہ اور ہر وقت قابل عمل ہے۔ اس نے تاریخ میں پہلی مرتبہ مملکت کا اخلاقی مقصد متعین کرتے ہوئے کہا کہ ''مملکت کا ایک اخلاقی وجود ہے جس کے لازمی اجزا افراد ہیں جن کی اخلاقی نشوونما صرف مملکت کے مستحکم سیاسی نظام کی بدولت ممکن ہے'' اس کے سیاسی فلسفہ کا بنیادی مقصد مثالی مملکت کی تنظیم و تعمیر کے علاوہ حقیقی اچھائی اور نیکی کا حصول ہے۔

بادشاہ کے لیے فلسفی ہونا

افلاطون نے ''الجمہوریہ'' میں سیاستدان اور ''دی لاز'' میں ایک عقلی اور اخلاقی استدلال پر مبنی خیالی ریاست کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہی دراصل ایک حتمی ایک سیاسی اور آفاقی تصور پر مبنی ریاست کا خاکہ تھا۔ جس کا بنیادی اصول بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ریاست کی حکومت سے سطحی قسم کے امراء جو علم سے بلند ہونے کے باوجود اپنی دولت اور جائداد کے باعث حکومتی عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں کو علیحدہ کر کے ان کی جگہ ان عظیم لوگوں کو لایا جائے جنھوں نے اپنی زندگیاں فلسفے کے علم کے حصول کے لیے وقف کر رکھی ہیں اور ریاست کی ڈور ایک ایسے فلاسفر کے حکمران کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جس کی کوئی جائداد اور کنبہ نہ ہو اور اس میں علم، بہادری، اعتدال اور انصاف جیسے اوصاف موجود ہوں۔ چونکہ ایک حقیقی فلاسفر میں یہ چاروں اوصاف موجود ہوتے ہیں اس لیے وہ کاروبار حکومت کے ساتھ ساتھ رعایا کی فلاح و بہبود پر زیادہ توجہ دے سکتا ہے۔ اس کے معاون و رفقا کار بھی چھوٹے درجے کے فلاسفر ہوں گے اور وہ بھی ذاتی اور شخصی جائداد و ملکیت سے آزاد ہونگے۔

افلاطون کا مشہور قول ہے کہ جب تک فلاسفر ریاستوں کے حکمران نہیں ہونگے تب تک معاشرتی یا سماجی برائی کا وجود ختم نہیں ہوگا اور اصل فلاسفر کی نشانی یہ ہے کہ اس کے آتے ہی ریاست کے اندر سماجی برائی کا وجود ختم ہوجاتا ہے۔افلاطون کے خیال میں ایک حقیقی فلاسفر کا کام فلسفے کی تشکیل وترویج ہے۔فلاسفر کے عمل میں غلطی کا قطعی امکان نہیں ہوتا اور فلاسفر حکمران قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔وہ اپنے ذاتی شوق کی خاطر سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا۔یہ اسی وقت ممکن ہے جب جاہل اور نادان لوگ ریاست کی حکومت کا کاروبار درست طور پر نہ چلاسکیں اور عوام کی بھلائی کے قانون بنانے اور ان کی بھلائی کے اسباب پیدا کرنے میں ناکام ہوجائیں اور عوام ایسے جاہل امراء سے تنگ ہوکر فلاسفر کو ریاست کا کاروبار چلانے کے لیے مجبور کریں۔ایک اصلی سیاسی ریاست کے قوانین کی بنیاد عقلی اور اخلاقی استدلال ہے اس لیے اس ریاست کے قوانین صرف ایک فلاسفی بنا سکتا ہے۔حکومت کے اصل انتظامی اختیارات فلاسفروں کے ایک مختصر گروہ کو مناسب طریقے سے سونپے جاسکتے ہیں۔

مقاصد ریاست

افلاطون کے نزدیک ریاست کے وجود میں آنے کی وجہ کو ریاست کے مقاصد میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔فرد کے کردار کی نشوونما صرف ریاست کے شہری ہی کی حیثیت سے ہو سکتی ہے جو فرد کی تربیت کے ساتھ ساتھ اسے ایک اچھے شہری کے کردار میں ڈھالتا ہے۔ انسانی زندگی کا نصب العین نیکی دانائی اور علم کا حصول ہے تاکہ سماجی انصاف کی پہچان ہوسکے اور معاشرے کے افراد کو ایک ریاست کے شہری ہی کی حیثیت سے یہ نصب العین حاصل ہوسکتا ہے۔ ریاست کی حکومت کے دو بنیادی مقاصد ہیں۔اول ریاست کے شہریوں کی تربیت کرنا اور انہیں دانائی اور علم کے زیور سے آراستہ کرنا تاکہ وہ نیکی کے جذبے اور اس کے مفہوم کو سمجھ سکیں اور سماجی انصاف کا اصول ممکن ہوسکے۔دوم ریاست کے عوام کی مادی بھلائی ہے جو صرف اس صورت میں پورا ہوسکتی ہے جب ریاست کی حکومت اپنے پہلے فرض کی ادائیگی میں پوری طرح کامیاب ہوجائے۔

رعایا کے چار طبقات

افلاطون اپنی خیالی ریاست میں تمام لوگوں کو چار طبقات میں تقسیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ریاست کا سب سے اہم طبقہ ریاست کی حکومت ہے اور حکومت کا سب سے اہم حصہ ایک فلاسفر حکمران اور اس کے قریبی معاونین ہیں جسے سرپرست یا محافظ گروہ کا نام دیا گیا اس کے اس طبقہ کو ذاتی جائیداد ادرکھنے یا دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اس سے لوگوں کو ریاست کی طرف سے سالانہ وظیفہ یا تنخواہ ملے گی جوان لوگوں کی سال بھر کی عمومی ضروریات کے لیے کافی ہوگی۔ ان لوگوں کی رہائش اور خوراک بھی ریاست ہی کی طرف سے ملے گی۔ یہ طبقہ ایک ہاسٹل میں مل کر رہے گا اور میس میں اکٹھا کھانا کھائیں گے۔ ان کے فرائض میں ریاست کا روزمرہ کا کاروبار چلانا' عوام کی اخلاقی تربیت' مادی ترقی اور ریاست کی اجتماعی ترقی کے لئے منصوبہ بندی شامل ہوں گے۔ ریاست کی حکومت کے احکامات کی تعمیل اور قوانین کے نفاذ کے لئے سول انتظامیہ ہوگی جو معاون طبقہ (Auxiliaries) ہوگا۔ اس طبقہ میں بھی اقتصادی کمیونزم رائج ہوگا۔ ریاست کے دفاع کے لئے تیسرا طبقہ (warriors) فوج پر مشتمل ہوگا یہ حکومت کے حکم پر پولیس کے فرائض بھی ادا کرے گا۔ اس کے ذمہ ریاست کو بیرونی حملوں سے بچانا اور ریاست کے اندر امن و امان قائم رکھنا ہوگا۔ اس طبقہ کے لئے بھی اقتصادی کمیونزم ضروری ہے۔ ریاست کے چوتھے طبقہ میں ایسے شہری شامل ہیں جن کی ذہنی وجسمانی صلاحیت بہت کم ہے یا وہ ذہنی طور پر کوئی بڑے درجہ کا کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ طبقہ کسانوں اور دوسرے کاریگروں پر مشتمل ہوگا۔ اس طبقہ پر اقتصادی کمیونزم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ بلکہ اس طبقہ کو ذاتی جائیداد اور دولت رکھنے کی اجازت ہوگی۔ ان لوگوں کو اپنے ذاتی مکانوں میں اپنے خاندانوں کے ساتھ رہنے اور اپنی مرضی اور پسند کے مطابق کام کرنے کی مکمل اجازت ہوگی اور یہ لوگ اپنی روزی اور رہائش کے خود ذمہ دار ہوں گے لیکن ریاست کی حکومت ان لوگوں کی بھی پوری سرپرستی کرے گی اور یہ لوگ ریاست کے آزاد شہری ہوں گے۔

ریاست میں تعلیم کی اہمیت

افلاطون نے اپنی خیالیت ریاست کے لئے تعلیمی نصاب 'اقتصادیات' جسمانی ورزشی اور مذہبی رسوم پر مبنی ایک خاص تعلیمی نظام پیش کیا ہے۔ اس تعلیم کے نصاب کے ابتدائی حصے میں دو قسم کے مضامین ہیں اور ابتدائی تعلیم کا یہ حصہ پانچ سال سے بیس سال کی عمر تک کے لئے مخصوص ہے۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج میں ریاست کے تمام شہریوں کو حصہ لینے کے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ تعلیم مفت اور اس کا انتظام کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے پہلے درجے کے لئے موسیقی اور شاعری ذہنی ورزش اور جسمانی نشوونما کے لئے مخصوص ہے دوسرے درجے میں حساب' جیومیٹری اور فلکیات بشمول جغرافیہ کی تعلیم دی جائے گی جو دس سال کے عرصہ پر مشتمل ہوگا۔ کامیاب طلباء کو تیسرے درجے میں خالص فلسفہ اور عقل جدلیات کی تعلیم دی جائے گی تاکہ وہ دنیا کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔ تیسرے درجے میں کامیاب ہونے والے طلباء کو پھر اگلے دس یا پندرہ برس کے لئے حکومت کی گارڈین کلاس کے ماتحت تجربہ حاصل کرنا ہوگا اور اس سخت اور مشکل تعلیمی مرحلے میں کامیاب طلباء بذات خود فلاسفر بن چکے ہوں گے اور مستقبل میں ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے کے قابل ہوں گے۔ افلاطون کے اس نظام تعلیم میں عورتوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔

افلاطون کی خیالی ریاست میں پہلا درجہ پاس کرنے اور دوسرے درجے میں فیل ہونے والے فوج اور سول سروس کے چھوٹے درجے کے ملازمین' دوسرے درجے میں پاس اور تیسرے درجے میں فیل ہونے والے اپنی ذہنی رجحان کے مطابق فوج اور سول سروس کے آفیسر بنتے ہیں' جبکہ تیسرے درجے میں کامیاب ہونے والے حکمران جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ریاست کے چاروں طبقوں میں انسان کی فطری وجسمانی صلاحیتوں کی بنیاد پر درجہ بندی کی گئی ہے۔ ریاست میں حکمران سے عام شہری تک سماجی طور پر ایک حیثیت کے حامل ہیں اور یہ سب ریاست کے عزت دار شہری ہیں اور ریاست کی ترقی کے لئے ہر شہری اپنی ذہنی وجسمانی صلاحیتوں کے مطابق اپنے لئے ایک پیشہ منتخب کرتا ہے۔

ریاست میں نیکی کا مفہوم

افلاطون کے نزدیک نیکی کا مطلب محض نیک ارادہ نہیں بلکہ اس کے لئے کسی شے کے صحیح یا غلط ہونے کا علم بھی ضروری ہے۔ نیکی یا فضیلت علم ہے اور بے علم وجدانی فیصلے بعض اوقات غلط ثابت ہوتے ہیں۔ صحیح راہ عمل کے تعین کا انحصار خود انسان کے اچھائی کے تصور پر ہے اچھائی وہ ہے جس پر صحیح عمل کا انحصار ہو جو دوسروں کو سکھائی جا سکتی ہو اور جو وجدانی نہ ہو۔ مثالیت چونکہ حقیقت ہے اس لئے تبدیل نہیں ہوتی اور اسی وجہ سے مادی دنیا ماورائے کائنات میں موجود مثالی دنیا کا عکس ہے۔ فطرت آزاد وجود نہیں رکھتی بلکہ تخلیق انسانی ذہن کا ایک اسلوب ہے۔ ذہن انسانی حقیقت مطلق تک رسائی کا اہم ذریعہ ہے۔ دلیل پر مبنی علم ہی حقیقی علم ہے۔ اقدار اپنی ہیت میں ابدی اور غیر تغیر پذیر ہیں۔ دنیا کی ہر شے اس حقیقت مطلب کا عکس ہے جس کا تصور ہمارے ذہن میں پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے لہٰذا تصور ہی حقیقت ہے۔

ریاست میں عدالت

افلاطون مثالی مملکت کا تصور پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ممکن کا حقیقی مقصد عدل یا انصاف ہے جس کی بدولت ایک نیک اور مثالی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ عدل ایک اعلیٰ ترین نیکی ہے اور اس کے فروغ کے لئے ضروری ہے کہ مختلف افراد اور طبقوں میں ان کی صلاحیتوں اور ذہنی استعداد کے مطابق فرائض سونپے جائیں اور وہ طبقے یا افراد ان متعین کردہ فرائض کو اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے انجام دیں۔ مثالی مملکت وہی ہو سکتی ہے جس میں اچھائیوں کو فروغ 'انصاف کی تکمیل' کائنات کے ہمہ گیر روحانی نظام کے تحت موجودات کی حقیقت جاننے کی جستجو اور نیکی کے حصول کے لئے عملی جدوجہد ہو۔

راعی اور رعایا کی مماثلت

افلاطون کے نزدیک مملکت اور فرد ایک دوسرے سے مشابہہ ہیں۔ مثالی مملکت کے

تین طبقات انسانی ذہن کے خارجی اظہار کی عکاسی کرتے ہیں خصوصاً اس وقت جب وہ معاشرتی لحاظ سے عمل پیرا ہوں۔ سب سے ابتدائی کردار اشتہا (Appette) ادا کرتا ہے اور اس کا خارجی اظہار معاشی طبقے کی تشکیل کا باعث بنتا ہے۔ انسان کی بہت ساری مادی خواہشات مثلاً غذا' لباس' رہائش وغیرہ فرد واحد پورا نہیں کرسکتا خوراک کے لئے انسان مکان کے لئے معمار اور لباس کے لئے کپڑا بننے والے کا تعاون ضروری ہے۔ اسی طرح مملکت اور معاشرے کے لئے بھی باہمی تعاون ضروری ہے جس سے معاشی ضروریات کے ساتھ ساتھ فرائض کی تخصیص سے مداخلت بے جا کو کم سے کم کیا جاسکتا ہے۔

ریاست میں عسکری نظم وجرات

دوسرا کردار حوصلہ (Spirit) ہے۔ جیسے جیسے انسانی ضروریات بڑھتی گئیں مملکت کے حدود میں توسیع اور دیگر وسائل میں اضافہ کے لئے دوسرے علاقوں کو فتح کرنا ضروری خیال کیا گیا۔ اس کام کے لئے فوجی طبقہ کی ضرورت کو محسوس کیا گیا جو انسانی ذہن کی درجہ بندی کے لحاظ سے خارجی اظہار کے تحت حوصلہ کا حامل ہوتا ہے۔ اس طبقہ میں فطری طور پر مضبوطی' فوجی صلاحیتیں اور حوصلہ و جذبہ ہوتا ہے۔ مدافعاتی کارروائی کے لئے اس طبقہ کی باضابطہ تربیت ضروری ہے۔

ریاست میں علم وعقل کا کردار

عقل (Reason) وحدت کا حامل عنصر ہونے کے باعث مثالی مملکت کی تشکیل میں کلیدی اور لازوال کردار ادا کرتی ہے۔ عقل کی بنیاد پر فرد میں سیکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور علم کی بنیاد پر انسان محبت کرنا سیکھتا ہے۔ فلسفی طبقہ کو عقل کے ان دونوں پہلوؤں کا برملا اظہار کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کو معلوم ہوسکے کہ فلسفی حکمران رعایا پر حاوی نہیں ہیں۔ حکمران صرف مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں اور اصل مقصد مثالی مملکت کا استحکام ہے اور یہ استحکام انسانی ذہن کے خارجی اظہار کے تحت تشکیل پاتے ہیں۔ اس لئے یہ مثالی سیاسی و سماجی نظام سہ طبقاتی نظام کہلاتا ہے۔

ریاست میں انصاف کی تشکیل

افلاطون کے نزدیک انصاف ایک مقصد ہے اور اس کی تکمیل معاشرہ کے لئے فرض کی حیثیت رکھتی ہے۔ انصاف کی تکمیل سے ہی مثالی مملکت کو استحکام حاصل ہوتا ہے اور معاشرے میں بھائی چارہ اور اخوت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ اس کے خیال میں سفالس (Cephalus) کا یہ تصور انصاف کہ ''حقدار کو اس کے حق کے مطابق دیا جائے'' ہر موقع پر قائم نہیں رہ سکتا اس لئے کہ حقدار کو حق دینا ایک (Universal Thought) ہے انصاف نہیں۔ اسی طرح پولی مارکس (Pole marchus) کے اس تصور انصاف کہ ''دوستوں کے ساتھ اچھائی کی جائے ان کو فائدہ پہنچایا جائے اور دشمنوں کو نقصان'' پر تنقید کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ انصاف کا تعلق انسانی روح سے ہے اور وہ ایک داخلی مکمل اور غیر متبدل ہے اس لئے یہ کسی حد تک درست ہے کہ دوستوں کے ساتھ اچھائی کی جائے اور ان کو فائدہ پہنچایا جائے لیکن دشمنوں کے ساتھ دشمنی کرنا اور ان کو نقصان پہنچانا کسی بھی لحاظ سے انصاف نہیں ہوسکتا۔ یہ اس شخص کی کم ظرفی ہے جو دشمن کے ساتھ ظلم یا برائی کرتا ہے دراصل ایسا کرنے سے وہ دشمن کو نقصان نہیں پہنچا رہا ہوتا ہے بلکہ وہ بنیادی طور پر اپنے اوپر ظلم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے کردار کو برا کر رہا ہوتا ہے جس سے کسی کو بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ تھریسے ماکس (Thrasaymacus) کے اس نظریہ انصاف کو کہ ''انصاف طاقتور کا حق ہے کسی بھی برسر اقتدار حکومت کے قوانین اور ضابطوں پر عمل کرنا افراد معاشرہ کے لئے عین فرض کی حیثیت رکھتا ہے'' کی شدید مخالفت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ تصور انصاف جبر پر مبنی ہے اس لئے اس کے ذریعے نہ تو انسانی بہبود اور فلاح کا مقصد پورا ہوسکتا ہے اور نہ ہی اخلاقی زندگی کو مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ اس تصور انصاف سے صرف ایک خاص طبقے کے مفادات کو تقویت پہنچائی گئی ہے۔ اس کے خیال میں حکومت کا قیام اصل مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور یہ اصل مقصد بلاشبہ عوام کا مفاد اور ان کی بہبود اور انہیں بہترین اخلاقی زندگی فراہم کرنا ہے۔

افلاطون کے نزدیک انسانی قدریں اور اخلاق کا تعلق ضمیر سے ہے اور انسانی ضمیر کو

جبر واستعداد اور سزا کے ذریعے کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔اس کے نزدیک انصاف ایک اندرونی قوت ہے جو انسان کے فطری رجحانات سے منسوب ہے۔یہ کہنا کہ حکمران یا حکومت کے قوانین عوام کے مفاد میں ہوتے ہیں اس لئے غلط ہے کہ جس حکمران کے پاس علم نہیں ہوگا وہ معاشرے کے خلاف کوئی بھی حکم دے سکتا ہے اگر شہری اس حکم پر عمل کریں گے تو عوام اور حکومت دونوں کے خلاف کریں گے۔لہٰذا حکمران کے پاس علم کا ہونا بہت ضروری ہے۔افلاطون اپنے سگے بھائی گلاکون (Glaucon) کے اس تصور انصاف کو کہ ''انصاف کمزوروں کا مفاد ہے'' کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔اس کے خیال میں مملکت اور قوانین فطری ہوتے ہیں اور اس تصور انصاف کے اطلاق سے قوانین خارجی ہو جائیں گے۔

افلاطون کا تصور انصاف کی مثالی مملکت کی تشکیل کا بنیادی اصول تخصیص کار میں پنہاں ہے اور اس کے مطابق انصاف اور عدل یہی ہے کہ مختلف افراد اور طبقوں میں ان کی ذہنی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق فرائض تفویض کیے جائیں اور وہ طبقہ یا افراد ان تفویض کردہ فرائض کو اپنے اپنے متعین کردہ دائرہ کار میں رہتے ہوئے سرانجام دیں۔ دوسروں کے فرائض میں مداخلت نہ کرے اور نہ ہی اپنے دائرہ کار سے تجاوز کرے۔اگر ایک فلسفی حکمران اپنے تفویض کردہ فرائض کی انجام دہی دانشمندی سے کرتے ہوئے دوسروں کے فرائض میں مداخلت نہیں کرتا تو وہ انصاف کررہا ہے۔اس طرح ایک سپاہی اپنی ہمت اور بہادری سے مملکت کا دفاع کرتا ہے اور معاشی طبقہ صرف معاشی فرائض سرانجام دیتا ہے اور دوسروں کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتا تو بنیادی طور پر یہ دونوں طبقے بھی انصاف کرتے ہیں۔

دراصل بنیادی طور پر افلاطون کا تصور انصاف عدل خود اختیاری (Autonomy) کا اصول ہے جس کے تحت اس کی مثالی مملکت کا ہر طبقہ دوسرے کی مداخلت سے آزاد ہے۔ اس کے نزدیک انسانی ذہن کا سہ درجاتی تصور ہی انصاف کا تصور ہے۔تمام تر اچھائیوں کا انحصار انصاف ہے اور انصاف کے ذریعے ریاست اور معاشرے میں باہمی تعاون وربط کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔اس کے خیال میں ذہنی استعداد کے اعتبار سے تمام انسان برابر نہیں ہوتے ہیں اس لئے انہیں یکساں فرائض نہیں سونپے جاسکتے۔اس لئے انہیں ذہنی

استعداد اور اس کے خارجی اظہار کے تحت فرائض سونپے جانے چاہئیں تا کہ فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی سرزد نہ ہو۔ اشتہا سے محبت رکھنے والے لوگوں کو معاشی، ذہنی اعتبار سے حوصلہ و جذبہ کے حامل لوگوں کو ملکی دفاع اور عقل و دانش رکھنے والے لوگوں کو عنان حکمرانی کے فرائض سونپے جانے چاہئیں اور ان تینوں طبقوں کو اس بات کا پابند ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اپنے تفویض کردہ فرائض متعینہ دائرہ کار کے اندر اور ایک دوسرے کے فرائض میں مداخلت کئے بغیر سرانجام دیں۔

ریاست کا معاشی نظام

افلاطون کے نزدیک مثالی مملکت کے قیام اور استحکام کے لئے اشتمالیت کا عملی نفاذ ضروری ہے اس کے خیال میں نجی ملکیت اور خاندان معاشرتی انحطاط پذیری اور لور زوال پذیری کے باعث ہیں اور ان دونوں اداروں کو ختم یا محدود کر کے معاشرے کی عمومی اصلاح ممکن ہے۔ نجی ملکیت کو حکمران اور فوجی طبقے کے لئے ممنوع قرار دینا اس کے تصور اشتمالیت کا ایک رخ ہے۔ وہ حکمران اور فوجی دونوں طبقات کے لئے کسی بھی قسم کی نجی ملکیت کو نقدی یا جائیداد دونوں صورتوں میں جائز خیال نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ ان دونوں طبقوں کے لئے مکان، لباس، خوراک، روپیہ، پیسہ سب کچھ معاشی طبقہ فراہم کرے گا۔ اس کی مثالی مملکت میں معاشی طبقے کو نجی ملکیت رکھنے کا حق حاصل ہے۔ اس کے خیال میں مثالی اشیاء کے حصول کے لئے جدوجہد انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ روپیہ پیسہ اور جائیداد کی لالچ انسان کی جبلت اور سرشت میں شامل ہے۔ اس لئے حکمران اور فوجی طبقہ انسانی فطرت کے اس خاصے کے تحت روپیہ پیسہ اور جائیداد بنانے کی لالچ میں مملکتی امور پر توجہ نہ دے سکے جس سے مملکت کے مقاصد اور متعین فرائض کی بجا آوری ممکن نہیں رہے گی۔ مزید اگر تینوں طبقوں کو نجی ملکیت رکھنے کی اجازت دی گئی تو وہ متعینہ فرائض سے غفلت برت سکتے ہیں حالانکہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تینوں طبقات اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر فرائض سرانجام دیں۔

اسی طرح افلاطون کے خیال میں معاشی طبقے کا خاندان ہونا چاہیے تا کہ اس طبقہ کے

مختلف خاندانوں کے افراد مل کر وہ اعلیٰ طبقات حکمران اور فوجیوں کی معاشی اور نفسانی خواہشات پوری کر سکیں۔ وہ کہتا ہے کہ اشتہا کا نمائندہ معاشی طبقہ خاندان رکھ سکتا ہے تاکہ اس طبقہ کی عورتیں حکمران اور فوجی طبقے کی دیگر مادی ضروریات کی طرح جنسی خواہشات بھی پوری کر سکیں۔

افلاطون کا یہ نظریہ ''اشتراک ازواج'' مملکت کے اس مقصد کے حصول کے لئے تھا کہ مملکت کو ایک خاندان کی طرح ہونا چاہیے اور مملکت کے تمام افراد ایک خاندان کے افراد کی طرح مملکت کی سالمیت اور بقاء کے لئے اخلاقی اقدار اور اصول وضوابط کو پس پشت ڈال کر سرگرم عمل ہو جائیں۔ اس کے خیال میں خاندان کا وجود فرد کی ذاتی خواہشات کا نتیجہ ہوتا ہے اور ذاتی خواہشات کی طرح حکمران اور فوجی طبقوں میں خاندن رکھنے کی خواہش ختم ہونی چاہیے۔

پروفیسر بارکر اپنی کتاب Political thought of Plato and Aristotle میں افلاطون کے اس تصورات اشتمالیت کی نفسیاتی 'اخلاقی' سیاسی اور علمی بنیادوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ افلاطون کا یہ تصور دراصل ان نفسیاتی بنیادوں کا نتیجہ ہے جن پر اس نے مثالی مملکت کے تصور کی بنیاد رکھی جن میں مملکت کے انسانی ذہن کی پیداوار اور انسانی ذہن کی استعداد I-Q کے اعتبار سے یکساں نہ ہونا ہے۔ پروفیسر بارکر کے خیال میں افلاطون کا انسانی ذہن کہ مطابق مملکت کے تینوں طبقات کے لیے فرائض کا تعین کرنا' ہر طبقہ کو اپنے دائرہ کار میں متعینہ فرائض کی بجا آوری اور حکمران اور فوجی طبقہ کی نجی جائداد رکھنے کی ممانعت ہے اور یہی بنیادی نقطہ افلاطون کے تصور اشتمالیت کی نفسیاتی بنیاد ہے۔ پروفیسر بارکر اس فلسفہ کی اخلاقی بنیادوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ افلاطون کے اس تصور کا ماخذ اس کا تصور انصاف ہے جس میں وہ واضح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ افراد اور طبقوں میں ان کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فرائض تفویض کرنا اور تفویض کردہ فرائض کو اپنے اپنے دائرہ ہائے کار کے اندر رہتے ہوئے دوسروں کے فرائض میں مداخلت کیے بغیر سرانجام دینا ہی عین انصاف ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ حکمران اور فوجی طبقے معاشی فرائض کے دائرہ کار سے دور رہیں اور معاشی طبقہ ان طبقات کے فرائض میں

مداخلت نہ کرے۔

سیاسی بنیادوں کا ذکر کرتے ہوئے بار کر لکھتا ہے کہ حکمران اور فوجی طبقے کے لیے نجی مملکت اور خاندان ممنوع قرار دینے کا بنیادی مقصد مثالی مملکت کو مستحکم کرنا تھا اور یہی اس کے تصورات اشتمالیت کی بنیاد ہے۔ گارنر اور سیبائن نے بھی بار کر کے اس قول کی تائید کی ہے۔

گارنر کہتا ہے کہ سیاسیات کی ابتدا مملکت سے ہوئی ہے اور اس کی انتہا بھی مملکت ہے۔ سیبائن کے مطابق افلاطون کے پاس اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ بھی مملکت کے خاتمے کا تصور پیش کر کے حکمران اور فوجی طبقے کو دولت سے دور رکھے۔ بار کر اس تصور اشتمالیت کی عملی بنیادوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سب سے پہلی عملی بنیاد یہ ہے کہ افلاطون تعلیم کو مملکت کے کنٹرول میں دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تعلیم کو نجی شعبے کے حوالے کیا گیا تو افراد کی تربیت مملکتی مقاصد اور نصب العین کے مطابق نہیں ہوگی بلکہ وہاں محض نفع کمانے کا رجحان ہوگا۔ جس کی وجہ سے مملکتی مقاصد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ دوسری عملی بنیاد یہ ہے کہ اگر نجی ملکیت اور خاندان کے ادارے کو برقرار رکھا گیا تو حکمران اور فوجی طبقے کی مکمل توجہ مملکتی امور پر مرکوز نہ رہ سکے گی۔ اس کے خیال میں مملکتی امور کی انجام دہی میں مرد اور عورتیں مساوی طور پر کارآمد ہیں اگر خاندان کے ادارے کو برقرار رکھا گیا تو عورتوں کی توجہ زیادہ تر بچوں کی نگہداشت پر مرکوز رہے گی جس کی وجہ سے مملکتی امور کی انجام دہی ممکن نہیں رہے گی۔ اس کے مطابق عورتوں کو بھی مردوں کے شانہ بشانہ مملکتی مقاصد کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل رہنا چاہیے۔

ایک مثال سے ریاست کی وضاحت

کتاب ریاست میں افلاطون ایک مکالمہ کے تحت یوں رقمطراز ہے۔

خدانخواستہ میرا یہ مطلب نہیں۔ میں صرف اتنی درخواست کرتا ہیں کہ آپ زرا اپنی باتوں پر قائم رہیں اور اگر بدلیں تو کھلے کھلے بدلیں تاکہ وہ دوسرے ناحق غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کے جب آپ نے طبیب کی تعریف کی تھی تو اس کے ایک خاص معنی

مقرر کیے تھے۔ لیکن چرواہے کے معاملے میں آپ اس معنیٰ پر قائم نہ رہے۔ اب آپ کے نزدیک ایک حقیقی چرواہا بھیڑوں کے فائدے کے لئے ان کی ورزش نہیں کرتا بلکہ انہیں کسی چٹورے آدمی کا لقمہ تر بننے کے لئے پالتا ہے یا ایک تاجر کی حیثیت سے انہیں بازار میں بیچنے کے لئے موٹا کرتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ چرواہے کا کام بہ حیثیت چرواہے کے صرف اپنے گلے کی فلاح و بہبود ہے۔ اس کا فرض گلے کی ضروریات کو پوری طرح فراہم کر دینا ہے اور اگر وہ یہ تمام ضرورتیں فراہم کر دیں تو یہی اس کے فن کے کمال کی علامت ہے۔ بعینہٖ یہی بات میں حاکموں کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میرے نزدیک حاکم کا اصلی فرض بہ حیثیت حاکم یہ ہے کہ اپنی رعایا کی فلاح کے تمام وسیلے بہم پہنچائے لیکن اس کے خلاف جناب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حاکم اس وجہ سے حاکم بننا اور حاکم رہنا پسند کرتے ہیں کہ ان کو حکومت اور اختیار حاصل ہو۔

حکومت کے مقاصد

کتاب ریاست میں افلاطون ایک مکالمہ کے تحت یوں رقمطراز ہے۔

میں: تو پھر، تھریسی، اس بات میں شبہ کی ذرا گنجائش نہیں کہ حکومت یا فنون کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اغراض کو پورا کر لیں بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ان کا کام اپنے ماتحت کی ضروریات فراہم کرنا ہے ان کا منشاء کمزوری کی حفاظت ہے نہ کہ قوی کی طرف داری۔ اور یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص حکومت کے کام کو از خود ہاتھ میں لینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کسے غرض پڑی ہے کہ بلا معاوضہ ان برائیوں کی اصلاح کے لئے اٹھ کھڑا ہو جن سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ کیونکہ حکومت کا فرض انجام دینے میں اسے اپنی ذاتی غرضوں کو نہیں بلکہ رعایا کے فائدوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ چنانچہ حکومت کرنے کی ترغیب دینے کے لئے اجرت یا معاوضے کے تین طریقے رکھے گئے ہیں۔ اول، مال وزر، دوسرے عزت اور تیسرے انکار کی صورت میں سزا۔

ایک اور جگہ پر مکالمہ کا ملاحظہ ہو

اسی وجہ سے مال وزر یا عزت کے خاطر تو یہ لوگ اس طرح متوجہ ہوتے نہیں۔ نہ مر

بھگوں کی طرح یہ روپے کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اور نہ خزانہ عامرہ سے خفیہ طور پر متمتع ہو کر خائن بننا پسند کرتے ہیں۔ اور نہ انہیں عزت کی زیادہ پروا ہے۔ اس لئے ان کو حکومت کے کام پر لگانے کے لئے بس ایک ہی ذریعہ ہے وہ یہ کہ اس سے گریز کرنے کی صورت میں انہیں سزا کا خوف ہو۔ اور اس سے زیادہ سخت اور کیا سزا ہو سکتی ہے کہ اگر تم خود حکومت میں نہیں آتے تو اپنے سے برے اور نالائق آدمیوں کے محکوم بنو۔ یہی خوف ان قابل لوگوں کو حکومت کے عہدے قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے یعنی انہیں ضرورت مجبور کرتی ہے نہ کے فائدہ اور نفع کی خواہش۔ اس بات کو باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ اگر کسی ملک یا شہر میں سب کے سب لوگ نیک اور ایماندار ہوں تو وہاں سرکاری عہدوں سے الگ رہنے کے لئے اتنا ہی مقابلہ ہو جتنا کہ اس وقت ان کے حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم صاف صورت میں یہ دیکھ لیں کہ حاکم اپنے نفع کے لئے نہیں بلکہ اپنی رعایا کی بہبودی کے لئے حکومت کرتا ہے۔ ان وجوہ کی بنیاد پر میں تھریسی مکس کی تعریف کو غلط سمجھتا ہوں۔ لیکن خیر۔ اب اس بحث کو تو جانے دیجئے۔ ان حضرات نے ابھی ابھی جو بے ایمانی اور ظلم کی زندگی کو ایمانداری اور عدل کی زندگی سے زیادہ فائدہ مند بتلایا تھا اس پر غور کرنا بہت ضروری ہے فرمائیے اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ کس زندگی کو بہتر سمجھتے ہیں؟

ریاست کا اسلوب

کتاب ریاست کے صفحہ نمبر 49-248 پر یوں مکالمات درج ہیں۔

میں۔ افلاطون، اید۔ دوسرا مکالمہ نگار

میں: ہاں، میں دیکھ رہا ہوں کے مجھے اس مشکل بحث میں ڈال کر آپ بڑا؛ مزا لے رہے ہیں۔ لیکن اب میری تمثیل سنئے اس کے بعد میرے تخیل کی تنگی سے آپ اور بھی محظوظ ہوں گے کیونکہ بہترین آدمیوں کے ساتھ اس کی ریاستوں میں جس طرح سلوک ہوتا ہے وہ اس درجہ رنج وہ ہے کہ دنیا میں کوئی اور چیز اس کے مقابلے میں پیش نہیں کی جا سکتی اور اس لئے اگر، میں ان کی طرف سے وکالت کروں تو مجھے افسانے کا سہارا لینا ہوگا اور بہت سی چیزیں ملا کر ایک شکل کھڑی کرنی ہوگی' جیسے بکروں اور بارہ سنگھوں کی خیالی ترکیب تصویروں

میں ملتی ہے۔ اچھا تو ایک بحری بیڑے یا ایک جہاز کا تصور کیجئے جس کا کپتان دوسرے ملاحوں سے مضبوط اور زیادہ قد آور ہے لیکن ذرا اونچا سنتا ہے' اس کی بصارت بھی ذرا کمزور ہے اور فن جہاز رانی میں بھی اس کا علم دوسروں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ ملاح ناخدائی کا حق دار ہے اگر چہ اس نے کبھی جہاز رانی کا فن نہیں سیکھا اور یہ تک نہیں بتا سکتا کہ کب اور کس نے اسے یہ فن سکھایا بلکہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے یعنی دعویٰ کرتا ہے کہ یہ فن سکھایا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کچھ کہے تو یہ لوگ اسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تیار ہیں۔ یہ سب کے سب کپتان کے گرد جمع ہوتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ پتوار ان کے سپرد کر دیا جائے اور اگر کبھی ایسا ہو کہ ان کی بات نہ مانی جائے اور دوسروں کو ان پر ترجیح دی جائے تو یہ ان دوسروں کو مار کر جہاز سے پھینک دیتے' اور پہلے شریف کپتان کے حواس کو شراب یا کسی نشے والی دوا سے مجبوس کر کے یہ لوگ بغاوت کا جھنڈا بلند کرتے ہیں اور جہاز پر قبضہ کر کے سب ذخیروں کو خوب اللے تللے سے اڑاتے ہیں۔ اور اس طرح کھاتے اڑاتے اپنے سفر کو بس اسی طرح جاری رکھتے ہیں جیسی کہ ایسے لوگوں سے توقع ہو سکتی ہے۔ جو کوئی ان کا شریک ہے اور چالاکی سے ان کی اس سازش میں مدد دیتا ہے' کہ یہ جبر یا ترغیب سے جہاز کو کپتان کے ہاتھ سے نکال کر اپنے قابو میں لے آئیں' اسے یہ ملاح' ناخدا' قابل جہاز راں کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں برا بھلا کہتے اور بے کار اور نکما بتلاتے ہیں۔ لیکن ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ حقیقی ناخدا کے لئے (اگر وہ دراصل جہاز پر حکومت کے قابل ہونا چاہے) ضروری ہے کہ موسم' وقت' آسمان کی کیفیت' ستاروں' ہواؤں اور اپنے فن کے دیگر متعلقات کی طرف توجہ کرے' اور خواہ دوسرے لوگ اسے پسند کریں یا نہ کریں اسی کو جہاز کا ناخدا ہونا چاہئے اور وہی ہوگا۔ الغرض اختیار اور ناخدائی کے فن کا یہ اتحاد کبھی ان لوگوں کے خیال میں اچھی طرح داخل نہیں ہوا۔ اب تم ہی سوچو کہ ایک ایسے جہاز میں جو بغاوت کی حالت میں ہے' باغی ملاح سچے ناخدا کے کس نظر سے دیکھیں گے۔ کیا یہ سب اسے خواہ بکواس کرنے والا خیالی پلاؤ پکانے والا اور بے کار اور نکما نہ کہیں گے؟

اید: بے شک۔

میں: غالباً اب آپ کو اس تشبیہ کی مزید تشریح کی ضرورت نہ ہوگی کہ یہ ریاست اور سچے فلسفی کا تعلق بیان کرتی ہے' آپ نے شاید اسے ابھی سے سمجھ لیا ہے۔

ایڈ: جی ہاں۔

میں: اچھا تو اب آپ اس تمثیل کو ان صاحبوں کے پاس لے جایئے جو اس بات پر متعجب تھے کہ شہروں میں فلسفیوں کی کوئی عزت نہیں۔ انہیں یہ اچھی طرح سمجھا دیجئے اور باور کرانے کی کوشش کیجئے کہ ان لوگوں کا شہروں میں معزز ہونا زیادہ معمول کے خلاف اور تعجب خیز ہوتا۔

ایڈ: میں ضرور ایسا کروں گا۔

میں: اس سے کہیئے کہ فلسفے کے دل دادوں کو باقی دنیا کے لئے بے کار سمجھنے میں وہ صحیح ہیں' لیکن انہیں یہ بھی بتلا دیجئے کہ ان کی بے کاری کو ان لوگوں کی غلطی سے منسوب کرنا چاہئے جو ان سے فائدہ نہیں اُٹھاتے نہ کہ خود ان کی ذات سے۔ نہ یہ ہوسکتا ہے کہ ''عقلمند دولتمندوں کے در پر جائیں۔'' اس مقولے کے چالاک مصنف نے ایک جھوٹی بات کہی ہے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی بیمار ہوتا ہے تو چاہے غریب ہو چاہے امیر' اسے طبیب کے پاس جانا ہوتا ہے' اس طرح جو اپنے اوپر حکومت کرانا چاہتا ہے اسے ایسے شخص کے پاس جانا ہوگا جو حکومت کرنے کے قابل ہے۔ جس حاکم میں کچھ بھی خوبی ہے اسے ہرگز اپنی رعایا سے التجا نہ کرنی چاہئے کہ میرے محکوم بنو' اگرچہ نوع انسانی کے موجودہ حکمران ذرا دوسری قسم کے ہیں۔ ان کی مثال تو باغی ملاحوں کی سی ہے اور سچے ناخدا کی مثال ان کی سی جنہیں یہ باغی بے کار نکما اور خیالی پلاؤ پکانے والا کہتے ہیں۔

فلسفی کا ریاست میں کردار

کتاب ریاست میں صفحہ نمبر 263 پر افلاطون کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔

اور یہی بات تھی جو ہم نے پہلے سے دیکھ لی تھی اور یہی وجہ تھی کہ صداقت نے ہمیں بلاخوف وتردّد اس امر کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ شہر' حکومتیں' یا افراد ان سے کوئی اس وقت تک کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک فلسفیوں کا وہ چھوٹا سا گروہ جسے ہم نے بے کار کہا ہے لیکن

جو بگڑے نہیں ہیں اسے خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے ریاست کی خبر گیری پر من جانب اللہ مامور نہ کیا جائے۔ اور اسی طرح ریاست پر ان کی اطاعت لازم نہ کر دی جائے' یا پھر یہ ہو کہ بادشاہوں اور شہزادوں کی اولاد کے دل میں خدا کی طرف سے حقیقی فلسفے کی سچی محبت پیدا کر دی جائے۔ میں یہ کہنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ ان دو صورتوں میں سے کوئی ایک یا دونوں ناممکن ہیں' اگر ایسا ہوتا تو لوگ بے شک ہمیں تخیل پرست یا خیالی پلاؤ پکانے والا کہہ کر ہماری ہنسی اڑا سکتے تھے' کیوں میں صحیح کہتا ہوں نا؟

مذکورہ کتاب میں ایک اور جگہ صفحہ نمبر 289 پر افلاطون کہتا ہے

گلا کن' ادھر دیکھو۔ ہم اگر اپنے فلسفیوں کو دوسروں کی نگرانی اور پرورش کرنے پر مجبور کریں تو اس میں کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔ ہم انہیں سمجھا دیں گے کہ دوسری ریاستوں میں ان کے طبقے کے لوگ سیاست کی مشقت میں حصہ لینے پر مجبور نہیں کیے جاتے۔ اور یہ بات ہے بھی معقول' کیونکہ یہ لوگ خود من مانی مرضی سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ ریاست تو ان کے نہ ہونے کو شاید زیادہ پسند کرتی۔ چونکہ یہ اپنی تعلیم آپ کرتے ہیں اس لئے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس تعلیم کے لئے احسان مندی کا اظہار کریں جو انہیں کبھی ملی ہی نہیں لیکن تمہیں تو ہم نے دنیا میں اس چھتے کے حکمران بننے کے لئے پیدا کیا ہے' یعنی خود اپنے بادشاہ ہونے کے لئے اور نیز دوسرے شہریوں کے لئے۔ ان سے کہیں بہتر اور کامل تر تعلیم ہم نے تمہیں دی ہے اور تم ان سے زیادہ اس دوہرے فرض میں حصہ لینے کے لائق ہو۔ اس لئے تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ جب اس کی باری آئے تو وہ عام زمین دوز مسکن میں نیچے جائے اور تاریکی میں دیکھنے کی عادت ڈالے۔ جب تم یہ عادت ڈال لو گے تو تم غار کے باسیوں سے دس ہزار گنا بہتر دیکھ سکو گے۔ تم جانو گے کہ یہ مختلف صورتیں کیا ہیں اور کاہے کی نمائندگی کرتی ہیں کیوں کہ تم نے حسن' عدل اور خیر کو ان کی سچی صورت میں دیکھا ہے۔ اس طرح ہماری ریاست' جو تمہاری ریاست بھی ہے' ایک حقیقت ہوگی نہ کہ محض ایک خواب' اور اس کا نظام ان دوسری ریاستوں سے بالکل الگ انداز پر ہوگا جن میں انسان خالی سایوں کے متعلق ایک دوسرے سے لڑتے اور طاقت اور اقتدار کی کشمکش میں' جو ان کی نظر میں ایک تعلیم ہے' اپنے کو منتشر اور پراگندہ رکھتے ہیں۔

راعی اور رعایا کا تعلق

کتاب ریاست کے صفحہ 338 پر افلاطون کا مکالمہ درج ہے کہ رائج صورت حال تو یہ ہے۔اور حکمران اور رعایا اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہی ہیں' کبھی سفر میں' کبھی کسی اور باہم ملنے کے موقع پر' کسی جاترا پر یا جنگ کے کوچ میں' ساتھ ہی سپاہی یا ملاح کی حیثیت سے۔اچھا اور خطرے کے موقع پر ہی یہ ایک دوسرے کا رویہ بھی دیکھ لیتے ہیں' کیونکہ جہاں خطرہ ہے وہاں اس کا کوئی ڈر نہیں کہ مالدار غریبوں کی تحقیر کریں۔بہت ممکن ہے کہ دھوپ کا تپا ہوا مضبوط آدمی جنگ میں ایک ایسے مالدار آدمی کے دوش بدوش ہو جس نے کبھی اپنا رنگ نہیں خراب ہونے دیا اور جس کے پاس فاضل گوشت کی بھی افراط ہے۔اچھا غریب اسے ہانپتا کانپتا اور بدحواس دیکھے گا تو بھلا کیسے اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ لوگ مالدار بس اس وجہ سے ہیں کہ کسی دوسرے میں ان کے لوٹنے کی ہمت نہیں؟ پھر جب یہ اپنے طور پر باہم ملیں گے تو کیا ایک دوسرے سے یہ نہ کہیں گے کہ ''ہمارے یہ جنگ آزما تو بس یوں ہی سے ہیں۔''

افلاطون کا فلسفہ تعلیم

ریاست میں تعلیم کی ضرورت

افلاطون نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''الجمہوریہ'' میں اگرچہ تعلیم سے متعلق کوئی باضابطہ نظریہ پیش نہیں کیا لیکن اس کتاب میں دیئے گئے تعلیمی تصورات سے ایک باضابطہ نظریہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک نظام تعلیم بذات خود اصل مقصد نہیں بلکہ اصل مقصد کے حصول کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس کے خیال میں مثالی مملکت انسانی ذہن کی مظہر ہے اس لیے انسانی ذہن کو مثالی مملکت کے اعلیٰ معیار تک لانے کے لئے افراد کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جانا ضروری ہے۔ تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ناقص معاشرے کو نئے سرے سے نئی بنیاد پر تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ جب انسانی اصلاح کے دوسرے تمام ذرائع ناکام ہو جاتے ہیں تو مناسب وقت پر دی جانے والی تعلیم ہی اُمید کی آخری کرن ہوتی ہے۔

تعلیم ذہن کی تربیت کرتی ہے

افلاطون کے نزدیک انصاف یا عدل انسانی ذہن کی ایک صفت ہے اور انصاف کے نفاذ کے لئے انسانی ذہن کی تربیت ضروری ہے جس کا بہترین ذریعہ تعلیم ہے۔ تعلیم کا مقصد خود آگاہی ہے اس کے لیے دوران تعلیم روح کی شکل پذیرائی کا اہتمام ضروری ہے۔ اصل تعلیم پچاس سال کے بعد شروع ہوتی ہے کیونکہ اس عمر میں انسان کی عمر پختگی کے دور میں شامل ہو جاتی ہے۔ تعلیم فرد کی روح اور ذہن کو جلا بخشتی ہے جس سے وہ خیر اور شر، نیکی اور بدی، اچھے اور برے کی تمیز کر سکتا ہے اور وہ اخلاقی اعتبار سے خود کفیل ہو جاتا ہے۔

یونان میں نظام تعلیم

افلاطون کا تعلیمی فلسفہ دراصل ایتھنز کے نظام تعلیم کی اصلاح وترمیم شدہ صورت تھی خصوصاً اس کا ابتدائی تعلیم کا سارا نظام ایتھنز اور سپارٹا کے طریقہ ہائے تعلیم کی اصلاح یافتہ صورت تھی۔ اس وقت ایتھنز اور سپارٹا کے طریقہ تعلیم مختلف تھے اور ان مختلف حالات و ماحول کے پابند تھے جس کے زیر اثر یہ دونوں ریاستیں زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ایتھنز میں تعلیم ذاتی مسئلہ تھی اور ریاست سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہ تھا۔ مکاتیب کا ہونا ذاتی معاملہ تھا اور لوگ تعلیم اپنی اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرتے تھے۔ لڑکیوں کو صرف گھریلو قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم 6 سال سے 14 سال تک اور ثانوی تعلیم 14 سال سے 18 سال تک دی جاتی ہے۔ بعد ازاں دو سال کے لئے فوجی تربیت دی جاتی تھی اور اسی حصہ سے ریاست کا تعلق ہوتا تھا، ابتدائی تعلیم کے نصاب میں جمناسٹک اور فن موسیقی شامل تھا۔ ثانوی تعلیم کے لئے طلباء کو فیس ادا کرنی پڑتی تھی۔ یہ تعلیم بڑی مہنگی تھی اور صرف امراء حاصل کرتے تھے۔ ایتھنز کا تعلیمی نظام صرف خاندان تک محدود تھا اور اس کا دراصل مقصد جسمانی نشوونما، وافر ذہنی قوت اور بے عیب ذوق کا حصول تھا۔

دوسری جانب سپارٹا کا نظام تعلیم مکمل طور پر ریاست کے کنٹرول میں تھا۔ اس نظام کے تحت لڑکے کو ساتھ سال کی عمر میں والدین سے لے کر ریاست کے تحت کر دیا جاتا تھا۔ والدین کو تعلیم دلوانے سے کوئی غرض نہ تھی یہ سب کچھ ریاست کرتی تھی، طالب علم مکانوں یا بورڈنگ ہاؤسز میں رہتے تھے اور ان کی قدیم پبلک سکولوں کی طرز پر تربیت کی جاتی تھی انہیں جنگ کے طریقوں سے روشناس کروا دیا جاتا تھا۔ انہیں بار بار آزمائشی تجربوں اور امتحانات سے گزارا جاتا تھا۔ اس طرح جنگجو تیار کیے جاتے تھے۔ سپارٹا میں عام تعلیم کے نصاب میں جمناسٹک، فن موسیقی اور رزمی رقص شامل تھے۔ امیر، غریب میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ جرات وحوصلہ، نظم وضبط اور قوت برداشت کے عنصر کی افزائش کی جاتی تھی لیکن اس نظام میں دانائی کے عنصر کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ لڑکے اور لڑکیوں کو برابر تعلیم دی جاتی تھی اور وہاں تعلیم کا مقصد نوجوانوں کو فوجی تربیت سے آراستہ کرنا

تھا۔افلاطون سپارٹا کے نظام تعلیم سے متاثر تھا۔

ریاست تعلیم کی ذمہ دار

افلاطون کے نزدیک تعلیمی نظام کا ریاستی کنٹرول میں ہونا ضروری ہے جس کا بنیادی فائدہ یہ ہوگا کہ مملکت اپنی ضرورت کے مطابق تعلیم یافتہ اور ہنر مند افراد پیدا کرے گی۔اس کے خیال میں تعلیم حاصل کرنا یا نہ کرنا افراد کی اپنی مرضی پر منحصر نہیں ہونا چاہیے بلکہ افراد کو لازمی طور پر By force تعلیم دی جانی چاہیے۔وہ مملکت کو تین طبقات غلام،فوجی اور فلسفی حکمران میں تقسیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تینوں طبقات کے لیے الگ الگ اور ان کی ذہنی سطح جس کی بدولت وہ معاشرہ میں اپنے مقام کا تعین کرتے ہیں کوملحوظ خاطر رکھ کرنصاب کا تعین کرنا چاہیے۔کیونکہ مثالی مملکت کے حکمران تعلیم کے ذریعے ہی انصاف کی روح کو سمجھ سکتے ہیں اور جب یہ طبقات انصاف کی روح کو سمجھیں گی تب ہی مثالی مملکت کا قیام عملاً ممکن ہوگا۔

مرد عورت دونوں کے لیے تعلیم ضروری

مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں تعلیم ہونی چاہیے کیونکہ جس طرح ایک کتا نگرانی کے فرائض انجام دیتا ہے بالکل اسی طرح ایک کتیا بھی نگرانی کے فرائض سرانجام دے سکتی ہے۔اسی طرح اگر ایک مرد نگرانی کے فرائض انجام دے سکتا ہے تو ایک عورت بھی نگرانی کے فرائض سرانجام دے سکتی ہے۔مملکت کی پچاس فیصد آبادی عورتوں پر مشتمل ہوتی ہے اگر انہیں صرف امور خانہ داری پر لگا دیا جائے صرف بچے پیدا کرنے کے لئے مخصوص کر دیا جائے یا اگر مرد انہیں اپنے لئے جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھیں تو مملکتی امور یقیناً متاثر ہوں گے۔

تعلیمی مدارج

افلاطون نے اپنے نظام تعلیم کو چار مختلف مدارج ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم

اور اعلیٰ ترین تعلیم میں تقسیم کرتے ہوئے ان کے لئے مثالی مملکت کے مقاصد کے لحاظ سے الگ الگ نصاب کا تعین کیا۔

(1) ابتدائی تعلیم

اس کے خیال میں ابتدائی تعلیم پیدائش سے لے کر سات سال کی عمر تک گھر پر ہی دی جانی چاہیے اور بچے کی ذہنی نشوونما کے لئے انہیں اس عرصہ کے دوران اعلیٰ اخلاقیات کی حامل کہانیاں سنانے کے ساتھ ساتھ دیوتاؤں کے بارے میں بتایا جائے تاکہ بچپن سے ہی بچوں کا ذہنی اعلیٰ اخلاقی اقدار اور مذہب سے واقف ہو سکے اور بڑے ہو کر دیوتاؤں کی پرستش اور اعلیٰ اخلاقی کردار کا مظاہرہ کر سکیں۔

اس کے نزدیک بچوں کی دینیات میں یہ تعلیم نہیں ہونی چاہیے کہ جو کچھ کرتا ہے وہ خدا ہی کرتا ہے ان کو یہ بتانا چاہیے کہ خدا فقط اچھی باتیں کرتا ہے، شر کو بھی خدا کی طرف منسوب کرنا بڑا ظلم ہے۔ ان کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ خدا جسے جیسا چاہتا ہے بنا دیتا ہے، کسی کو جہنم کے لئے بناتا ہے اور کسی کو جنت کے لئے۔ جب وہ کسی کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو پہلے اسے گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے پہلا اصول یہ ہے کہ خدا کو خیر مطلق کے طور پر پیش کیا جائے۔ دوسرا اصول خدا کے بارے میں یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی فطرت نہیں بدلتا۔ خدا میں سب صفات حسنہ کا کمال ہے۔ اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں، خدا صداقت مطلقہ ہے اور صداقت مطلقہ میں کوئی تغیر ممکن نہیں۔

(2) ثانوی تعلیم

ثانوی تعلیم سات سال کی عمر سے اٹھارہ سال تک دی جانی چاہیے۔ چونکہ ایک صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ پرورش پاتا ہے اس لئے اس عرصہ کے دوران جسمانی تربیت کو فوقیت دی جانی چاہیے۔ وہ اس ثانوی سطح کے لئے اپنے نصاب میں جمناسٹک اور موسیقی کو شامل کرتے ہوئے وضاحت کرتا ہے کہ جمناسٹک ایک صحت مند جسم کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اس لئے اس مرحلے میں اس کی اہمیت مسلمہ ہے اور پھر ایک صحت مند آدمی کو

حکیم یا دواؤں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ایک صحت مند جسم میں ہی ایک صحت مند ذہن پرورش پا سکتا ہے۔ جمناسٹک میں خوراک دوا اور جسمانی ورزش تینوں شامل ہیں۔ اس عرصہ تعلیم میں طبعی سائنس کے مطالعہ سے تدبر اور اچھائی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک موسیقی میں ادب اور فن بھی شامل ہے جو مملکت کے اخلاقی مقاصد کی تکمیل میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مقصد ذہن کی براہ راست تربیت کرنا، جذبات کی اصلاح کر کے متوازن بنانا اور قوت استدلال کو صورت اظہار بخشنا ہے۔ موسیقی فرد کی روح کو ایسے ماحول سے روشناس کرواتی ہے جس کی بدولت وہ پیش آنے والے مسائل کو اپنی طرز پر حل کر سکتا ہے لہٰذا موسیقی کے اخلاقی پیغام کو برقرار رکھنے کے لئے بے حد ضروری ہے کہ اسے حکومت کے زیر انتظام رکھا جائے۔ موسیقی کو خاص احتیاط سے موزوں کرنا چاہیے کیونکہ موسیقی کی تربیت دوسرے ہر تربیتی ذریعے سے زیادہ طاقتور ہے۔

افلاطون کے نزدیک جمناسٹک اور موسیقی دونوں کا مقصد فرد کے کردار کی تشکیل کرنا ہے۔ جمناسٹک خود ضابطگی اور دوسری انسانی اقدار کا سبق سکھاتی ہے جبکہ موسیقی میں شاعری کا مطالعہ اور دیگر اصناف، گانا اور موسیقی بجانا شامل ہے۔ لہٰذا کردار کے خلاف جانے والے ادب اور موسیقی سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ان دونوں پر حکومت کی سخت نگرانی ہو۔

افلاطون کے نظام تعلیم میں ثانوی تعلیم کا سلسلہ اٹھارہ سال کی عمر تک رہتا ہے۔ جانچ کے بعد جو طلباء فیل ہوں گے انہیں نچلی سطح کے فرائض سونپے جائیں گے جبکہ کامیاب طلباء کو مزید دو سال کی تربیت دی جائے گی اور اس دو سالہ تعلیم میں زیادہ تر ریاضی اور عملی تربیت پر زور دیا جائے گا۔ افلاطون کے خیال میں ریاضی کے علم کا نظری اور علمی دونوں پہلوؤں سے جاننا ضروری ہے۔ یہ علم نظری طور پر انسان کی سچائی تک رہنمائی کرتا ہے اور عملی طور پر میدان جنگ میں فوجیوں کو منظم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

(3) اعلیٰ تعلیم

افلاطون کے زمانہ میں ایتھنز میں اعلیٰ تعلیم کا ایک اور نصاب سوفسطائی معلم جاری

رکھے ہوئے تھے جس میں اٹھارہ برس کے بعد نوجوانوں کو خطابت اور سیاست کا درس دیا جاتا تھا۔ افلاطون نے اس نظام کو یکسر تبدیل کر دیا۔ بیس سال کی عمر میں پھر امتحان ہوگا اس امتحان میں جسمانی طور پر مضبوط توانا طالب علم جن میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہوگی کو فوجی فرائض سونپے جائیں گے اور جن میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہوگی انہیں مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے منتخب کیا جائے گا۔

سیبائن کہتا ہے کہ افلاطون کا اعلیٰ تعلیم کا نظام منفرد اور مخصوص ہے اس نظام کے تحت مختلف طلباء کو 20 سے 35 سال کی عمر تک محافظ طبقہ کی کلیدی آسامیوں کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا نظریہ افلاطون کا ذاتی اور بالکل اچھوتا نظریہ ہے۔ اس مرحلے کے نصاب میں علم ریاضی، علم طب، علم نجوم، مابعد الطبیعات اور فلسفہ کی تعلیم ضروری ہوگی۔ فلسفہ اور مابعد الطبیعات کے علوم فرد کے لئے سکون قلب کا باعث ہوتے ہیں اور بالخصوص مابعد الطبیعات کی تعلیم سے فرد کے اندر مراقبہ کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ یہ تعلیم 35 سال تک دی جائے گی جس میں 30 سال تک ریاضی اور علم نجوم پر زور دیا جائے گا۔

(4) اعلیٰ ترین تعلیم

30 سے 35 سال تک طب، مابعد الطبیعات، اخلاقیات اور فلسفہ کی تعلیم دی جائے گی۔ 35 سال کی عمر میں پھر امتحان ہوگا جو لوگ اس امتحان میں کامیاب ہوں گے ان کو مزید تعلیم کے لئے منتخب کیا جائے گا اور جو لوگ اس امتحان میں ناکام ہوں گے انہیں وکیل، مجسٹریٹ اور حکومت کے دیگر انتظامی عہدوں پر فائز کیا جا سکتا ہے۔

کامیاب ہونے والے لوگ اعلیٰ تعلیم کے اہل ہوں گے اور یہ لوگ فلسفی کہلائیں گے جن کو پچاس سال کی عمر تک مزید 15 سال تعلیم دی جائے گی۔ اس مرحلے میں خالص فلسفہ اور منطق پڑھایا جائے گا۔ یہ لوگ فلسفی کہلائیں گے اور پچاس سال کی عمر کے بعد انہیں عنان حکومت دی جائے گی اور یہ مثالی مملکت کا اعلیٰ ترین طبقہ کہلائیں گے۔ افلاطون کے خیال میں صرف فلسفی ہی حقیقت اور سچائی کو پہچان سکتے ہیں اس لئے وہی لوگ حکومت کی اہم ذمہ داریاں سنبھال سکتے ہیں اور انصاف جو مثالی مملکت کا نصب العین ہے کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

افلاطون کے متذکرہ نظام تعلیم میں پہلے دو مرحلوں میں اسپارٹا اور ایتھنز کے مروجہ تعلیمی نظام کی چھاپ نظر آتی ہے لیکن اعلیٰ تر تعلیم میں ریاضی، فلسفہ اور مابعد الطبیعات کی تعلیم پر زور دینا جدت پسندی اور نیا پن تھا اور اسی باعث اس نے عملی طور پر اپنی اکادمی قائم کر کے ان مضامین کی تعلیم کا باضابطہ سلسلہ شروع کیا۔

مختلف مفکرین نے افلاطون کے اس نظام تعلیم پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نظام غیر جمہوری اور طبقاتی نظام تعلیم ہے اور اس نظام تعلیم سے لوگوں میں جذبہ حب الوطنی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس نے مخصوص طبقات کے لئے تعلیم کو ضروری قرار دیتے ہوئے معاشی طبقہ کو کافی حد تک نظر انداز کیا ہے۔ مزید اس کا یہ نظام تعلیم خیالی دنیا میں مگن رہنے کا جذبہ تو پیدا کر سکتا ہے مگر عملاً ایسا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر اس نظام تعلیم پر غور کیا جائے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ افلاطون کے تصورات میں ''انصاف'' ایک مرکزی تصور ہے جو اس کے تمام تصورات کا محور ہے۔ اس کے نظریہ انصاف میں مثالی مملکت کا ہر طبقہ اپنے اپنے مقرر کردہ فرائض انجام دیتا ہے اور دوسروں کے وظائف میں مداخلت نہیں کرتا اور افلاطون اس نظام تعلیم کے ذریعے اس اصل یعنی انصاف کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔

تعلیم کی اہمیت

افلاطون اپنی تصنیف ''ریاست'' میں تعلیم کے بارے میں یوں لکھتا ہے۔

اگر عدل کی ماہیت وہی ہے جو افلاطون نے بتائی ہے تو ظاہر ہے کہ جماعت کے اہم ترین فرائض میں سے تعلیم ہے جو مختلف طبقوں کے لوگوں کو اپنے مخصوص وظائف کے پورا کرنے کے قابل بنا سکے۔ چنانچہ افلاطون نے کتاب ''ریاست'' کا معتدبہ حصہ ایک نظام تعلیم کے میں بیان صرف کیا ہے۔

افلاطون سے پہلے بھی عام طور پر یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانا جاتا تھا۔ یعنی ایسی جمعیت جو ایک مشترکہ متاع روحانی و اخلاقی وصف کی مالک ہو۔ اس لئے ریاست کے فرائض لازمی میں سے یہ تھا کہ وہ اس مشترکہ متاع روحانی میں اپنے سب اراکین کو حصہ دار بنانے کا اہتمام کرے یعنی اپنے کو ایک تعلیمی ادارہ بنا دے جس میں رہ کر

ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترکہ متاع روحانی کے ذریعے دوسرے افراد سے رشتہ اتحاد پیدا کرے۔ اس متاع مشترکہ سے مراد وہ لکھے اور بے لکھے قوانین تھے جن پر عمل پیرا ہونا جماعت کی فلاح اور حسن اخلاق کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔

افلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے۔ وہ بھی مانتا ہے کہ ریاست میں حکومت کا کام تعلیم ہے اور تعلیم کا کام افراد کو جمعیت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور انہیں جسم سیاسی کا صحیح عضو بنانا۔ البتہ افلاطون کے نزدیک اس اجتماعی پہلو کے علاوہ تعلیم فی نفسہ بھی ایک قدر ہے۔ اس کا ایک انفرادی اور شخصی پہلو بھی ہے یعنی حق مطلق، غیر مطلق کا ادراک۔ اس انفرادی حیثیت سے تو افلاطون کا تصور تعلیم یونانی خصوصاً سوفسطائی تصورات سے مختلف ہے ہی جو تعلیم کو محض اجتماعی کامیابی کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ لیکن اجتماعی حیثیت سے بھی افلاطون اس کا ہمنوا نہیں ہے اس لئے کہ وہ اجتماعی کامیابی کی جگہ اجتماعی عدل کے حصول کو تعلیم کا مقصد بتاتا ہے۔

تعلیم کو اجتماعی اور انفرادی دونوں حیثیتیں دے کر افلاطون نے دراصل یونان کے دو اہم ترین مذاہب تعلیمی کو یکجا ہونے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے ایک تو خود افلاطون کے شہر اثینہ کا مذہب تھا جسے مختصراً ''مذہب انفرادیت'' کہہ سکتے ہیں۔ یہاں حکومت کو تعلیم سے سروکار نہ تھا۔ شہری خود اپنا انتظام کرتے تھے۔ معمولاً ابتدائی تعلیم میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ کچھ شعر و موسیقی کی تعلیم ہوتی اور کچھ ورزش جسمانی کی۔ جو لوگ اس سے زیادہ تعلیم کے خواہاں ہوتے وہ سوفسطائی معلموں کے ہاں دام دے دے کر سیاست اور خطابت کے فنون سیکھتے۔ اس کے بعد 18 سے 20 سال کی عمر تک حکومت سب شہریوں کو فوجی تعلیم دیتی تھی۔ تعلیم کا بڑا حصہ خاندان کے ذمے تھا۔ افلاطون کے نزدیک اثینہ میں جاہل اور نادان لوگوں کے برسر اقتدار ہونے کی ذمہ داری میں اس تعلیمی آزادی کے سر تھی۔ دوسرا مذہب تعلیمی اسپارٹا کا تھا۔ یہاں بچہ 7 سال کی عمر میں اپنے والدین سے جدا کر لیا جاتا۔ علیحدہ مکانوں میں سرکاری نگرانوں کے زیر نظر اس کی پرورش ہوتی اور اس کی تعلیم کا بیشتر حصہ جسمانی ورزش اور فوجی تربیت پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہاں خاندان کو تعلیم میں کوئی دخل نہ تھا جو کچھ کرتی حکومت کرتی اور افراد کو اپنے فوجی اغراض کے لئے بطور سپاہیوں کے تیار کرتی تھی۔

افلاطون کو اسپارٹا کا طریقہ زیادہ بھایا اس لئے کہ فرد جماعت کے باہمی تعلق کا تصور یہاں افلاطون کے نظریے سے زیادہ مطابق تھا۔ اس کے نزدیک بھی فرد کی حیثیت جماعت کے ایک جزو اور خادم کی تھی اور اسپارٹا کے نظام میں بھی۔ لیکن افلاطون کا پھر اثینہ کا خوش مذاق اور وسیع النظر شہری تھا۔ ادب اور موسیقی سے سیرت کی جو تربیت اور تہذیب ہوتی ہے اس سے افلاطون سے زیادہ اور کون آشنا ہوسکتا تھا۔ یہ بھلا اپنی ریاست میں لوگوں کو محض اکھڑ سپاہی بنانے پر کیسے قناعت کر لیتا۔ وہ سمجھ گیا کہ اسپارٹا کے نظام تعلیم کا مرکزی خیال اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کے عمل میں بہت تنگی ہے جس سے سیرت انسانی کا بس ایک عنصر یعنی عنصر جری نشو و نما پاتا ہے اور دوسرے عناصر بالکل نہیں پنپنے پاتے۔ چنانچہ افلاطون نے اپنے نظام تعلیم میں اسپارٹا اور اثینہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کر دیا۔ اثینہ کے شہری کی حیثیت سے اس نے تعلیم میں سیرت انسانی کے تمام عناصر ترکیبی کے نشو و نما کی سبیل کی۔ بہ حیثیت اسپارٹا کے معتقد کے اس نے کامل انسان کو جماعت کا خادم بنایا اور اس کی تعلیم کو کلیتہً ''حکومت'' کے سپرد کر دیا۔

''ریاست'' میں جو نظام تعلیم بہ تفصیل پیش کیا گیا ہے وہ جنگ آزماؤں اور حکمرانوں کے لئے ہے۔ تیسرے یعنی دولت آفرین طبقے کی تعلیم کا ذکر نہیں ہے۔ اس نظام میں تعلیم کے دو حصے کر دیئے گئے ہیں۔ پہلے حصے کی تعلیم تمام جنگ آزماؤں کے لئے ہے اور اس کا لڑکپن اور شباب کا زمانہ ہے۔ دوسرا حصہ صرف حکمرانوں کے لئے ہے اور اس کا زمانہ شباب سے کہولت کی عمر تک رہتا ہے۔ پہلے حصے کی تعلیم کا مقصد ہے شہریوں کو ریاست کے تحفظ کے لئے بطور سپاہی کے تیار کرنا۔ دوسرے کا مقصد ہے ان میں سے چند کو ''کامل محافظت'' یا حکمرانی کا اہل بنایا جائے۔ پہلے میں جذبات کی تہذیب' سیرت کی تربیت' پیش نظر ہے۔ دوسرے میں فلسفہ وحکومت کی معرفت' عقل وخرد کی تعلیم۔ پہلے حصے میں تمام تر اجتماعی اغراض پیش نظر ہیں' دوسرے میں' بالکل نہ سہی' پھر بھی بہت کچھ انفرادی تکمیل۔

پہلے حصے کا انصاب جو 18 سال تک کی عمر تک کے لئے ہے دو اجزا پر مشتمل ہے' ورزش اور موسیقی۔ لیکن دونوں لفظ ذرا وسیع معنیٰ میں استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً ورزش میں صحیح غذا اور علاج بھی شامل ہے اور موسیقی میں ادب اور فنون لطیفہ۔ افلاطون چاہتا ہے کہ

ورزش اور موسیقی کے دوگونہ عمل سے سیرت انسانی کی ہم آہنگ نشوونما کا کام لے۔ اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ورزش سے جسم اور موسیقی سے ذہن کی تربیت مقصود ہوگی۔ مگر دراصل جسم کی تربیت بھی ذہن اور روح ہی کی خاطر ہے کہ اس سے جرات و پامردی کی صفتیں پیدا ہوں' طبیعت کے عنصر جری کی صحیح نشوونما ہو جو نوجوانوں کو اچھا سپاہی اور بہادر جنگ آزما بنائے اور ریاست کا اچھا اور سچا خادم۔ موسیقی سے اس عنصر جری کو حدود مناسب میں رکھنا اور عقل کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا مطلوب ہے۔ اس سے ہر چند علم کا حصول ممکن نہیں تاہم صحیح "رائے" کا پیدا کرنا ممکن ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ روح کو جو ابھی جذبات کی منزل سے گزر رہی ہے اس بات کا عادی بنا دیا جائے کہ وہ حل طلب مسائل کے متعلق صحیح احساس رکھے اور جب یہ احساس بطور عادت کے راسخ ہو جائے تو روح صحیح راہ عمل اختیار کرے۔ یہ جانے بغیر کہ اس عمل کی وجہ یا علت کیا ہے۔ موسیقی' ادب اور فنون لطیفہ کو نصاب کا جزو بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ ان کے دل کشی خود بخود نوجوان روحوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ شعر کے وزن اور بحر سے' جنگ و رباب کی سامعہ نوازی سے' حسین مجسموں کے حسن صورت اور دلفریبی الوان سے' روح آپ ہی آپ متاثر ہوتی ہے اور اس طرح ان کی اخلاقی تعلیم کو بے جانے بوجھے قبول کرتی جاتی ہے۔

افلاطون فنون لطیفہ کی اس تاثیر کو اخلاقی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موسیقی' شعر اور صورت تراشی کے ہر طرز کو نوجوان کی تعلیم کا جز نہیں بننے دیتا بلکہ صرف ان طرزوں کو جن سے روح کی صحیح اخلاقی تربیت ہو سکے۔ چنانچہ "ریاست" میں نظام تعلیم کے ساتھ ادبیات اور موسیقی کے احتساب کا بھی ایک مکمل پروگرام پیش کیا گیا ہے۔ ادب کی اصلاح میں صحیح جواب سے کوئی غلط بات کہہ دوں؟ ایسی صورت میں آپ کیا فرمائیں گے؟

ت: آپ تو ایسے پوچھ رہے ہیں گویا یہ دونوں صورتیں ایک سی ہیں۔

(افلاطون) میں: کیا اس میں بھی کوئی شبہ ہے؟ اور اگر بفرض محال میں تسلیم بھی کرلوں کہ یہ یکسانیت حقیقی نہیں بلکہ صرف ظاہری ہے تو آپ کیا یہ بیجا بات نہیں کہ آپ ایک شخص کو اپنے اصلی خیالات کے اظہار سے منع کرتے ہیں۔

ت: کہئے تو، آخر آپ نے کیا ارادہ کیا ہے؟ شاید جناب انہیں منع کئے ہوئے جوابوں میں سے کوئی جواب دینا چاہتے ہیں!

میں: کیا عجب ہے! ممکن ہے غور کرنے کے بعد میں ایسا ہی کروں۔

ت: اور اگر میں ان سب سے بہتر جواب پیش کروں تو پھر آپ کی کیا سزا ہوگی؟

میں: سزا؟ میری سزا یا جزا وہی ہوگی جو ہر جاہل بے علم کی ہوتی ہے یعنی عقلمندوں سے سبق لینا۔

ت: خوب۔ اور کچھ جرمانہ نہ دلوائیے گا۔

میں: اگر میرے پاس روپیا ہوتا تو میں اس کے لئے بھی تیار تھا۔

گلاکن: آپ روپے کا خیال نہ کریں اور تھریسی میکس کو بھی روپے کی فکر نہ کرنی چاہیے۔ سقراط کی طرف سے ہم لوگ روپے ادا کریں گے۔

ت: مگر صاحب، یہ حضرات تو وہی حرکت کریں گے جو ہمیشہ کیا کرتے ہیں، خود جواب دیں گے نہیں اور دوسرے کے جواب کو کسی نہ کسی طرح رد کر دیں گے۔

میں: عزیز من۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ وہ غریب کیا جواب دے جو اول تو کچھ جانتا نہیں اور ساتھ ہی اپنے جہل کا احساس بھی رکھتا ہے۔ اور فرض کیجئے وہ کچھ کہنا بھی چاہے تو آپ جیسا قابل شخص اسے منع کرتا ہے۔ اس لئے مناسب تو یہی ہے کہ وہ شخص جواب دے جو اس معاملے میں علم کا مدعی ہے اور اپنا خیال ظاہر کرنے میں آزاد بھی ہو۔ مجھ پر اور سب حاضرین پر آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ عدل کی کوئی تعریف پیش کریں۔

گلاکن اور دوسرے حاضرین نے بھی اس درخواست میں میری ہم نوائی کی۔ تھریسی میکس چونکہ بزعم خود میں مذہبی عقائد، افکار و خیالات پر اس کا تسلط ہے کہ ادب اور آرٹ میں بس انہیں چیزوں کی تلقین ہو جنہیں حکومت چاہے اور، ستم بالائے ستم، انداز تلقین بھی وہی ہو جو حکومت کو بھائے۔ لیکن نظر غور سے دیکھئے تو واضح ہو جاتا ہے کہ افلاطون ادب اور آرٹ کو ان ماہیت کے خلاف ریاست کی خدمت پر زبردستی مجبور نہیں کرنا چاہتا بلکہ آرٹ کی غایت ہی اس خدمت کو جانتا ہے۔ اس کی نظر میں سچا آرٹ، اچھا آرٹ ہے ہی وہی جو جماعت کے مقاصد میں مد ہو۔ وہ زندگی میں اصول خیر کی کارفرمائی دیکھتا اور ساری کائنات

میں ایک مقصد مضمر پاتا ہے۔ آرٹ چونکہ زندگی اور کائنات کی تعمیر اور ترجمانی کا نام ہے اس لئے اسے بھی اس خیر مطلق کا پرتو ہونا چاہیے جس سے زندگی اور کائنات معمور ہیں۔ وہ آرٹ کو ریاست کا غلام نہیں بنانا چاہتا بلکہ اس سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے حقیقی مقصد کو پورا کرے۔

افلاطون نے نوجوانوں کی تعلیم کا جو نصاب بنایا ہے اس کا مختصر ذکر تو ہو چکا۔ اس نصاب کے ختم ہونے کے بعد اس نے اعلیٰ تعلیم کا ایک خاکہ بھی ان لوگوں کے لئے پیش کیا ہے جو ریاست کے اصلی حکمران بننے والے ہیں۔ پہلی منزل میں تعلیم کا خاص ذریعہ ادب اور آرٹ تھا۔ اس اعلیٰ منزل میں ریاضی اور فلسفہ ہے۔ افلاطون کے زمانے میں اعلیٰ تعلیم کا ایک اور نصاب بھی جاری تھا جسے اس نے یکسر بدل دیا۔ اثینہ میں سوفسطائی معلموں کے مدارس تھے جن میں 17-18 برس کے نوجوانوں کو ابتدائی تعلیم ختم کر چکنے کے بعد خطابت اور سیاست کا درس دیا جاتا تھا۔ تاکہ اس کی تکمیل کر کے یہ جمہوریت کی سیاسی زندگی اور امتیاز اور کامیابی حاصل کر سکیں۔ افلاطون خطابت کی خود فریبی سے بیزار ہے اس لئے اس کے لئے نصاب میں کوئی جگہ نہیں پاتا۔ وہ اپنے نصاب میں پانچ مضمون رکھتا ہے۔ 1۔ علم الحساب 2۔ علم الاشکال 3۔ ہیئت 4۔ موسیقی 5۔ فلسفہ۔ ان میں پہلے 1۔ تا 4۔ اور بعد میں 5۔ یعنی فلسفے کی تعلیم رکھی ہے۔ اور چونکہ موسیقی میں بھی یہاں تناسب کی ریاضیاتی بحثیں مقصود ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ افلاطون نے اپنے نصاب میں ریاضی کو فلسفے کی تعلیم کا پیش خیمہ بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاضیاتی علوم اگر ایک طرف محسوس عملی دنیا میں بھی مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں تو دوسری طرف دنیائے محسوس پر غور کے بجائے، مجرد اور غیر محسوس تصورات پر غور وفکر کی عادت ڈال کر، یہ غیر محسوس عالم اعیان تک پہنچنے کا ایک زینہ بھی بن جاتے ہیں جن کا پورا پورا علم پھر فلسفے سے حاصل ہوتا ہے۔

ان چاروں مضامین کے مطالعے کے لئے افلاطون نے 10 سال کا زمانہ تجویز کیا ہے یعنی 20 سال سے 30 سال تک کی عمر۔ گویا 18 برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم ختم کر کے دو سال خاص فوجی تعلیم اور اس کے اختتام پر جو لوگ اس اعلیٰ تعلیم کے اہل نظر آئیں انہیں اس نصاب کے مطابق تعلیم دی جائے۔ اس نصاب کی تکمیل کے بعد 5 سال فلسفے کی تعلیم

کے لئے رکھے گئے ہیں۔فلسفہ کا یہ نصاب صرف ان کے لئے ہے جنہوں نے گزشتہ دس سال میں ریاضیاتی مضامین کے باہمی ربط و تعلق کا سب سے قوی اور واضح احساس ظاہر کیا ہو۔اس لئے کہ ریاضی محسوس سے غیر محسوس تک پہنچنے کا وسیلہ ہے اور فلسفہ دنیائے فکر و عالم اعیان کے علم اور اس علم سے بالآخر عین خیر تک پہنچنے کا نام ہے۔فلسفہ حقیقت محض یعنی عین خیر کا علم ہے کہ یہی غایت وجود بھی ہے اور مقصود علم بھی اور فلسفی وہ ہے جو حقیقت اشیاء سے آشنا ہو جائے اور عین خیر کا ادراک رکھتا ہو۔

تجویز یہ ہے کہ فلسفی کی پنج سالہ تعلیم میں امتحانوں اور آزمائشوں کا ایسا سلسلہ رکھا جائے کہ سچی فلسفیانہ طبائع کا پورا پورا پتہ چل جائے۔جن میں خامی ہو وہ دور کر دی جائیں جو سب آزمائشوں میں پورے اتریں وہ ریاست کے فلسفی حکمران یا محافظ بنیں۔35 سے 50 سال کی عمر تک یہ ریاست کی خدمت کریں اور حکومت کے وہ تمام کام انجام دیں جو زیادہ معمر بزرگوں سے مخصوص نہیں ہیں۔اس زمانہ خدمت میں بھی برابر ان کی آزمائش ہوتی رہے۔وہ جوان آزمائشوں میں پورے اتریں انہیں سب سے بڑے اعزاز اور سب سے زیادہ ذمہ داری کے کام تفویض کئے جائیں۔اب یہ لوگ اپنا کچھ وقت تو فلسفیانہ غور وفکر میں صرف کریں اور جب ان کی باری آئے تو کچھ وقت ریاست کے عملی فرائض انجام دینے میں اور آنے والی نسلوں کو ریاست کی خدمت اور حفاظت کے لئے تیار کرنے میں۔

ذوق علم اور جوش عمل کی جس کشمکش کا آماجگاہ خود افلاطون کا دل تھا اور جس کا تصفیہ آخر دم تک نہ ہو سکا اور اس کا اثر تعلیم کی اس آخری منزل میں بھی رونما ہے۔اس منزل میں بھی، جہاں فلسفی مقصود علم کو پہنچ جاتا ہے اور غایت وجود کا محرم ہو جاتا ہے، افلاطون اسے بالکل فکر کی دنیا کے لئے نہیں چھوڑتا بلکہ علم و عمل میں ہم آہنگی اور توازن کا مطالعہ یہاں بھی قائم رہتا ہے۔علم حقیقت کچھ گونگے کا گڑ نہیں جسے فلسفی اکیلے اکیلے چکھے اور دوسروں کو اس مزے سے آگاہ نہ کرے۔فلسفی کا ایک مقصد اگر عین خیر کا علم حاصل کرنا ہے تو دوسرا اس علم کی روشنی میں نوع انسانی کو سدھارنا بھی ہے۔اگر اس علم سے اپنی ذہنی تکمیل اور سیرت شخصی کی بہترین تشکیل ہوتی ہے تو پھر اس سے ہیئت اجتماعی کے فلاح و بہبود کی سبیل نکلنی چاہیے۔کامل مفکر کا صاحب عمل ہونا بھی ضروری ہے۔

یہی ارباب علم اور اصحاب عمل افلاطون کی اصطلاح میں فلسفی حکمران، فلسفی بادشاہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں جاہل اور خودغرض اہل سیاست کا خاتمہ کرانا چاہیے۔ یہی حکمت اور خردمندی سے حکومت کر سکتے ہیں کہ نظارہ حقیقت سے بہرہ یاب ہیں۔ یہی بے لوث اور بے لاگ حکومت کر سکتے ہیں کہ ان کے لئے حکومت کوئی زحمت کوئی شرف نہیں بلکہ ایک فرض ہے اور بنی نوع کی سچی خدمت کا ایک موقع۔ حیات اجتماعی وانفرادی کے سارے مقاصد مضمران پر روشن ہوتے ہیں اور یہ ان کو پیش نظر رکھ کر حکومت کر سکتے ہیں اسی لئے ان پر پھر نہ قانون کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ بے جا رسم ورواج کی بندش۔

یہ آخری بات قابل لحاظ ہے اس لئے کہ افلاطون نے جہاں حکومت کو مذہب پر، ادب پر، آرٹ پر، پورا اقتدار دے دیا ہے وہاں ایک چیز میں ریاست کے کام کو بہت کم بھی کر دیا ہے۔ عام طور پر یہ ریاست کے خاص کاموں میں شمار کیا جاتا ہے کہ وہ قانون بنائے اور انہیں نافذ کرنے کے لئے عدالتیں قائم کرے، پولیس رکھے۔ لیکن افلاطون کو اپنی صحیح تعلیم کے نتائج پر اس درجہ اعتماد ہے کہ وہ جسم کی نگہداشت کے لئے ڈاکٹروں، طبیبوں اور معاملات کے تصفیے کے لئے عدالتوں، وکیلوں سے اپنے کو بے نیاز سمجھتا ہے۔ صحیح تعلیم کے بعد نہ امراض جسم کی گنجائش ہے نہ امراض روح کی، اور طبیب اور وکیل انہیں امراض کی علامت ہیں۔ افلاطون نہ مرض کو باقی رکھنا چاہتا ہے نہ علامات کا روادار ہے۔ اس کے نزدیک تو ریاست جماعت عاملہ ہے جس پر قانون بنانے کی کوئی پابندی نہیں۔ اس جماعت عاملہ کا کام دراصل تعلیمی کام ہے اور ریاست ایک تعلیمی ادارہ ہے اور بس کچھ نہیں۔

افلاطون کا فلسفہ انصاف

انصاف کا معنٰی

الجمہوریہ میں افلاطون نے لفظ انصاف کو یونانی لفظ DIKAISUNE کے معنوں میں استعمال کیا ہے، جو لفظ JUSTICE سے کہیں وسیع ہے۔

انصاف کا مفہوم

افلاطون کے نزدیک انصاف اس جذبہ کا نام ہے جس کے باعث ہر شخص صرف اپنے ہی فرائض کے دائرہ عمل میں رہتا ہے، اور دوسروں کے فرائض کے دائرہ عمل میں مداخلت نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں ہر شخص کو صرف ایک کام کرنا چاہیے اور یہ کام اس کے فطری میلان کے عین مطابق ہونا چاہیے۔ دوسروں کے کام میں مداخلت کرنا نہ صرف انصاف کے خلاف ہے بلکہ نقصان کا باعث بھی ہوتا ہے، مثالی ریاست کی تنظیم میں فرائض کی تخفیص ہونی چاہیے اور ہر شخص کو اپنے کام کے علاوہ دوسرے کے کام سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔

انصاف۔ خدمت خلق ہے

اس کے نزدیک جو ریاست مناسب کے ہم آہنگ توازن سے جنم لیتی ہے اس میں انصاف منظم اتحاد کا متقاضی ہوتا ہے اور یہ توازن معاشرے کو تین نفسیاتی بنیادوں پر تقسیم کر کے حاصل ہوتا ہے اور وہ تین بنیادیں معاشرے کے تینوں طبقے مزدور سپاہی اور حکمران ہیں۔ اس کے خیال میں کسی بھی شہری کو فرد واحد سمجھنے کی بجائے خود کو معاشرہ یا ریاست کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ انصاف کا مطلب خدمت خلق ہے اور خدمت خلق اس سماجی اجتماع افراد کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کی خدمت سرانجام دی جاتی ہے۔

انصاف ۔ ریاستی برائیوں کا فریاد

افلاطون کے نزدیک شہری ریاست کے سیاسی اور سماجی برائیوں کا واحد علاج انصاف ہے اور انصاف ہے اور انصاف کی خوبی ریاست میں بحیثیت مجموعی اور فرد میں بحیثیت انفرادی موجود ہے۔ ایک مثالی ریاست میں انصاف موجود ہوتا ہے اور یہ خوبی دوسری دانائی، جرات، ضبط نفس جیسی خوبیوں کے وجود کا باعث ہے۔ تقسیم کار سے مراد قوم کی اخلاقی بہبود اور فرائض کی تخصیص کا مطلب ہر آدمی کا اپنا وہ فرض سرانجام دینا ہے جس کے لئے وہ موزوں ترین اور جس کام کو اس کی فطرت سب سے زیادہ قبول کرتی ہے۔

انصاف انسانی خوبی ہے

افلاطون اپنے نظریہ انصاف میں Cephalus Glancon اور Thrasymachus کے نظریات انصاف پر زبردست تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ Cephalus کا یہ کہنا کہ ''انصاف ایک فن ہے'' غلط ہے۔ انصاف فن کا ہم معنی اور ہم پلہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اسے تجربی طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ انصاف ایک انسانی خوبی ہے یہ انسان کے دل ودماغ کی آواز ہے اور یہ اس طرز کی خوبی ہے کہ اگر کوئی خوبی انصاف کو اپنالے تو پھر وہ کسی کے جذبات کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ وہ سماج کے ہر فرد کا فائدہ سوچتا ہے۔ افلاطون Thrasymachus کے انصاف کے اس اصول کو کہ ''انصاف سب سے مضبوط آدمی کا مفاد ہے اور ہر طرز حکومت میں ایسے قوانین بنائے جاتے ہیں جو حکمران یا حکمرانوں کے حقوق کی مدافعت کرتے ہیں اس لئے فرد کو چاہیے کہ جو کچھ وہ کرسکتا ہے کرے اور جو کچھ وہ حاصل کرسکتا ہے وہ اسی کا حق ہے۔ وہ جو کام کرے حکمرانوں کی خوشنودی اور مفاد کے لئے کرے کیونکہ نا انصاف کو انصاف پر اولیت حاصل ہے۔'' پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی چیز کے منصب کے مطابق اس سے موزوں کام لینے ہی میں اس چیز کی خوبی مضمر ہے۔ روح کی پاکیزگی کے لئے بہتر زندگی ضروری ہے اور بہتر زندگی ہی انصاف ہے۔ اگر بہتر زندگی ہوگی تو خوشی ہوگی اور چونکہ خوشی غم سے بہتر ہے اس لئے

انصاف خوشی کی ضمانت ہے اور خوشی سے خوش حال زندگی ممکن ہے اور انصاف نا انصافی سے بہتر ہے۔ آنکھ کی خوبی سے مضمر ہے کہ آنکھ صاف دیکھے اور کان کی خوبی یہ ہے کہ وہ صاف صاف اور واضح سن سکے۔ اسی طرح روح کی خوبی روح کی پاکیزگی میں مضمر ہے۔ روح کی پاکیزگی کا دوسرا نام "اچھی زندگی" ہے۔ متقضائے روح کے منافی کام کر کے روح کی پاکیزگی کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ روح کی پاکیزگی کے لئے بہتر زندگی ضروری ہے چونکہ فطری طور پر خوشی غم سے زیادہ بہتر ہے اس لئے یہ خیال کرنا کہ نا انصافی کو انصاف پر اولیت حاصل ہے غلط ہے۔

انصاف تقاضائے فطرت ہے

افلاطون "Glancon" کے اس نظریہ انصاف پر کہ "انصاف ایک مصنوعی اور رسمی شے ہے یہ خوف کی پیداوار کمزوروں کی ضرورت ہے اور یہ کمزوروں کی سوچ اور آپس کا معاہدہ تھا کہ وہ آپس میں نا انصافی نہیں کریں گے اور پھر انہوں نے اس معاہدہ کے تحت ایسے قانون بنائے جو آج تک انسان کا معیار عمل اور اصول انصاف ہیں اور انہیں قوانین کے تحت انہوں نے اپنی جبلی خواہشات پر قابو پایا۔" پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ انصاف عین تقاضائے فطرت ہے، انسانی روح کی صحیح تر صورت ہے اور انسان داخلی شے ہے۔

انصاف معاشرے کی یگانگت کا ذریعہ

سیبائن افلاطونی انصاف کے بارے میں کہتا ہے کہ انصاف ایسا خون ہے جو معاشرے کو یکجا رکھتا ہے۔ معاشرہ افراد کا یکجان اتحاد ہوتا ہے جبکہ ہر فرد اپنا مقاصد حیات اپنی فطری اہلیت تربیت کے مطابق منتخب کر لیتا ہے۔ یہ عوامی اور ذاتی دونوں طرح کی خوبی ہے کیونکہ ریاست اور اس کے افراد کی اعلیٰ ترین خوبی کا انحصار اسی میں مضمر ہے کسی فرد کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی بہتر بات نہیں کہ اسے جو کام ملے وہ اس کے کرنے کا انتہائی اہل ہو اور اسی طرح کسی دوسرے فرد یا سارے معاشرے کے لئے اس سے زیادہ بہتر کوئی صورت نہیں کہ ہر کوئی اپنے اپنے موزوں مقام پر نہایت مناسبت سے کام کرتا رہے۔ ریاست کا تجزیہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تین چیزیں ریاست کے فرائض میں شامل ہیں۔

انسانی ضروریات کی تکمیل بہر حال ہونی چاہیے اور ریاست کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر حکومت بھی کرنی چاہیے۔ ''فرائض کی تخصیص'' کی رو سے ضروری ہے کہ لازمی خدمات کی نشان دہی کر دی جائے اور غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خدمات کے لحاظ سے ریاست میں تین طبقات ملتے ہیں۔ کارکن لوگ، سپاہی اور حکمران طبقہ یا فلسفی حاکم (اگر وہ اکیلا ہو) چونکہ کام کی تقسیم کا انحصار ذاتی رجحان اور مناسب طبع پر ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاست میں تین قسم کے اشخاص ہوتے ہیں۔ وہ جو فطرتاً کام کرنا جانتے ہیں اور حکومت نہیں کر سکتے۔ دوسرے وہ جو دوسروں کے اشاروں اور احکام کے سبب حکومت کر سکتے ہیں اور خود اس کی اہلیت نہیں رکھتے اور تیسرے وہ لوگ جو دراصل حکمران کے ذہن کے مالک ہوتے ہیں اور اصل سیاستدان کہلانے کے حقدار ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان تینوں کرداروں میں اپنی اپنی خوبی ہو۔ دانائی حکمران کا اور جذبہ سپاہی طبقہ کا حصہ ہے۔ اچھائی کا پتہ مجرد علم سے حاصل کرنا چاہیے اور اس طرح یہ نظریہ اسی تصور کے بل بوتے پر ایک معاشرہ تشکیل کرتا ہے کہ یہ اصول اچھائی معاشرہ تشکیل کرتا ہے اور یہ معاشرہ میں پوشیدہ ہے تقسیم کار اور فرائض کی تخصیص، معاشرتی تعاون کی شرط ہے اور فلسفی بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ معاملات نہایت منافع بخش اور مفید عمل طریقہ پر حل کریں۔

افلاطون کے نزدیک اصل مقصد یہ ہے کہ ریاست کے فراہم کردہ مخصوص ذرائع کار کے امکانی حصول میں انسان کو پوری طرح حصہ ملے باقی صرف یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ حکمران انسان کو مناسب حصہ دینے کے لئے کن ذرائع سے کام لے۔ اس مسئلے کو حل کر کے صرف دو طریقے ہمیں نظر آتے ہیں۔ یا تو اچھی طرح شہریت کے متناقض حالات کو ختم کر دیا جائے یا اچھی شہریت کے تقاضے پورے کرنے والے حالات کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اول الذکر صورت میں نظریہ اشتراکیت (کمیونزم) سامنے آتا ہے موخر الذکر صورت میں نظریہ تعلیم سے سابقہ پڑتا ہے۔

تقسیم میں انصاف

بارکر کے خیال کے مطابق ''تقسیم کار'' اور ''فرائض کی تخصیص'' ایسے سراغ ہیں جن کی

وجہ سے ہمیں انصاف کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ افلاطون ریاست کی ترکیب میں جن خوبیوں کی نشاندہی کرتا ہے وہ انصاف، دانائی، جرات اور ضبط نفس ہیں۔ پھر وہ باری باری آخری تین اقدار کو ریاست میں اپنے اپنے مخصوص مقامات دیتا ہے اور آخر میں انصاف کی قدر کو ایک مقام پر مخصوص کرتا ہے۔ درحقیقت ریاست کی یہ خوبیاں افراد ہی کی خوبیاں ہیں بشرطیکہ یہ افراد ریاست کے باشندے ہوں۔ دانائی حکمران طبقہ کی صفت ہے جو اپنی حکومت کو دلائل و بصیرت سے چلاتا ہے۔ جرات سپاہی کی خوبی ہے اور ضبط نفس کاشتکار طبقہ کا وصف ہے۔ لیکن اعتدال پسندی کا وصف ہر طبقہ میں دوسری خوبیوں سے کچھ زیادہ ہے۔ ریاست کی نرم خوئی کا بحیثیت مجموعی مطلب یہ ہوگا کہ ایک طرف تو کاشتکار اور سپاہی دونوں طبقے حکومت کے آگے اطاعت گزاری کی ضرورت کا احساس پیدا کریں اور دوسری طرف حکومت بھی ان طبقات کی ضروریات کی تکمیل کا خیال رکھے جن کی بدولت یہ حکمرانی قائم ہوئی۔ چنانچہ ضبط نفس ہی ریاست کے مختلف عناصر ترکیبی کو متحد رکھنے کا ذریعہ ہے۔

فرائض میں انصاف

انصاف فرائض کی تخصیص ہے۔ انصاف اس عہد کا نام ہے کہ ہر آدمی اپنا کام کرے گا اور دوسرے کے کام میں دخل نہ دے گا۔ یہ سنہری اصول ریاست کی بنیادی تعمیر کے وقت وضع کیا گیا تھا کہ ہر آدمی کو صرف وہ ایک کام کرنا چاہیے جو اس کی فطری طبع کے لحاظ سے سب سے زیادہ مناسب ہو۔ اس طرح انصاف ہر دوسری خوبی کے لئے ضروری ہے کیونکہ جب تک کوئی شہری منصفانہ طور پر اپنے دائرہ عمل میں پوری تندہی اور توجہ سے کام نہیں کرے گا اس کی اس خوبی کا پتہ نہ چل سکے گا جو اس کے دائرہ عمل میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاشرتی انصاف معاشرے کے ایک اصول کا نام ہے۔ جبکہ معاشرہ میں مختلف قسم کے لوگ مثلاً حکمران، سپاہی، مزدور ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضرورت کی تکمیل کی خواہش کے تحت مل جل کر رہتے ہیں وہ ایک معاشرہ میں ضم ہونے اور اپنے جدا جدا فرائض پر توجہ دینے کی وجہ سے ''ایک کل'' کی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں یہ ''کل'' اپنی جگہ کامل ہے کیونکہ یہ انسانی ذہن کے مشترک جذبہ کا عکس ہے۔ ریاستی انصاف

شہریوں کا احساس ہے کہ وہ دنیا کے سامنے جانے سے پیشتر اپنے مخصوص مقامات پر اپنے فرائض کی انجام دہی کا شعور رکھتے ہوں۔ انصاف کا یہ نظریہ "انفرادیت" (فرد پرستی) کے خلاف جاتا ہے۔ یہ نظریہ ثابت کرتا ہے کہ فرد کوئی الگ شے نہیں بلکہ ایک نظام کا حصہ ہے۔ اس کا مقصد کسی دوسرے فرد کی ذاتی خوشی چاہنا نہیں بلکہ اس نظام میں ایک مخصوص جگہ کو پرکھنا ہے۔ فرد جز ہے کل نہیں اور نہ ہی اسے بحیثیت کل مانا جاسکتا ہے۔ ریاست "کل" کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے حق ہے کہ فرد سے اپنی ہر حیثیت منوائے اور اسے اپنا حصہ یا جزو قرار دے۔ افلاطون کا یہ نظریہ فرد کے حقوق پر بحث نہیں کرتا بلکہ فرد کے فرائض کی بات کرتا ہے۔

جیسے ریاست کے ہر طبقہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی دیانتداری سے انجام دے۔ اسی طرح فرد کے انصاف کے معنی ہیں کہ فرد کے ذہن کا ہر حصہ اپنے مخصوص فرائض درست طریقے پر سرانجام دے اور یہی ریاستی انصاف ہے۔ انسانی ذہن کے تین حصے، ریاست کے تین طبقوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس طرح ریاست کے تینوں طبقات اپنے اپنے مقامات پر قائم ودائم رہ کر مصروف کار ہیں اسی طرح فرد کے ذہن کے تینوں حصے اشتہا، جذبہ اور ادراک اپنا اپنا کام کریں۔ فرد کا انصاف عوامی اور ذاتی دونوں لحاظ سے اہم ہے کیونکہ یہ معاشرہ اور فرد کی ذات، دونوں کی بہبود کا تحفظ کرتا ہے۔ ریاست کے جزو ہونے کی حیثیت سے فرد اپنے فرائض سرانجام دے کر انصاف کا اظہار کرتا ہے جبکہ بحیثیت فرد اس کے ذمہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کے تینوں حصوں سے صحیح کارکردگی کا اظہار کرے۔ اس طرح ریاستی انصاف کی صورت میں وہ ریاست کا فرد ہوتا ہے اور انفرادی انصاف کے وقت وہ اپنے ذہن میں سب کچھ کرتا ہے۔

مثالی ریاست کے لئے آفاقی انصاف کی ضرورت

افلاطون کے مطابق آفاقی انصاف صرف مثالی ریاست میں حاصل ہوسکتا ہے اور مثالی ریاست وہ ہے جو مناسب تعلیم، نظریہ اشتراکیت، تخصیص فرائض اور فلسفی فرماں روا کی حکومت پر مشتمل ہو۔ وہ قانونی انصاف کو آفاقی انصاف کی نسبت بہت کمزور اور پر عجیب

سمجھتا ہے کیونکہ اس میں دانا بادشاہ کی فراست جیسی پختگی نہیں ہو سکتی۔

بارکر کی نظر میں افلاطون کا یہ نظریہ انصاف ''قانونیت'' کے دائرہ عمل کی بجائے معاشرتی اخلاق سے متعلق ہے جبکہ معاشرتی اخلاقیات معاشرتی تعلقات استوار کرنے کا ذریعہ ہے یہ نظریۂ انصاف ان ذرائع سے بحث کرتا ہے جن کی بدولت سارا معاشرہ اچھائی اور معاشرتی خوشحالی حاصل کر سکتا ہے اس نظریہ کی اصل روح رواں یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ عمل میں اپنے اپنے فرائض سرانجام دے۔ اس کلیہ کے پس منظر میں اور اس معاشرتی اخلاقیات کے تصور کے پس پشت یہی اصول ہے کہ معاشرہ ایک اخلاقی کل یا اخلاقی تنظیم ہے جو اخلاقی زندگی کا ترجمان ہے اور ہر فرد اس کا جزو یا حصہ ہے اور ہر فرد اپنا ذریعہ کار رکھتا ہے۔

افلاطون کی شہرہ آفاق کتاب ریپبلک کا اردو ترجمہ بنام ''ریاست'' طبع ہوئی ہے، اس کے شروع میں اس کے مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین نے لکھا ہے۔ (بحوالہ افلاطون) (بذیل عدل)

ریاست میں عدل کے رائج الوقت نظریات نہایت خوبی سے پیش کیے گئے ہیں۔ اور ان پر بحث کر کے مخصوص سقراطی انداز میں انہیں رد کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے عدل کا روایتی نظریہ کفیل کی زبان سے پیش ہوتا ہے کہ عدل قرض ادا کرنے یا واجب کو پورا کرنے کا نام ہے۔ اثنائے گفتگو میں ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ عدل کوئی مہارت یا ہنر ہے جس سے دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ افلاطون یہ جتا دیتا ہے کہ عدل کوئی ہنر مندی یا مہارت نہیں بلکہ روح کی ایک صفت اور ذہن کی ایک عادت ہے جس کا حامل بس ایک ہی طریقے پر عمل پیرا ہو سکتا ہے اور وہ طریقہ ہرگز ایسا نہیں ہوتا جس سے کسی کو چاہے دوست ہو چاہے دشمن نقصان پہنچے یا اس کی ذات میں کسی طرح کا انحطاط پیدا ہو۔

کفیلس اور اس کے بیٹے کے بعد مشہور سوفسطائی تھریسی میکس اس روایتی تصور عدل کے مقابلے میں انقلابی اور تنقیدی نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ عدل کو قوی تر فریق کے اغراض سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول نہایت بے باکی اور دیدہ دلیری سے پیش کرتا ہے۔ یہ صاف صاف کہتا ہے کہ ریاست میں حکمران کے اغراض کی پابندی

عدل ہے یعنی قوی کے لئے اپنے غرض اور کمزور کے لئے دوسرے کی غرض پورا کرنے کا نام عدل ہے۔ عدل کا یہ نظریہ انفرادیت کی حد ہے جس کے جواب میں افلاطون اس موقع پر اپنا نظریہ جماعت پیش نہیں کرتا کہ افراد اور گروہ کے جدا جدا بے تعلق و بے رابط اغراض ہوتے ہی نہیں بلکہ ہر ایک کی غایت یہ ہے کہ کل کی بھلائی کے لئے اپنے اپنے وظائف مخصوص کو پورا کرے۔ یہاں تو وہ صرف اپنی بے پناہ سقراطی جرح سے اس نظریہ انفرادی کو ختم کر دیتا ہے اور یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اگر حکومت کوئی فن ہے تو ہر فن کی طرح اس کا مقصد بھی اپنے موضوع کے نقائص کو رفع کرنا ہوگا۔ اور حکمران کے لئے اگر وہ سچا حکمران ہے بے غرض اور محکموں کے مفاد کا ضامن ہونا لازمی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تھریسی میکس سے رفتہ رفتہ یہ بھی منوا لیتا ہے کہ عادل شخص ظالم سے زیادہ دانشمند زیادہ قوی اور زیادہ خوشحال ہوتا ہے۔ زیادہ دانشمند اس لئے کہ وہ ہر ایک سے جا و بے جا مقابلہ اور مسابقت میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ اس کا مقصد خوبی و کمال حاصل کرنا ہے نہ کہ کسی دوسرے سے بڑھ جانا۔ زیادہ قوی اس لئے کہ غیر عادل ظالم لوگوں کے کسی گروہ کو بھی قوت حاصل کرنی ہو تو وہ ایک دوسرے سے عدل و انصاف ہی سے پیش آنے پر مجبور ہوتے ہیں ورنہ ساری قوت منتشر ہو جاتی ہے۔ زیادہ خوشحال یوں کہ ہر چیز کا ایک مخصوص وظیفہ ہوتا ہے جسے بس وہی انجام دے سکتی ہے اور کوئی دوسری چیز اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتی۔ ہر چیز کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے مخصوص وظیفے کو بہ احسن وجوہ پورا کرے۔ جس طرح آنکھ کا کمال اچھی طرح دیکھنا اور کان کا کمال اچھی طرح سننا ہے اسی طرح روح انسانی کا مخصوص کمال اچھی زندگی ''حیات طیبہ'' ہے۔ روح عدل سے محروم ہو کر جو اس کی مخصوص خوبی ہے یہ حیات طیبہ حاصل نہیں کر سکتی اور اس کے بغیر اسے حقیقی مسرت و خوش حالی نصیب نہیں ہوتی۔

افلاطون کے سقراط نے تھریسی میکس کو چپ تو کرا دیا لیکن حاضرین کے دل سے یہ خیال جو بہت عام خیال سے نہیں ہٹا کہ عدل اچھی چیز سہی مگر ایک غیر فطری سی چیز ہے۔ اور آدمی اس پر بس اس لئے عمل کرتا ہے کہ رسم و رواج نے اس پر عمل کرنا سکھایا ہے اور رسم و رواج ہی اس کی پابندی پر مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ جو تیسرا نظریہ عدل اس بحث کے سلسلے میں سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ عدل ایک مصنوعی رسمی چیز ہے۔ آدمی جب قدرتی حالت

میں رہتا تھا تو بس پھر ظلم کرتا تھا اور سکت بھر ظلم سہتا تھا۔ لیکن بہتوں کے لئے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہوگئی۔ ظلم سہنا زیادہ پڑا اور ظلم کرنے کے موقعے اتنے نہ ملے تو آدمیوں نے باہم معاہدہ کرلیا کہ نہ ظلم کریں گے نہ ظلم سہیں گے۔ اس معاہدے کو قانون کی شکل دے کر کچھ معیار عمل مقرر کردیے۔ رفتہ رفتہ اس قانون کے اثر سے انسانی فطرت اپنی اصلی جبلت سے ہٹ کر ظلم سہنے کے ڈر سے عدل کی خوگر ہوگئی۔ یوں عدل گویا خوف کا آفریدہ ہے۔ یا یوں کہیے بہترین حالت یعنی ظلم کرسکنے اور بدترین حالت یعنی ظلم سہنے پر مجبور ہونے کے درمیان ایک مصالحت کی صورت ہے۔ اگر تھریسی میکس کے نزدیک عدل قوی فریق کے مفاد کا نام تھا تو یہاں عدل سے مراد کمزور کی ضرورت ہے۔

گفتگو میں اس نقطے پر پہنچ کر افلاطون کو محسوس ہوتا ہے کہ عدل کے جتنے نظریے پیش کیے جاتے ہیں ان میں یہ بات مشترک ہے کہ سب کے سب عدل کو کوئی خارج چیز سمجھتے ہیں اور افلاطون اسے ثابت کرنا چاہتا ہے روح کی ایک ذاتی داخلی صفت، اس لیے اب وہ منطقی استدلال اور جرح کو چھوڑ کر نفسیاتی تحلیل سے کام لیتا ہے۔ لیکن فوراً نفس انسانی (انفرادی) کی تحلیل شروع نہیں کرتا بلکہ بالکل نئی راہ اختیار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر کسی کتاب کے دو نسخے ہوں ایک بہت جلی لکھا ہو، دوسرا خفی، تو جلی تحلیل کے پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اسی طرح کتاب عدل کے بھی دو نسخے ہیں۔ جلی نسخہ تو اجتماعی زندگی میں ملتا ہے اور خفی حیات انفرادی میں۔ پہلے میں یعنی ریاست میں اس کا دیکھنا اور پہچاننا زیادہ سہل ہے۔ اور اگر یہ ریاست ابھی بن رہی ہو اور اجتماعی زندگی کا ہیولیٰ پہلی مرتبہ متعین سیاسی شکل اختیار کررہا ہو تو اس وقت عدل کا جلوہ موجودہ تاریخی ریاستوں کی عارضی آلودگیوں سے پاک نظر کے سامنے آجائے گا۔ چنانچہ افلاطون خیال میں ایک ریاست کی بنیاد رکھتا ہے اور اسی طرح عدل کی تلاش میں ایک ریاست کا دستور مرتب ہوجاتا ہے۔

دستور ریاست کی ترتیب میں انفرادی نفسیات کی فیثاغورثی تقسیم سہ گانہ افلاطون پیش نظر رہی ہے۔ جس طرح انسانی روح تین عناصر سے مرکب ہے یعنی عنصر اشتہائی، عنصر جری اور عنصر عقلی، اسی طرح ریاست بھی تین طبقوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ افلاطون سب سے پست عنصر اشتہائی سے شروع کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ انسانی احتیاجات اور ضروریات کی نوعیت

اسے تعاون باہمی پر مجبور کرتی ہے۔ ابتدا ہی میں اس معاشی نظام میں تخصیص کار اور تقسیم عمل نظر آتی ہے۔ پھر انسان اپنی ضروری احتیاجات کی تسکین پر قانع نہیں ہوتا۔ نفیس اور لطیف چیزیں بھی مانگتا ہے۔ نقاشی، شعر، موسیقی سب اس کی ضرورتیں بن جاتے ہیں اور ان کی فراہمی کے لیے خاصی بڑی آبادی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس آبادی کے لیے خاصا رقبہ زمین بھی۔ اس رقبے کے حاصل کرنے اور اسے محفوظ رکھنے کے لئے جنگ ریاست کے وظائف میں شامل ہو جاتی ہے اور اس طرح نفس اجتماعی کا عنصر جری منظم ہو کر ریاست میں فوجی طبقے کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ پیشہ ور سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جوتے گانٹھنے اور کپڑے سینے کے کام کو تو اتنا اہم سمجھا جائے کہ ایک آدمی بس ساری عمر بس یہی کرے، اور کچھ نہ کرے۔ لیکن ریاست کی حفاظت کا اہم تر کام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے جنہیں اس کے انجام دینے کی خاص تعلیم نہ دی گئی ہو۔ یہ کام سپاہیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے، جن کا یہی پیشہ ہو اور کچھ نہ ہو۔ جن اشخاص میں عنصر جری زیادہ نمایاں ہو انہیں اس کام کے لئے منتخب کرنا اور انہیں یہ کام خاص اہتمام سے سکھانا چاہئے۔ لیکن ان محافظوں میں صرف عنصر جری کا ہونا کافی نہیں۔ ان کی مثال محافظ کتوں کی سی ہے جو گھر کے لوگوں سے تو نہیں بولتے لیکن اجنبیوں پر جھپٹتے ہیں۔ یہ محافظ کتے جنہیں جانتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جن کو نہیں جانتے ان سے نفرت۔ یعنی ان کے نزدیک دوست دشمن میں وجہ امتیاز علم یا عنصر عقلی ہے۔ لہٰذا ریاست کی جنگی طبقے میں بھی یہ عنصر عقلی ضرور موجود ہونا چاہئے۔ پھر اگر عام محافظوں میں اس عنصر عقلی کا وجود ضروری ہے تو کامل محافظ یا حکمران میں تو یہ بدرجہ اتم موجود ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس کامل محافظ کے تصور کے ساتھ افلاطون تیسرے عنصر کو پوری طرح ریاست میں داخل کرتا ہے اور محافظوں کی دو قسمیں کر دیتا ہے یعنی فوجی محافظ جنہیں بعد میں ''مددگار'' کا لقب دیا گیا ہے، اور فلسفی محافظ جن کی خصوصیت امتیازی عنصر عقلی کا کمال ہے اور حقیقی معنوں میں یہی ریاست کے حکمران یا فلسفی بادشاہ ہیں۔

غرض ان تین طبقوں کی ایک ریاست بنا کر افلاطون اس میں عدل کی تلاش کرتا ہے کہ یہی اس تاسیس کی وجہ تھی۔ یہ ریاست کے چار محاسن قرار دیتا ہے یعنی حکمت، شجاعت،

عفت اور عدل۔ پہلے تین محاسن کو متذکرہ بالا تین طبقوں کے وظیفہ خاص سے تعبیر کر کے یعنی حکمت کو حکمرانوں کا کمال بتلا کر' شجاعت کو مددگار محافظوں کا اور عفت یا ضبط نفس کو دولت آفریں طبقے کا' وہ عدل کے متعلق سوال کرتا ہے کہ آخر یہ کس طبقے کا مخصوص جوہر ہے اور جواب دیتا ہے کہ عدل کسی مخصوص جزو کا جوہر نہیں بلکہ کل کا جوہر ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہر طبقہ اور ہر فرد اپنے مخصوص وظیفے کو بخوشی انجام دے اور دوسرے کے کام میں دخل نہ دے۔ محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ حکمت کی روشنی میں ریاست کے لئے مقاصد متعین کرے اور اس کے وسائل تجویز کر کے ریاست سے ان پر عمل کرائے۔ مددگار محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ شجاعت وجرات سے ریاست کی حفاظت کرے۔ دولت آفریں گروہ کا عدل یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی کے کل پرزوں کو اعتدال کے ساتھ چلاتا رہے۔ اور چونکہ کسی طبقے یا کسی فرد میں اس وقت تک اپنا مخصوص جوہر پیدا نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنا مفوضہ کام پورے انہماک سے انجام نہ دے اس لئے عدل تمام محاسن اخلاق کی شرط اول ہے۔

''ریاست'' کے نسخہ جلی میں عدل کی یہ ماہیت معلوم کر کے افلاطون اس کو نفس انفرادی پر منطبق کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ اگر ریاست میں عدل مختلف طبقوں کے اپنے اپنے فرائض کو انجام دینے کا کام ہے تو انفرادی زندگی میں یہ اس سے عبارت ہے کہ روح کے اجزائے ثلاثہ اپنا اپنا کام انجام دیں اور عقل' جذبات اور شہوات اپنی اپنی حدود میں کارفرما ہوں اور شخصی زندگی ان میں مناسب ہم آہنگی اور توازن پیدا کرے۔

(ماخذ۔ریاست:ص15 تا19)

ایک اور جگہ ''ریاست'' میں صفحہ نمبر 191 پر یوں درج ہے،

لیکن درحقیقت عدل کو انسان کے ظاہر سے سروکار نہیں باطن سے ہے کہ یہی انسان کی اصلی اور اس کی حقیقی اعانت ہے۔ عادل آدمی اپنے مختلف اندرونی عناصر کو ایک دوسرے میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا' نہ ایک کو دوسرے کا کام کرنے دیتا ہے۔ وہ اپنی باطنی زندگی کو منضبط کر لیتا ہے۔ خود اپنا آقا ہوتا ہے' خود ہی اپنے لئے قانون بنالیتا ہے' وہ اپنی ذات سے برسر پیکار نہیں ہوتا' بلکہ صلح وسلامتی کے ساتھ رہتا ہے۔ جب یہ اس طرح اپنی روح کے تینوں اصولوں کو (جو بمنزلہ اونچے' نیچے اور متوسط سر اور ان کے درمیانی فصل کے

ہیں) باہم متحد کر لیتا ہے اور اس میں کثرت باقی نہیں رہتی بلکہ ایک معتدل اور منضبط طبیعت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر ضرورت کے وقت یہ عمل کی طرف اپنا قدم اٹھاتا ہے خواہ یہی عمل املاک کے بارے میں ہو یا جسم کے علاج کے متعلق یا کوئی سیاسی یا خانگی معاملہ ہو۔ جو چیز اس متناسب اور ایک آہنگ کیفیت کو قائم رکھے یا اس میں مدد دے اسے یہ نیک اور عادلانہ جانے گا بھی اور ملے گا بھی۔ جو علم اس عمل خیر کا باعث ہو اسے حکمت اور عقل سے تعبیر کرے گا' جو عمل اس کیفیت میں خارج ہو اسے غیر عادلانہ قرار دے گا اور جو رائے اس کی وجہ ہوگی اسے جہل جانے گا۔

صفحہ نمبر 197 ء پر درج ایک مکالمہ میں افلاطون یوں بیان کرتا ہے۔

تو میں آپ سے عرض کر دوں کہ آپ اس کے بالکل مخالف عمل کر رہے ہیں۔ آپ کی ہمت افزائی نہایت خوب ہوتی اگر خود مجھے یقین ہوتا کہ جس چیز پر میں گفتگو کر رہا ہوں اس سے واقف ہوں۔ ان امور مہمہ کے متعلق جن کی آدمی وقعت کرتا اور جن سے محبت رکھتا ہے' عاقلوں کے ایک ایسے مجمع میں جو سب خود اس کی ذات سے انس رکھتے ہوں' حق کا اعلان خوف وتذبذب کا سبب نہ ہونا چاہئے۔ لیکن جب آدمی خود مذبذب ہو اور پھر اس مسئلے کے متعلق دلیلیں کرے تو یہ خطرے کی بات ہے۔ اور یہی حال میرا ہے۔ مجھے اس کا ڈر نہیں کہ لوگ مجھ پر ہنسیں گے' یہ ڈر تو سراسر طفلانہ ہے' بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ جہاں اپنے قدم پر پورے اعتماد کی ضرورت ہے وہیں پاؤں لغزش نہ کھائے اور حقیقت سے محروم نہ رہوں اور خود کروں سو کروں کہیں احباب کو بھی ساتھ نہ لے گراؤں۔ میں انتقام کی دیوی سے دست بہ دعا ہوں کہ میں جو کچھ کہنے والا ہوں وہ بس مجھ ہی پر صادق ہو۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ کسی انسان کو بلا ارادہ قتل کر دینا اتنا بڑا جرم نہیں جتنا کہ حسن وخوبی اور عدل اور آئین کے اصول کے متعلق کسی کو دھوکا دینا۔ اور یہ خطرہ ایسا ہے کہ میں دشمنوں میں تو اسے برداشت بھی کر لوں لیکن دوستوں میں ہرگز نہیں کر سکتا۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی ہمت افزائی نے کیا کام کیا؟

کتاب ریاست میں ہی صفحہ نمبر 322 پر مکالمہ درج ہے۔

تو اب ہم ادنیٰ درجے کی طبیعتوں کا حال بیان کریں، مثلاً وہ لالچی اور جھگڑالو طبیعتیں جو اسپارٹا کی سماج سے مناسبت رکھتی ہیں، نیز اشرافیہ جمہوری، اور مستبد حکومتوں سے مطابق

طبیعتوں کا پھر ہم سے زیادہ عادل کو سب سے زیادہ ظالم کے ساتھ رکھیں، کہ انہیں دیکھ کر ہم خالص عدل کی زندگی گزارنے والے اور خالص ظلم کی زندگی والے کی نسبتی سعادت یا تشقاوت کا موازنہ کرسکیں گے اس وقت جا کر یہ تحقیق پوری ہوگی اور ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمیں تھریسی میکس کے مشورے کے مطابق ظلم اور ناانصافی پر عمل پیرا ہونا چاہیے یا اپنی دلیل کے نتیجوں کے مطابق عدل کو ترجیح دینی چاہیے۔

عدل کا جانبدار

ریاست صفحہ نمبر 387 پر درج ہے

عدل کا جانب دار اس پر یہ جواب دیتا ہے کہ اسے اپنے قول اور فعل سے ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے اندر کے انسان کو پورے انسان نما وجود پر تسلط حاصل ہو جائے۔ اسے چاہیے کہ اپنے سوسرے راکشس پر ایسی نگاہ رکھے جیسے باغبان اپنے پودوں پر یعنی اس میں جو اچھی اور زم صفات ہیں انہیں نشو ونما دے اور جو وحشی اور جنگلی عناصر ہیں انہیں نہ بڑھنے دے، پھر اسے چاہیے کہ اس کے اندر جو شیر ہے اسے اپنا معاون بنالے اور ان سب کی نگہبانی یوں کرے کہ پہلے تو مختلف اجزاء کو باہم ایک دوسرے سے اور پھر خود اپنی ذات سے متحد کرلے۔

ناانصاف کی مثال

ریاست صفحہ 418 پر درج ہے

اور انسانوں سے اسے کیا ملتا ہے؟ ذرا واقعات کو ان کی اصلی نوعیت میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ چالاک ناانصاف لوگوں کی مثال ان دوڑنے والوں کی سی ہے جو دوڑ کے شروع والے سرے سے دوسرے سرے تک خوب اچھی طرح دوڑ جاتے ہیں لیکن پھر وہاں سے واپس نہیں ہوسکتے، پہلے پہل تو خوب سرپٹ بھاگ لیتے ہیں لیکن آخر میں احمق بنتے ہیں اور فتح کا تاج لئے بغیر کندھوں پر کان ڈالے لشتم پشتم چلے آتے ہیں۔ جو واقعی اچھا دوڑنے والا ہوتا ہے وہ آخر تک پہنچتا ہے، چنانچہ اسے انعام بھی ملتا ہے اور سر پر فتح کا تاج بھی رکھا

جاتا ہے۔ یہی حال عادل آدمی کا ہے، یہ اپنے تمام اعمال اور معاملات کو بہ جبر تا اختتام پہنچاتا اور اس زندگی کے خاتمے پر سب کی زبان پر اس کی بھلائی ہوتی ہے اور یہ وہ انعام پا لیتا ہے جو انسان کسی کو دے سکتے ہیں۔

عادل کی پہچان

ریاست صفحہ 418 پر درج ہے

چنانچہ عادل انسان کے متعلق ہمارا تصور یہ ہونا چاہیے کہ خواہ یہ افلاس میں مبتلا ہو یا مرض میں یا اور کسی فلاکت اور مصیبت میں آخر میں چل کر ساری باتیں زندگی اور موت میں اس کی بھلائی کا باعث ہوں گی۔ کیونکہ دیوتا ہمیشہ اس کی فکر رکھتے ہیں جو عادل بننے اور جہاں تک عمل صالح سے تمثال الٰہی کا حصول ممکن ہے خدا جیسا ہونے کا آرزومند ہوتا ہے۔

آگے صفحہ 419 پر مکالمہ میں افلاطون کا بیان ہے اور اب مجھے اجازت دو کہ میں عادل آدمی کے ساتھ ان تمام برکتوں کو منسوب کروں جو تم خوش نصیب کے لئے بیان کر رہے تھے۔ تم جو اوروں کے لیے کہتے تھے اب ان کے لئے کہتا ہوں یعنی جب ان کا سن ترقی کرتا ہے تو یہ اگر چاہیں تو اپنے شہر میں حاکم بن سکتے ہیں، جس سے چاہتے ہیں شادی کرتے اور جن سے چاہتے ہیں اپنی بیٹیاں بیاہتے ہیں، غرض جو جو بھی تم نے اوروں کی بابت کہا میں کہتا ہوں کہ ان میں سے اکثر چاہے جوانی میں بچ نکلیں بالآخر پکڑے ہی جاتے ہیں اور اپنے دور کے ختم پر احمق ہی بنتے ہیں۔ پھر جب بڑھاپا آتا ہے تو اپنے پرائے، شہری اور اجنبی، سب کے ہاتھوں ان کی توہین ہوتی ہے، مار کھاتے ہیں اور وہ درگت بنتی ہے کہ ان کا ذکر بقول تمہارے کانوں پر گراں ہے، طرح طرح کے عذاب ہوتے ہیں، آنکھیں جلا کر نکالی جاتی ہیں۔ بس فرض کر لو کہ میں نے تمہاری کہی ہوئی مصائب کی ساری کہانی دہرا دی۔ انہیں بلا بیان کئے میں فرض کر سکتا ہوں نا کہ یہ ساری باتیں صحیح ہیں؟

فلسفۂ عدل کے افلاطون

نظام جزاوسزا

افلاطون نے الجمہوریہ کے دسویں باب میں جزاوسزا کے نظام، روحوں کا دوبارہ انسانی یا حیوانی قالب اختیار کرنے اور عالم ناسوت سے واپسی کے بارہ میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا ہے جو قارئین کی دلچسپی کے لیے من وعن پیش ہے۔

الجمہوریہ کا دسواں باب

''ارمینیس کا بیٹا ایرکا جو پیدائشی پامفلیا کا رہنے والا تھا۔لڑائی میں مارا گیا، اور دس دن بعد جب لوگوں نے لاشیں اٹھائیں تو باقی تمام جسم تو سڑ چکے تھے لیکن اس کے جسم پر کوئی اثر نہ تھا، چنانچہ اس کی نعش کو دفن کرنے کے لیے گھر لے گئے۔بارھویں دن لاش چتا پر رکھی تو یہ دوبارہ زندہ ہو گیا اور دوسرے عالم میں اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ لوگوں کو سنایا۔

اس نے کہا کہ جب میری روح نے جسم کو چھوڑا تو میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ سفر پر چل پڑا۔ چلتے چلتے ہم ایک مخفی مقام پر پہنچے جہاں زمین دوز دو دروازے تھے، یہ دونوں دروازے قریب قریب تھے اور ان کے مقابل اوپر آسمان میں بھی دو دروازے تھے۔ درمیانی فضا میں حاکم اجلاس کر رہے تھے۔جب عادل انسانوں کا معاملہ فیصل ہو جاتا اور فیصلہ ان کے سامنے باندھ دیا جاتا تو انھیں حکم ملتا تھا کہ آسمانی راستے سے سیدھے ہاتھ کی طرف چڑھ جاؤ اسی طرح ناانصافوں کو الٹے ہاتھ کی طرف نیچے اترنے کا حکم ہوتا تھا ان کے اعمال کی نشانیاں بھی ساتھ ہوتی تھیں لیکن (بجائے سامنے کے) پشت پر آویزاں۔ میں جب قریب گیا تو مجھ سے کہا گیا کہ تو وہ پیامبر ہے جو اس عالم کی خبر انسانوں تک لے جائے

گا اور مجھے حکم ہوا کہ یہاں جو کچھ دیکھنے سننے کی باتیں ہیں سب دیکھ سن لو۔ میں نے جو نظر کی تو دیکھا کہ جب ان کا فیصلہ سنا دیا جاتا تھا تو زمین اور آسمان کے ایک دروازے سے تو روحیں رخصت ہو رہی تھیں اور دوسرے دونوں دروازوں سے روحیں کچھ تو گرد آلود اور سفر سے ماندہ زمین کے اندر سے اوپر آتیں اور کچھ نہایت صاف جگ مگ آسمان کے نیچے اترتیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب کسی لمبے سفر سے ابھی ابھی آ رہی ہیں۔ یہ سب خوشی خوشی سبزہ زار پر جاتیں اور وہاں جا کر یوں پڑاؤ ہوتا گویا کوئی تہوار ہے۔ جو روحیں ایک دوسرے سے واقف تھیں وہ گلے ملتیں اور خوب باتیں کرتیں، زمین سے آنے والی روحیں نہایت اشتیاق سے اوپر کا حال دریافت کرتیں اور آسمان سے آنے والی نیچے کا حال، سب ایک دوسرے سے راستے کے واقعات بیان کرتیں، نیچے سے آنے والی روحیں ان پر جو کچھ زیر زمین سفر میں گزری تھی (اور یہ سفر ہزار سال کا تھا) اس کی یاد پر روتیں، اوپر سے آنے والیاں آسمانی مسرتوں اور حسن کے ناقابل تصور مظاہر بیان کرتیں۔

سارا قصہ ''گلاکن'' تو بڑا وقت لے گا، خلاصہ یہ ہے کہ اس نے بیان کیا کہ انہوں نے کسی کے ساتھ جو برائی کی تھی اس کا دس گنا عذاب بھگتنا پڑا یعنی اگر سو سال میں ایک دفعہ برائی کی تھی (اور انسانی عمر کا یہی اندازہ کیا گیا ہے) تو سزا دس گنا ایک ہزار سال میں پوری ہوئی۔ مثلاً اگر کوئی بہت سی موتوں کا باعث ہوا ہو اگر کسی نے شہروں یا لشکروں کو غلام بنایا، یا انہیں دغا دیا ہو یا کسی اور بدکرار کا مرتکب ہوا ہو تو ان تمام گناہوں کے لئے اور ایک ایک کر کے دس گنا سزا ملتی ہے۔ اسی طرح احسان، عدل اور تقویٰ کا انعام بھی اسی نسبت سے ملتا ہے۔

اس کے دہرانے کی تو چنداں ضرورت نہیں جو اس نے ان چھوٹے بچوں کی بابت کہا جو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ دیوتاؤں اور والدین کے ساتھ سعادت مندی یا غیر سعادت مندی کی بابت نیز قاتلوں کے متعلق اس نے اور بہت بڑی جزاؤں سزاؤں کا بیان کیا۔ یہ کہتا تھا کہ جب ایک روح نے دوسری سے دریافت کیا کہ ''اردیائیس اعظم کہاں ہے'' دوسری روح نے جواب دیا کہ ''وہ یہاں نہیں آیا اور نہ کبھی آئے گا۔ یہ اردیائیس ایر کے زمانے سے کوئی ہزار سال پہلے تھا' یہ پامفلیا کے کسی شہر کا مستبد حاکم تھا' اپنے بوڑھے

باپ اور بڑے بھائی کو اس نے قتل کر ڈالا تھا اور کہتے ہیں کہ ایسے ہی اور بہت سے نفرت انگیز گناہوں کا مرتکب تھا اس وقت میں وہاں موجود تھا اور ان ہیبت ناک مناظر کا میں نے خود مشاہدہ کیا تھا۔

ہم غار کے دہانے پر تھے اور چونکہ اپنا سارا تجربہ حاصل کر چکے تھے اس لئے اب اوپر چڑھنے والے ہی تھے کہ یکا یک اردیائیس اور کئی لوگ نمودار ہوئے ان میں سے اکثر جابر مستبد تھے اور ان ظالموں کے علاوہ لوگ بھی تھے جو دنیا میں بڑے بڑے مجرم رہ چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بس اسی عالم بالا کو واپس جاتے ہیں لیکن بجائے اس کے کہ دہانے میں یہ داخل ہوسکیں جب ان میں سے کوئی جس کی کافی سزا نہ ہو چکی تھی چڑھنے کی کوشش کرتا اس سے ایک سخت چیخ نکلتی۔ اس پر کچھ مہیب آتشیں رو انسان جو پاس کھڑے اس آواز کو سنتے تھے انہیں پکڑ کر ساتھ لے جاتے اردیائیس اور بعض دوسروں کو تو انہوں نے سر پیر ہاتھ سب باندھ کر نیچے پھینک دیا، پھر راستے بھر انہیں خوب گھسیٹا انہیں کانٹوں پر اون کی طرح دھنکا اور راہ چلتے برابر کہتے جاتے تھے کہ انہوں نے یہ یہ جرم کئے تھے اور ہم پھر انہیں جہنم میں ڈالنے کے لئے جاتے ہیں۔ ہم نے جو بہت سی صعوبتیں اٹھائی ہیں ان میں کوئی مصیبت اس گھڑی سے کٹھن نہ تھی جب ہم یہ سوچتے تھے کہ کہیں ہمارے لئے بھی یہ آواز نہ نکلے، لیکن جب خاموشی رہی تو ہم ایک ایک کر کے خوشی خوشی اوپر چڑھ آئے بقول ار یہ تو تھے وہاں کے بدلے اور سزائیں اور پھر انعام اور برکتیں بھی ایسی ہی تھیں۔

یہ روحیں سات دن تک اسی سبزہ زار میں ٹھہری رہیں، آٹھویں دن انہیں حکم ملا کہ پھر سفر شروع کریں۔ چوتھے دن یہ ایک جگہ پہنچیں جہاں سے روشنی کی کرن دکھائی دیتی تھی، سیدھی جیسے ستون، آسمان زمین کے آر پار، رنگ میں دھنگ سے مشابہ، لیکن پاکیزہ اور روشن تر۔ ایک دن بھر اور چل کر اس جگہ پہنچ گئے یہاں اس روشنی میں انہوں نے آسمانی زنجیروں کے سرے دیکھے جو اوپر سے لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ روشنی آسمان کی پیٹی ہے اور سارے کرہ عالم کو اس طرح یکجا کئے ہوئے ہے جیسے جہاز کی کڑیاں، زنجیر کے ان سروں پر جبر و نردم کا تکلا لٹکا ہوا ہے اور اسی پر سارے چکر ہوتے ہیں۔ اس تکلے کی جڑ اور قلابے فولاد کے ہیں اور پھر کی کچھ فولاد کی اور کچھ اور دوسرے مسالے کی۔ پھر کی کی شکل وہی ہے جیسی یہاں

دنیا میں عام رواج ہے۔

ایر نے اس کا جو بیان دیا اس سے پتہ چلتا تھا کہ ایک بڑی سی پھرکی ہے جسے اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے اس کے اندر اس سے ایک ذرا چھوٹی پھرکی بٹھا دی ہے، اس کے اندر ایک اور، اسی طرح چار اور الغرض کل آٹھ پھرکیاں ہیں۔ ایسے جیسے ایک برتن کے اندر دوسرا برتن رکھ دیا ہو۔ اوپر کی طرف تو ان پھرکیوں کے سرے دکھائی دیتے ہیں لیکن نیچے سب کے سب مل کر ایک پھرکی بناتے ہیں۔ اس کے اندر سے تکلا گزرتا ہے اور آٹھویں پھرکی کو بیچ میں سے چھیدتا ہے۔ پہلی پھرکی جو سب سے باہر ہے اس کا کنارہ بھی سب سے بڑا ہے، دوسروں کے کنارے اس ترتیب سے چھوٹے ہیں، بڑائی میں چھٹی کا نمبر پہلی کے بعد ہے، چھٹی کے بعد چھوٹی کا، اس کے بعد آٹھویں، پانچویں نمبر ساتویں کا اور چھٹا نمبر پانچویں کا ہے، تیسری ساتویں نمبر پر ہے اور دوسری سب سے آخر یعنی آٹھویں نمبر پر۔ سب سے بڑی پھرکی (یعنی ثوابت) نہایت مرصع ہے۔ ساتویں (سورج) روشن ترین ہے۔ آٹھویں (چاند) ساتویں کی روشنی کے عکس سے رنگ حاصل کرتی ہے دوسری اور پانچویں (زحل اور عطارد) رنگ میں ہیں ایک دوسرے سے مشابہ ہیں ہاں اوروں کے مقابلے میں ذرا پیلے ہیں، تیسرے کی (زہرہ) روشنی سب میں سپید ہے، چوتھی (مریخ) کچھ سرخی مائل اور چھٹی (مشتری) سپیدہ میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اچھا سارے تکلے کی تو ایک ہی حرکت ہے لیکن جب یہ کل ایک طرف حرکت کرتا ہے تو اندر کے سات چکر سمت مخالفت میں آہستہ آہستہ چلنے لگتے ہیں، ان میں آٹھواں سب سے تیز چلتا ہے، اس کے بعد تیزی کے اعتبار سے ساتویں، چھٹے اور پانچویں کا نمبر ہے اور سب کے سب ساتھ ساتھ حرکت کرتے ہیں، پھر حرکت قہقری کے اس قانون کے ماتحت تیزی کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر چوتھا چکر آتا تھا، چوتھے نمبر پر تیسرا اور پانچویں پر دوسرا تکلا جبر ولزوم کے گھٹنوں پر گھومتا ہے، ہر چکر کے اوپر ایک مغنیہ ہے جو ساتھ ساتھ چکر کھاتی اور ایک ہی انداز سے ایک سر گائے جاتی ہے۔ آٹھوں مل کر ایک متناسب نغمہ مرتب کر لیتی ہیں، ان کے چاروں طرف برابر برابر فصل سے تین کا ایک اور گروہ ہے، یہ اپنے اپنے تخت پر بیٹھی ہیں۔ یہ ہیں جبر ولزوم کی بیٹیاں، قضا و قدر کی دیویاں۔ یہ سفید لباس زیب تن کئے ہیں، سر پر ہر ایک کے ایک ایک ہار ہے۔ لاچے

سس، کلوتھو اور اتروپاس ان کے نام ہیں۔ یہ اپنی آواز سے مغنیہ کی موسیقی کا ساتھ دیتی ہیں۔ لاچےسس ماضی کا ترانہ گاتی ہے، کلوتھو حال کا اور اتروپوس مستقبل کا۔ کلوتھو اپنے سیدھے ہاتھ سے کبھی کبھی تکلے کے باہر والے چکر کو ذرا گھما دیتی ہے اتروپوس الٹے ہاتھ سے اندرونی چکروں کو چھو کر ان کی رفتار سادھتی ہے، اور لاچےسس باری باری دونوں کو چھوئے رہتی ہے کبھی ایک ہاتھ سے کبھی دوسرے ہاتھ سے۔

ایر اور دوسری روحیں جب یہاں پہنچیں تو ان کا فرض تھا کہ سب سے پہلے لاچےسس کے پاس جائیں لیکن اس سے پہلے ایک پیغمبر نمودار ہوا جس نے ان سب کو ایک نظام سے مرتب کیا، پھر لاچےسس کے قدموں پر سے قسمتیں اور زندگی کے مختلف نمونے لے کر یہ ایک اونچے منبر پر چڑھ گیا اور انہیں یوں مخاطب کیا۔ سنو! جبر ولزوم کی بیٹی لاچےسس کا پیغام سنو! فانی روحو! زندگی اور موت کا ایک اور دور دیکھو۔ تمہارا فرشتہ تمہیں دیا نہ جائے گا بلکہ تم خود اپنے اپنے فرشتے کا انتخاب کرو گے۔ جو پہلے چٹھی اٹھائے گا اسی کو پہلا حق انتخاب ہوگا، پھر یہ جو زندگی چنے گا وہی اس کی قسمت ہو جائے گی۔ نیکی آزاد ہے اور بے آقا، جو اس کی جتنی عزت جتنی ذلت کرے گا اتنی ہی زیادہ یا کم اسے ملے گی، ذمہ داری انتخاب کرنے والے پر ہے اور خدا بری الذمہ ہے۔

ترجمان نے یہ کہہ کر بلا امتیاز ان میں چٹھیاں پھیلا دیں، جو چٹھی جس کے قریب تھی وہ اس نے اٹھالی، اس طرح سوائے ایر کے سب نے اٹھائیں (اسے اجازت نہ تھی) اور ہر ایک نے دیکھا کہ اسے کون سا عدد ملا ہے۔ اب ترجمان نے ان کے سامنے زمین پر زندگی کے نمونے رکھ دیئے جتنی روحیں وہاں موجود تھیں ان سے کہیں زیادہ زندگی کے نمونے تھے اور پھر ہر طرح کے جانوروں کی زندگیاں تھیں، اور ہر حالت کے انسانوں کی، ظالم استبدادی زندگیاں بھی تھیں، بعض ایسی کہ ظالم کی عمر بھر بلکہ اس سے زیادہ باقی رہیں، بعض ایسی کہ بیچ ہی میں منقطع ہو جائیں اور خاتمہ افلاس، دریوزہ گری اور جلاوطنی میں ہو۔ پھر سورماؤں کی زندگیاں تھیں، ایسوں کی جو اپنی شکل وصورت اور حسن نیز طاقت اور کھیلوں میں کامیابی کے لئے مشہور تھے، بعض ایسوں کی جو حسب ونسب اور اجداد کی خوبیوں کے باعث ممتاز تھے، کچھ زندگیاں ایسوں کی بھی تھیں جو ان سے بالکل برعکس صفتوں کے باعث

بدنام تھیں۔ عورتوں کی زندگیاں بھی تھیں، لیکن ان روحوں کی سیرت متعین نہ تھی کیونکہ جب روح نئی زندگی اختیار کرتی ہے تو لازمی ہے وہ بالکل بدل جائے لیکن اور ساری صفتیں موجود تھیں سب کی سب ایک دوسرے میں گڈمڈ دولت اور افلاس، صحت اور مرض کے عناصر کی بھی آمیزش تھی، علاوہ بریں دوسری ذیلی کیفیتیں بھی موجود تھیں۔

میرے عزیز گلاکن! یہاں ہے حیات انسانی کا خطرہ عظیم اور یہیں حد درجہ احتیاط درکار ہے۔ ہر ایک کو چاہیے کہ اور تمام علوم کو بالائے طاق رکھ کر بس اس ایک چیز کی طلب و جستجو میں لگ جائے۔ کیا عجب کہ ہم نیک و بد میں تمیز کرنا سیکھ جائیں یا ہمیں کوئی شخص مل جائے جو یہ چیز سکھا سکے تا کہ کب بھی اور جہاں کہیں موقع ملے ہم بہتر زندگی منتخب کر سکیں۔ اس کے اسباب پر دھیان رکھنا چاہیے یہ جو چیزیں ہم نے اوپر بیان کیں ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ اور پھر سب مل کر نیکی پر کیا اثر ڈالتی ہیں، اسے جاننا ہوگا کہ کسی خاص روح میں اگر صورت کے حسن کو دولت سے یا افلاس سے ملا دیں تو اس کا کیا اثر ہوگا اچھے یا برے حسب نسب، خانگی یا سرکاری عہدے، طاقت یا کمزوری، چالاکی اور کند ذہنی، روح کی ساری فطری صفتیں اور ان کے باہمی عمل، ان سب کے اچھے برے نتیجوں سے اسے آگاہ ہونا چاہیے۔ تب کہیں یہ روح کی ماہیت کو دیکھ کر اور ان تمام باتوں پر نظر کر کے بتلا سکے گا کہ کون سی زندگی بہتر ہے اور کون سی نہیں اور اس طرح انتخاب کرے گا کہ جو زندگی روح کو زیادہ ناانصاف بنائے وہ بری اور جو اسے زیادہ منصف بنائے وہ اچھی۔ باقی دوسری باتوں کو یہ بالکل نظر انداز کر دے گا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ زندگی اور موت دونوں میں یہی بہتر انتخاب ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے ساتھ عالم زیریں میں بھی حق اور صداقت پر ایسا ایمان ساتھ لے جائے جو کبھی نہ ڈگمگائے، تا کہ وہاں بھی دولت کی آرزو اور باطل کے فریب اس کی نگاہ کو خیرہ نہ کر سکیں، اور یہ نہ ہو کہ ظلم اور استبداد اور دوسری بداطواری کی زندگی کو دیکھ کر یہ دوسروں کو ناقابل تلافی اذیت پہنچائے اور خود اپنی ذات کو اس سے بھی بڑی مضرت دینے کا باعث بنے۔ اسے جاننا چاہیے کہ اسی زندگی میں نہیں بلکہ اس کے بعد کے تمام مراحل میں بھی جہاں تک بن پڑے دونوں طرف کے انتہائی سروں کو چھوڑ کر درمیان کی راہ کس طرح اپنے لئے منتخب کرے کہ یہی سعادت وشادمانی کی راہ ہے۔

دوسرے عالم کے اس خبر دینے والے نے پھر بیان کیا کہ اس موقع پر اس پیغمبر نے یہ اور کہا "بالکل آخر میں آنے والے کے لئے بھی اگر وہ سمجھ بوجھ کر انتخاب کرے اور محنت سے زندگی گزارے تو ایک مسرت بخش اور خاصی پسندیدہ زندگی مقرر ہے جو سب سے پہلے انتخاب کرتا ہے یہ نہ ہو کہ وہ بے پروا ہو جائے اور جو سب سے آخر میں ہے اسے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ جب کہہ چکا تو جسے سب سے پہلا حق انتخاب ملا تھا وہ آگے بڑھا اور دیکھتے دیکھتے اس نے سب سے بڑے ظلم اور استبداد کو اپنے لئے چن لیا۔ اس کا دماغ چونکہ حماقت اور حرص سے تاریک ہو چکا تھا اس نے چناؤ سے پہلے سارے معاملے پر غور نہیں کیا اور پہلی نظر میں یہ بات اسے نہ سجھائی دی کہ منجملہ دیگر برائیوں کے اس کی قسمت میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ اپنی اولاد کو خود نگل جائے گا۔ لیکن جب ذرا غور کرنے کا موقع ملا اور اس نے دیکھا کہ اس کی قسمت میں کیا کیا آیا تو لگا چھاتی پیٹنے اور اپنے انتخاب پر رونے دھونے اور پیغمبر کے سابقہ اعلان کو بھول گیا اور بجائے اس کے کہ اپنی بدنصیبی کا الزام خود اپنے آپ کو دینے لگا بخت و اتفاق اور دیوتاؤں کو ذمہ دار ٹھہرانے لگا۔ غرض ہر ایک ملزم تھا بس یہی ایک بے قصور تھا جیسے۔

سنو! یہ ان لوگوں میں سے تھا جو آسمان سے آئے تھے، سابقہ زندگی میں یہ ایک نہایت عمدہ منتظم ریاست رہ چکا تھا، لیکن اس کی نیکی خالی عادت پر مبنی تھی، اس کے پاس کوئی فلسفہ نہ تھا۔ یہی حال اوروں کا تھا جن پر اسی قسم کی افتاد پڑی یعنی ان میں سے اکثر آسمان سے آئے تھے، امتحان و آزمائش سے ان کی تعلیم نہیں ہوئی تھی ہاں زمین سے آنے والے چونکہ تکلیفیں جھیل چکے تھے، اور دوسروں کو تکلیفیں اٹھاتے بھی دیکھ چکے تھے اس لئے انہیں انتخاب کرنے کی جلدی نہ تھی۔ کچھ تو اس ناتجربہ کاری کے باعث کچھ اس سبب سے کہ چٹھیوں کا نکلنا کچھ اتفاق پر منحصر تھا، بہت سی روحوں نے بری کے بدلے اچھی اور بہتوں نے اچھی کے بجائے بری قسمت پائی۔

ہمارے قاصد کا بیان ہے کہ اگر اس دنیا میں آنے کے بعد انسان اپنے آپ کو تمام تر سچے فلسفے کے لئے وقف کر دے اور پھر چٹھی نکلنے کے معاملے میں بھی معمولی سا خوش قسمت ہو تو وہ یہاں خوش رہے اور دوسری زندگی میں اس کا سفر اور پھر وہاں سے دوبارہ ایسی دشوار گزار اور زیر زندگی راستوں سے نہ ہو بلکہ نہایت ہموار آسمانی راہوں سے۔ یہ کہتا تھا کہ یہ

منظر بھی نہایت حیرت انگیز اور عجیب تھا ایک ہنسی تھی اور ایک دکھ۔ اکثر روحوں کا انتخاب پچھلی زندگی کے تجربوں پر مبنی تھا۔ مثلاً اس نے یہاں وہ روح دیکھی جو کبھی ارفیس تھی، اسے چونکہ عورتوں نے قتل کیا تھا اس لئے یہ عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے کے خیال سے بھی نفرت کرتا تھا اور عورتوں کی ساری نسل سے اس عداوت کے باعث اس نے ہنس (پرندے) کی زندگی انتخاب کی۔ اس نے ھاتمرس کی روح کو بھی بلبل کی زندگی منتخب کرتے دیکھا۔ برخلاف اس کے چڑیاں مثلاً ہنس اور دوسرے گانے والے پرندے انسان بننا چاہتے تھے۔ جس روح کو بیسواں عدد ملا تھا اس نے شیر کی زندگی پسند کی، یہ اجاکس بن تلامون کی روح تھی جو اس لئے انسان بننا چاہتی تھی کہ ہتھیاروں کے معاملے میں اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی تھی۔ اس کے بعد ''اگمنان'' کی باری تھی۔ اس نے عقاب کی زندگی اختیار کی کیونکہ ''اجاکس'' کی طرح اپنی مصیبتوں کا خیال کرکے یہ بھی انسانی فطرت سے نفرت کرتا تھا۔ بیچ میں اتلانٹا کا نمبر آیا اس نے ایک کھلاڑی پہلوان کی شہرت دیکھی تو اس لالچ کا مقابلہ نہ کرسکی اس کے بعد پنوپیں کے بیٹے اپیسیس نے ایک مکار حرافہ عورت کی زندگی اختیار کی۔ آخر میں انتخاب کرنے والوں میں کہیں دور مسخرہ تھرتیٹیس بھی تھا، اس نے بندر کی شکل قبول کرلی۔ اب اوڈیسیس کی روح آئی کہ اس کا نمبر آخری تھا اور اسے ابھی اپنے لئے انتخاب کرنا تھا۔ پچھلی مشقوں کی یاد نے اس کے حوصلے کو پست کردیا تھا، یہ بڑی دیر تک ادھر ادھر ایک خانگی آدمی کی زندگی ڈھونڈتا پھرا جسے کوئی غم اور فکر نہ ہو۔ اس کے ملنے میں ذرا دشواری ہوئی، یہ کہیں ایک طرف پڑی تھی اور سبھوں نے اس کا ذرا خیال نہ کیا تھا۔ یہ جو اس زندگی کو دیکھ پایا تو بولا کہ اگر مجھے بجائے آخری جگہ انتخاب کا پہلا حق ملتا تو بھی میں اس زندگی کو منتخب کرتا، اور اسے پاکر وہ واقعی بڑا خوش تھا۔

یہی نہیں کہ آدمی ہی جانوروں کی زندگیاں اختیار کرتے تھے، میں یہ بھی ضرور کہہ دوں کہ جنگلی اور پالتو جانور آپس میں بھی اپنی زندگیاں بدل رہے تھے اور اپنی طبیعت کی مناسبت سے انسانی زندگیاں بھی اختیار کرتے تھے، مثلاً اچھے نرم مزاج بھلے مانسوں کی زندگی اور برے وحشیوں کی، غرض طرح طرح اور ہر ممکن طریقے سے۔ اب جب سب روحیں اپنی اپنی زندگی منتخب کرچکیں انتخاب کی ترتیب سے لاچسس کے سامنے پہنچیں اس

نے ان کے ساتھ وہ فرشتہ کر دیا جو ہر ایک نے منتخب کیا تھا تا کہ وہ ان کی زندگی کا نگہبان رہے اور ان کے انتخاب کو پورا کرے۔ یہ فرشتہ پہلے تو انہیں کلوتھو کے روبرو لے گیا اور یہ اپنے ہاتھ سے جس تکلے کو چلا رہی تھی اس میں رکھ کر انہیں چکرایا اور اس طرح گویا ہر ایک کی قسمت کی تصدیق ہو گئی پھر خود تکلے کو چھو کر یہ انہیں اترو پوس کے پاس لے گیا جو (قسمت کے) ڈورے کاٹ رہی تھی تا کہ یہ ناقابل تغیر ہو جائے۔ یہاں سے یہ بغیر منہ پھیرے جبر ولزوم کے تخت کے تلے سے گزرے، جب سب اس کے نیچے سے نکل گئے تو خود فراموشی کے جلتے تپتے میدان میں پہنچے، یہ ایک چٹیل میدان تھا جس میں نہ درخت کا پتہ تھا نہ سبزے کا نام ونشان۔ شام ہوتے ہوتے دریائے تغافل کے کنارے پڑاؤ کیا۔ اس دریا کا پانی کسی برتن میں نہ سماتا تھا، ہر ایک کو مجبور کیا گیا کہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی پیئں، جنہیں عقل نے نہیں سنبھالا، وہ ضرورت سے زیادہ پانی پی گئے۔ اس کے پیتے ہی سب کے سب ساری باتیں بھول گئے۔ پھر سب پڑے سوتے تھے کہ آدھی رات کو برق و باد کا طوفان اور زلزلہ شروع ہوا اور جیسے ٹوٹے ہوئے تارے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں یہ بھی دیکھتے دیکھتے مختلف راستوں سے اپنی جائے ولادت تک پہنچا دیئے گئے۔ ہمارے قاصد کو یہ پانی البتہ نہیں پینے دیا گیا لیکن یہ کیونکر اور کس طرح پھر جسم میں واپس آیا اس بات کا خود اسے پتہ نہیں، صبح جو یک بیک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ تابوت پر لیٹا ہے۔

اور یوں میاں گلاکن یہ قصہ باقی رہ گیا فنا نہیں ہوا۔ اب اگر ہم بھی قول کے تابع رہیں تو یہ ہمیں بھی بچا لے اور ہم اطمینان سے اپنی روح کو آلودہ کئے بغیر تغافل کے دریا میں سے گزر جائیں۔ لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ ہم ہمیشہ اس آسمانی راہ پر ثابت قدم رہیں۔ ہمیشہ عدل اور خیر کا تتبع کریں، اور یقین رکھیں کہ روح غیر فانی ہے اور ہر طرح کی اچھائی نیز ہر طرح کی برائی برداشت کر سکتی ہے۔ یوں ہم ایک دوسرے کی نظر میں بھی عزیز اور محترم رہیں گے اور دیوتاؤں کی نگاہ میں بھی، جب تک یہاں ہیں تو یہاں اور اس وقت بھی جب انعام لینے کے لئے ہم ان کے کھیل میں بازی جیتنے والوں کی طرح جائیں گے جو تحفے وصول کرنے کے لئے چکر لگاتے ہیں۔ اس سے اس زندگی میں بھی ہمارا بھلا ہوگا اور اس ہزار سالہ سفر میں بھی جسے ہم ابھی بیان کر رہے تھے۔"

افلاطون کا فلسفہِ کمیونزم

یونان میں تصور مملکت

قدیم دور میں ایتھنز میں ذاتی املاک، کانوں اور جنگلات وغیرہ پر حکومتی تسلط قائم تھا۔ زمین مشترکہ ملکیت تصور کی جاتی تھی اور اس پر مختلف قبائل اور گروہ قابض ہوتے تھے۔ سپارٹا میں اگرچہ ذاتی ملکیت کا رواج تھا لیکن ایسی اراضی جسے مزارع کاشت کرتے تھے قومی ملکیت تصور ہوتی تھی اور اس کی پیداوار پر تمام شہریوں کا حق ہوتا تھا۔ کریٹ میں عوامی زمینوں کو مزارع کاشت کرتے تھے اور ان کا مالیہ حکومت کے ہونے والے متفرق اخراجات پر صرف کیا جاتا تھا۔ اس طرح افلاطون کے دور میں لوگ املاک کی کمیونزم سے آگاہ تھے۔ افلاطون نے بھی فیثا غورثی مقولہ ''دوست کا مال اپنا ہی مال ہے'' کے تحت ''الجمہوریہ'' میں اپنے نظریات پیش کئے جس کی بناء پر اسے سیاسی فلسفے کی تاریخ میں دنیا کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا اشتراکیت پسند کہا گیا ہے۔

افلاطون کا نظریہ کمیونزم

افلاطون کے نزدیک حکمران طبقہ ادراک اور فوجی جذبہ مدافعت کے نشان ہیں اس لئے حکمران کے طبقہ کا کام صرف ریاست کی بھلائی اور فوجی کا کام صرف اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے خلاف نبرد آزمائی کرنا ہے۔ لہٰذا ان طبقوں کو مزدور طبقہ اشتہا کے جذبات سے پاک رہنا چاہیے اور یہ کمیونزم کے باعث ہی ممکن ہے۔ اس کے خیال میں کمیونزم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ حکمران طبقہ کو ریاست کا محافظ بنا دیتی ہے اور وہ خود کو ریاست کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اس کے خیال میں سیاسی طاقت اور اقتصادیات کا ایک شخص کے ہاتھ میں آ جانا دیانت داری اور قوت عمل کے لئے نقصان دہ ہے۔ لہٰذا حکمرانوں کو سونے چاندی سے محروم رکھنا چاہیے۔ اس کے نزدیک حکمرانوں میں پیدا ہونے والی بے راہروی کا سبب سیاسی اور اقتصادی قوتوں کا یکجا ہونا ہے۔ سیاسی قوت کا مالک معاشی ضروریات و

مفادات کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور دانائی کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

اشتراکیت

افلاطون کے نزدیک کمیونزم صرف دو طبقات تک محدود ہونا چاہیے جبکہ تیسرا طبقہ اس پابندی سے مستثنیٰ ہے اور اپنی ذاتی املاک رکھ سکتا ہے۔ بارکر کے مطابق افلاطونی اشتراکیت ایسا نظام ہے جو معاشرے کے اقتصادی ڈھانچہ کو متاثر نہیں کرتا بلکہ انفرادیت پسندانہ نظام پیداوار کو باقی رکھتا ہے اور کسی بھی کاشتکار کو متاثر نہیں کرتا۔ حکمران طبقہ اپنی جائیداد نہیں رکھ سکتا۔ ان کے مکافات بھی نہیں ہوتے اور وہ کھلی بیرکوں میں رہتے ہیں۔ زر، زن، زمین اور گھر کے بغیر محافظ طبقہ کو رہنا ہوتا ہے اور کاشتکاروں کی طرف سے فراہم کردہ اجناس پر گزر کرنی ہوتی ہے۔

املاک کا تصور

افلاطون الجمہوریہ میں دو قسم کی املاک اور ازدواج کی کمیونزم کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ محافظ طبقہ صرف اتنی ہی جائیداد رکھ سکے گا جو کہ ازبس ضروری ہے اور فالتو املاک سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ نہ تو ان کا ذاتی مکان ہوگا اور نہ ہی کوئی ایسی جائے قیام جس میں داخلہ کے لئے اس کی اجازت درکار ہو۔ اس کی رہائش ایسی ہونی چاہیے جیسے تجربہ کار جنگجو لوگوں کی جن میں بردباری اور جرات دونوں ساتھ ساتھ ہوں۔

ٹیکس

انہیں رعایا سے ٹیکس صرف اتنا ٹیکس لینا ہوگا جو پورے سال کے اخراجات کے لئے کافی ہو۔ حکمران اور عوام میں یکساں معاشرت ومعیشت انہیں اکٹھا ایک ہی میز پر مل کر کھانا ہوگا اور خیمہ نما رہائش گاہ میں سپاہیوں کی طرح رہنا ہوگا وہ سونا چاندی کو ہاتھ نہیں لگائیں گے اور نہ ہی ایسی جگہ جائیں گے جہاں سونا چاندی ہو نہ ہی ان دھاتوں کو استعمال کریں گے اور نہ ہی ان کے بنے ہوئے برتنوں میں کھائیں پئیں گے۔ ان ہی باتوں میں ان کی فلاح ہے اور وہ اسی طرح رہ کر سیاست کی فلاح کا باعث بن سکتے ہیں اور اگر کبھی بھی انہوں نے

مکان، زمین یا زر کے حصول کی کوشش کی تو پھر وہ ریاست کے محافظ نہ رہیں گے بلکہ گھروں کے محافظ اور کنبے کے چوکیدار بن جائیں گے وہ شہریوں کے معاون و مددگار نہ رہیں گے بلکہ ان کے لئے دشمن ثابت ہوں گے۔

اشتمالیت ازواج

افلاطون اشتمالیت املاک کے ساتھ ساتھ اشتمالیت ازواج کے نفاذ کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ عورتوں میں مردوں جیسی تعلیم، حکمرانوں کا گھریلو زندگی سے آزاد رہنا اور حکومت کی سرپرستی میں عارضی شادی کے تصورات افلاطون سے قبل یونان میں رائج تھے۔ یہ تصور اس دور کے ہیلنی نظام اور عصری ادب میں موجود تھا۔ ہیروڈوٹس کے مطابق اگاتھانستین (Agatnysiane) اپنی عورتیں مشترک رکھتے تھے تاکہ وہ ایک دوسرے سے رشک و حسد کے جذبات نہ رکھیں۔

سورماتی عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر شکار کھیلتی تھیں اور جنگ میں برابر حصہ لیتی تھیں۔ سپارٹا میں شوہر اپنی بیوی کو اولاد اور ریاست کی بہبود کی خاطر عارینتاً دوسرے کے سپرد کر دیتا تھا۔ یونانی لڑکیوں کی شادی اوائل عمر میں ہو جاتی تھی اور وہ تقریباً پندرہ سال کی عمر میں شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ ساتھ دوسرے مردوں سے بھی تعلقات قائم رکھتی تھیں، شادی کوئی عہد مقدس نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد ریاست کے لیے جائز اولاد پیدا کرنا تھا۔ بارکر کے مطابق ان تصورات کا کچھ حصہ افلاطون نے اپنایا اور کچھ کی مخالفت کی۔ اس کے نزدیک شادی کوئی مقدس عہد نہیں تھا لیکن وہ عصری یونان کی اس روایت کے بھی خلاف تھا کہ عورتوں کو عزلت نشینی اور خلوت کے لیے مجبور کیا جائے۔ وہ گھریلو زندگی کو خودغرضی کی آماجگاہ اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا اور اسی باعث وہ خاندان کو ریاست میں مدغم کرنا چاہتا تھا۔

افلاطون کے نزدیک عورتوں کو نظر انداز کرنا ریاست کی آدھی آبادی کو ریاستی کاموں سے مستثنیٰ کرنا ہے۔ عورت اور مرد میں بلحاظ انسان کوئی فرق نہیں ہے۔ اگرچہ صلاحیتوں کے لحاظ سے عورت مرد سے کمزور ہے مگر پھر بھی کچھ عورتیں ذہنی طور پر مردوں کے ساتھ مل کر

حکمرانی کے فرائض سرانجام سے سکتی ہیں۔ایسی ہی عورتوں کو مردوں جیسی تربیت دے کر حکمرانوں کے دوش بدوش حکمرانی کا کام سونپنا چاہیے، وہ انتظامی اور فوجی دونوں شعبوں میں کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔محنتی کاموں کے لیے عورت کو چالیس سال کی عمر میں اور مردوں کو تیس سال کی عمر میں کام کرنا چاہیے اور فوجی شعبہ میں مرد کو بیس سال سے ساٹھ سال تک اور عورت کو بچے پیدا کر لینے کے بعد کی مدت سے پچاس سال کی عمر تک کام کرنا چاہیے۔قوانین میں اس نے ایسی ہی دس نرسوں اور دس قانون محافظ عورتوں کا ذکر کیا ہے۔

نسلوں کی نگہداشت

افلاطون نے اپنے فلسفہ اشتراکیت سے ذریعے جس طرح حکمرانوں اور فوجی طبقوں کی توجہ ذاتی جائداد کی ذاتی مفاد کے بجائے اجتماعی مفاد پر مرکوز کی ہے اسی طرح خاندانی اشتراکیت کے ذریعے حکمرانوں اور فوجی افسران کی توجہ اپنی ذاتی اولاد سے ہٹا کر قوم کے مشترکہ بچوں کی تعلیم وتربیت اور بھلائی پر مرکوز کی ہے۔افلاطون کے مطابق جس طرح حکمرانوں اور فوجی وسول افسران کو اگر ذاتی جائداد اور دولت رکھنے کی اجازت دی جائے تو ان کی توجہ قومی یا عوامی مفاد کے کاموں سے ہٹ جائے گی اور وہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے ذاتی مفاد کو قومی یا اجتماعی مفادات پر ترجیح دینے لگ جائیں گے بالکل اسی طرح مال ودولت کی طرح ہر انسان کے دل میں اپنی ذاتی اولاد کی بہت محبت ہوتی ہے اور ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی اولاد چاہے بڑے عہدے یا اعلیٰ منصب کے لئے اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے لحاظ سے اہل ہو یا نہیں اسے ضرور کوئی بڑا عہدہ یا اعلیٰ منصب مل جائے۔اسی طرح حکمران طبقہ اور سول فوجی افسران ضرور یہ کوشش کریں گے کہ چاہے ان کے بچے ذہنی وجسمانی صلاحیتوں کے لحاظ سے ریاست کی حکومت کے کسی اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے اہل ہیں یا نہیں انہیں ہر حالت میں بڑے عہدوں اور اعلیٰ مناصب پر فائز ہونا چاہیے۔اس طرح چھوٹے طبقے کے ذہین اور قابل بچوں کی حق تلفی ہونے کا بہت زیادہ امکان ہے۔لہٰذا ایسی غیر اخلاقی اور غیر منصفانہ کاروائیوں کو روکنے کے لیے خیالی ریاست میں بچوں کی ابتدائی نگہداشت کے لیے نرسریوں کا سسٹم متعارف کروایا گیا جن میں

ریاست کی حکومت کی طرف سے مقرر یا تعینات شدہ تربیت یافتہ نرسیں اور دوسرا ضروری عملہ بچوں کی پرورش کرے گا اور نرسریوں کا انتظام ایسا خفیہ اور سخت ہوگا کہ اصل والدین کو اپنے بچوں کی اور بچوں کو اپنے ماں باپ کی پہچان نہ ہونے دی جائے گی چونکہ والدین کو اپنے اصلی بچوں کی پہچان نہیں ہوگی لہٰذا نرسری میں پرورش پانے والے ہر شخص ہر بچے یا بچی کو اپنا ذاتی بچہ یا بچی سمجھنے پر مجبور ہوگا اور ریاست کی طرف سے قائم شدہ سکولوں میں داخل ہونے پر انہیں اپنی فطری ذہنی وجسمانی صلاحیت کے مظاہرے کے یکساں مواقع میسر ہوں گے۔

شادی کے بارے میں افلاطون کا نامکمل نظریہ

افلاطون کے نزدیک شادی ایک سنجیدہ اور مخصوص جنسی تعلق کی منفرد اور پاکیزہ صورت ہے جس کا مقصد نسل بڑھانا ہے۔ عارضی شادیوں کی تعداد کا انحصار شہری ریاست کے تناسب آبادی پر ہوگا۔ نہ والدین اپنے بچوں سے واقف ہونگے اور نہ ہی بچے اپنے والدین کو جانتے ہونگے۔ اس طرح سارا حکمران طبقہ ایک ہی کنبہ بن جائیگا اور ریاست ہی اس کا گھر ہوگا اور وہ ریاست کے رہنے والوں کے غم اور خوشی سے مساوی طور پر متاثر ہوگا۔

افلاطون کے نزدیک محافظ مرد اور عورتوں کے بیرکس میں اکھٹے رہنے سے ان کے درمیان جنسی تعلقات قائم ہونگے اور افزائش نسل کے نظریہ سے بہترین اولاد جنم لے سکے گی۔ اس کے خیال میں اگر یہ بات گھوڑوں کی نسل، محافظ کتوں کی نسل یا شکاری پرندوں کی نسل کے لیے درست ہے تو انسانوں کے لیے بھی ایسے ہی درست ہے۔ حکمران طبقہ میں سے صحت مند اور عالی دماغ مرد وعورت کو مناسب عمر میں اور مناسب موسم میں عارضی شادی کر لینی چاہیے اور ان کی اولاد کی پرورش حکومت کا کام ہوگا۔

افلاطون کے نزدیک نہ کنبہ ہوگا اور نہ ہی حکمران ذاتی مفاد اور ریاستی مفاد میں ٹکراؤ پیدا ہونے دے گا۔ اس کے خیال میں ہر سال مناسب موسم میں عارضی جنسی تعلقات سے جو اولاد ہوگی ان کے کوائف مخفی رکھے جائینگے۔ ایک موسم میں جتنے جوڑے شادی کریں گے انہیں اولاد کی پیدائش پر بتا دیا جائے گا کہ ان کی اولاد ہوگئی ہے اور یہ اولاد سب کی اولاد ہے اور اولاد کو بھی سکھایا جائے گا کہ تم سب آپس میں بھائی بھائی بہن ہو یا بھائی بہن ہو یا بہن بہن

ہو۔اس طرح تمام حکمران خود کو ایک ہی کنبہ تصور کریں گے جس سے اتحاد پیدا ہوگا۔
افلاطون کے نزدیک بہترین محافظ عورت و مرد کو جنسی تعلقات قائم کر لینے چاہئیں اور پھر اولاد کی پرورش اعلیٰ درجہ پر ہونی چاہیے ایسی اولاد یقیناً عمدہ ذہنی و جسمانی خوبیوں سے مالا مال ہوگی۔اس کے خیال میں اچھی نسل اچھے والدین سے جنم لیتی ہے بشرطیکہ والدین بلوغت اور جوانی کی حالت میں ہوں۔شادی کے وقت عورت کی عمر بیس سے چالیس سال تک اور مرد کی عمر پچیس سے پچپن سال تک ہونی چاہیے۔اس کے خیال میں ان عمروں کے علاوہ کسی بھی عمر میں کوئی اولاد کسی والدین سے ہو جائے تو وہ اولاد موت کے گھاٹ اتار دی جائے۔

نظریہ افلاطون پر تنقید

نظریہ افلاطون پر تنقید بارکر کے مطابق افلاطون کی زاہدانہ اشتمالیت کو اشرافیانہ کہا جاسکتا ہے۔یہ سپر اندازی کا ایک طریقہ ہے اور یہ سپر انداز صرف اصلاح پر لاگو ہوتی ہے۔اشتمالیت تمام معاشرہ کی خاطر وجود پذیر ہے لیکن تمام معاشرہ کی بجائے یہ صرف حکمران طبقہ میں موجود پذیر ہے۔لہٰذا اسے معاشی کمیونزم کی بجائے سیاسی کمیونزم کہنا چاہیے۔جس کا مقصد تربیت یافتہ اور پیشہ ور حکومت ہے جسے باقاعدہ ٹیکس کی مراعات حاصل ہوں۔نیٹر ووپ کے مطابق افلاطونی کمیونزم نصف کمیونزم ہے۔کیونکہ یہ سارے معاشرے پر لاگو نہیں ہوتی ارسطو نے افلاطون اشتمالیت املاک پر زبردست تنقید کرتے ہوئے درج ذیل اعتراضات اٹھائے ہیں۔

1۔اشتمالیت انسانی نفسیات کے بنیادی اصولوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔
2۔معاشرہ کے تیسرے طبقہ (مزدور پیشہ طبقہ) کو نظر انداز کر دیتی ہے۔
3۔اس اشتمالیت سے سخاوت مہمان نوازی اور احسان کے جذبے ختم ہو جائیں گے۔
4۔یہ ریاست کی انتہائی یکجہتی کی حامی ہے۔
5۔ریاستی یگانگت اعلیٰ تعلیم سے پیدا کرنی چاہیے نہ کمیونزم سے۔کمیونزم سے بے جان یگانگت پیدا ہوتی ہے۔
7۔اشتمالیت کے دور میں ریاست کو دو طبقات میں تقسیم کر دینا ریاستی یکجہتی کے منافی ہے۔

8۔اشتمالیت میں مشترکہ غفلت کی وجہ سے انتہائی، کم رفتاری اور کم پیداواری جنم لیتی ہے اور افلاطون نے اشتمالیت پیش کر کے روحانی عوارض کے لیے مادی علاج تجویز کیا ہے۔

9۔اشتمالیت نے فرد کو ریاست کی قربان گاہ پر قربان کر دیا ہے۔

افلاطونی اشتمالیت ازواج پر ارسطو تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

ا۔ریاست میں یک جہتی پیدا کرنے کی بجائے اشتمالیت ازواج ریاستی انتشار اور افتراق کا باعث ہے۔

۲۔ایسے معاشرتی نظام میں جہاں اشتمالیت کی بدولت ہر آدمی دوسروں کی ذمہ داری سے بے گانہ ہو اور دوسرے اس کی ذمہ داری سے بے گانے ہوں تو پھر مشترکہ اولاد کی حفاظت اور پرورش کا خیال کون کرے گا۔

۳۔اشتمالیت ازواج سے خدشہ ہے کہ کوئی شخص قریب ترین عزیز سے ہی جنسی ملاپ نہ کر بیٹھے۔کیونکہ کئی رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو تقدیس کا نمونہ ہوتے ہیں اور ان کی حرمت مسلم ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو اشتمالیت کا نظام غیر شائستگی کا نمونہ ہے۔

۴۔ازواج کو جانوروں کی دنیا سے مشابہ قرار دیکر تشبیہات کا سہارا لینا اور اپنے دلائل ثابت کرنا مضحکہ خیز ہے۔

۵۔ریاستی انتظام کے زیر عمل ہونے والے جنسی ملاپ سے ضروری نہیں کہ عمدہ اور بہترین اولاد پیدا ہو اور صرف طاقتور ترین جوڑے ہی ملاپ کریں۔

۶۔اس اشتمالیت سے حکمران طبقہ خوش نہیں رہ سکتا۔

۷۔اشتمالیت املاک کی طرح اشتمالیت ازواج بھی آبادی کے اکثریتی طبقہ پر لاگو نہیں ہوتی۔بلکہ صرف حکمرانوں اور فوجی طبقہ پر لاگو ہوتی ہے اور اس طرح آبادی کا بڑا حصہ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۸۔عورتوں کی آزادی سے گھریلو زندگی درہم برہم ہو جائے گی۔

۹۔اشتمالیت ازواج سے راست روی کا جذبہ ختم ہو جائے گا جبکہ راست روی بہترین کردار کی ضامن ہے۔

۱۰۔ریاست کو ایک خاندان بنانے کے خیال میں افلاطون اتنی دور نکل گیا ہے کہ اس نے ریاست کی خود مختاری کو فراموش کر دیا ہے۔

افلاطون کا فلسفۂ اخلاقیات

اخلاقیات کے حوالے سے سوفسطائیوں کا نظریہ یہ تھا کہ ''فرد کا ذاتی یا شخصی مفاد ہی انسانی اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ اخلاق بذات خود ایک مقصد نہیں بلکہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد کسی فرد کا ذاتی مفاد یا ذاتی خوشی ہے۔'' سقراط کا نظریہ یہ تھا کہ ''بنیادی طور پر نیکی ایک علم ہے اور ایک ایسا عالم یا دانا جو نیکی کا فہم وشعور رکھنے کے باوجود نیک یا درست عمل کرنے سے گریزاں ہے وہ اس بے علم یا نادان سے پھر بھی بہتر ہے جسے نیکی کا فہم وشعور تک نہیں۔''

نیکی سچائی ہے

افلاطون نے اخلاقیات کے بارے میں سقراط کے خیال کی تائید وحمایت کرتے ہوئے کہا کہ ''اخلاقیات کسی فرد کے ذاتی مفاد کے پیش نظر قائم ہونے والے ذاتی تاثر یا ذاتی رائے سے ہٹ کر ایک الگ حیثیت کی حامل سچائی ہے اور نیکی یا اخلاق کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ بذات خود ایک مقصد ہے اور نیکی اور اخلاق کا حصول ہی انسانی زندگی کا نصب العین ہے ہمیں نیک اور اچھا کام صرف اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ نیکی اور اچھائی کا کام ہے۔ اصل نیکی اس درست عمل کا نام ہے جس کی بنیاد یا جس کا محرک نیکی کا وہ فہم ہو جس کی بنیاد عقلی استدال پر ہو۔ روائتی یا رسمی نیکی کے اعمال اس صورت میں اچھے ہوسکتے ہیں جب ان کے ماخذ عقلی اور اخلاقی استدلال ہو ورنہ ان کی حیثیت ضمنی نیکی جیسی ہوگی۔

نیکی میں دکھاوا

افلاطون کے نزدیک کچھ لوگ دوسروں کو دیکھ کر نیک یا اچھا کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ

نیکی کے نقال اور معمولی درجے کے ایماندار ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں جیسی ہے کہ ان دونوں کی صفت یہ ہے کہ وہ اس انداز میں اپنا کام کرتی ہیں کہ وہ واقعی عقلمند نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت وہ کام کی اہمیت سے پوری طرح واقف نہیں ہوتیں۔

نیکی کا اثر خوشی ہے

افلاطون کے نزدیک نیکی کا اثر اور نتیجہ خوشی ہے لیکن یہ وہ خوشی نہیں جو ایک بے ایمان شخص کو کسی کا استحصال کر کے یا کسی کو دھوکے سے لوٹ کر یا اپنی طاقت کے باعث کسی کمزور سے اس کا حق چھین کر حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ وہ خوشی ہے جو ایک اچھے انسان کو کسی کمزور یا مظلوم کی مدد کر کے یا حق بات کے لیے جان و مال کی قربانی دے کر حاصل ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک اچھے کاموں سے حاصل ہونے والی خوشی سچی اور حقیقی ہے جبکہ برے کاموں سے حاصل ہونے والی خوشی منافقانہ لذت ہے۔

نظریہ نیکی کے 4 عناصر

افلاطون کا نظریہ نیکی چار عناصر پر مشتمل ہے۔

1۔ سب سے اہم آفاقی تصور کا علم ہے جو بذات خود فلسفہ ہے۔

2۔ دنیاوی چیزوں کی وضاحت کرنے والے آفاقی تصورات پر غور خوض۔

3۔ تمام اعلیٰ درجے کی علوم و فنون کی ترویج۔

4۔ پاکیزہ اور معصوم انداز میں دنیاوی خوشیوں میں شرکت۔

متذکرہ چار عناصر میں پہلے تین حصے انسانی روح کے اچھے حصوں سے مماثل ہیں جبکہ چوتھا عنصر پہلے تین عناصر کو متحد کرتا ہے۔ پہلے تین عناصر دانائی، بہادری اور اعتدال ہیں جبکہ چوتھا عنصر جوان کو متحد کرتا ہے انصاف ہے۔

اچھا انسان وہ ہے جو بھلائی کرے

زیلر (Zeller) کہتا ہے کہ افلاطون کے نزدیک برائی کرنا کبھی اچھا عمل نہیں رہا اور اس کے

نزدیک اچھا انسان وہ ہے جو اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی بھلائی کرتا ہے۔افلاطون کے خیال میں انسان کے اعمال کا ہر پہلو اہمیت کا حامل ہے اور ان اعمال کا امتزاج ہی سماجی نیکی کی اصل بنیاد ہے۔ان نظریات میں افلاطون نے اگرچہ نیکی کو معلوم کرنے کے اس ذریعے یا اصول کی وضاحت کی ہے کہ نیکی کو عقلی استدلال کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن نیکی یا ورچو (Virtue) کی وضاحت نہیں کی ہے اور نہ ہی سماجی نیکی اور سماجی انصاف کی کوئی حتمی وضاحت کی ہے۔

مادیت اخلاق سوز ہے

افلاطون نے اپنے استاد کے اخلاقیاتی اصولوں کو اپنی مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کے ساتھ وابستہ کر کے اس کو علمی سانچہ میں ڈھالا ہے چونکہ روح محسوسات سے بالاتر عالم سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا حقیقی اور غیر فانی وجود اسی کے اندر ہو سکتا ہے اسی لیے جو خیر و سعادت انسانی مساعی کا صحیح نصب العین ہو سکتی ہے وہ بھی روح کو اسی عالم کی طرف رجوع کرنے سے میسر آ سکتی ہے جسمانی زندگی روح کا زنداں اور اس کی قبر ہے اسی کی وجہ سے غیر عقلی عناصر روح کے ساتھ چمٹ گئے ہیں اور یہی عقل کے اندر ہیجانات کو پیدا کرتی اور شمولیت کو ابھارتی ہے۔

فطرات کو خطرات الٰہی کے مطابق بنانا

افلاطون کے نزدیک انسان کی زندگی کا صحیح مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اس عالم محسوسات سے گریز کرے اور اپنی فطرت کو الٰہی فطرت کے مطابق بنائے۔فلسفی کو چاہیے کہ وہ قبل از مرگ اس عالم میں سے مر جائے۔لیکن چونکہ مرئی زندگی غیر مرئی زندگی کا ایک عکس ہے اس لیے یہ بھی فرض ہے کہ انسان مظاہر محسوس کو تصورات کے ادراک کا ذریعہ بنائے اور تصورات کو معروضات حواس میں داخل کرے۔

نیکی اور بدی کا شعور

افلاطون کے نزدیک ناانصافی کرنا ظلم سہنے سے بدتر ہے اور بدعملی کے لیے سزا بھگتنا بچ

جاننے کی نسبت بہتر ہے۔ نیکی روح کا جمال اور اس کی اصحت ہے اس لیے وہ خود ایک سعادت ہے نیکی آپ ہی اپنا اجر ہے اور بدی آپ ہی اپنی سزا۔ انسانوں کے اندر بہیمیت پر الوہیت کی حکومت ہے اور یہی انسان کی سچی آزادی اور اصلی دولت ہے اور اسی سے مستقل اطمینان قلب حاصل ہو سکتا ہے۔

افلاطون الجمہوریہ میں ناقص نیکی کو جس کا مدار عادت اور ادراک پر ہے اس اعلیٰ نیکی کے لیے ایک لازمی تیاری خیال کرتا ہے جو حکیمانہ علم سے سرزد ہوتی ہے لیکن بعد میں وہ اس بات کو بھی مدنظر رکھنے لگا کہ اخلاقی قابلیت' مزاج احساس اور ارادے میں تفاوت و مدارج افراد میں بھی پایا جاتا ہے اور اقوام میں بھی۔ نفسیات میں بھی افلاطون نے فضیلت کی وحدت کے ساتھ فضائل کی کثریت کو پیش کیا اور کہا کہ ''ہر فضیلت کبریٰ کو روح کے اندر ایک خاص مقام حاصل ہے۔''

اخلاق کے 4 فضائل کبریٰ

افلاطون کے نزدیک فضائل کبریٰ چار ہیں۔

1۔ جب عقل صحیح طور پر عمل کرے تو اس کا نام دانائی ہے۔

2۔ جب جذبہ عقل کے مطابق چلے اور یہ بتائے کہ کس چیز سے ڈرنا چاہیے اور کس سے نہیں ڈرنا چاہیے تو وہ شجاعت کی صفت میں ظاہر ہوتا ہے۔

3۔ جب روح کے اندر یہ تنظیم پیدا ہو جائے کہ اس کا کونسا حصہ حکمران ہو اور کونسا محکوم تو اس کو تصرف نفس کہتے ہیں جس سے روح میں داخلی موافقت پیدا ہوتی ہے۔

4۔ جب روح کا ہر حصہ اپنا وظیفہ ادا کرے اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرے تو اس کا نام عدل ہے۔

فلاسفہ کی حکومت

افلاطونی مملکت کا دستور حکومت، خواصیت (Aristo cracy) ہے جس کا مطلب فلاسفہ کی ایسی حکومت ہے جن پر کسی قانون کی پابندی لازمی نہیں۔ حکمرانوں کے لیے ضروری قوت مہیا کرنے اور مملکت کو خارجی حملوں سے بچانے کے لیے سپاہیوں کا ایک طبقہ

بھی لازمی ہے۔ عام لوگوں میں کاشتکار اور صناع وغیرہ ایک تیسرا طبقہ ہے جن کو ہر قسم کے سیاسی کاموں سے بے تعلق ہونا چاہیے اور فقط روپیہ کمانا چاہیے۔

تین طبقات

افلاطون کے نزدیک طبقات کی یہ تقسیم تقسیم کار پر مبنی ہے لیکن اس کا خاص محرک یہ عقیدہ ہے کہ فقط چند لوگ اعلیٰ سیاسی کاموں کے اہل ہوتے ہیں چونکہ وہ ان قابلیتوں کو موروثی بھی تصور کرتا ہے اس لیے یہ تین طبقے تین ذاتیں بن جاتی ہیں۔ افلاطون ان کو روح کے تین حصوں کے مشابہ قرار دیتا ہے ان تینوں کا اپنے اپنے وظیفے کو ادا کرنا قوم کی فضیلت ہے۔ تاکہ دو اعلیٰ طبقے اپنا کام خوبی سے انجام دے سکیں ان کی تعلیم و تربیت اور بود وباش کا انتظام کلیتہً مملکت کے سپرد اور مملکت کے اغراض کے ماتحت ہونا چاہیے۔ یہ امرائی فلسفی تیسرے طبقے کی تعلیم و تنظیم حیات پر غور کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

افلاطون کے نزدیک مملکت کو اس بات کا انتظام کرنا چاہیے کہ ان طبقوں میں بہترین والدین سے نہایت موزوں حالات میں بہترین اولاد پیدا ہو۔ پھر ایسی اولاد کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر مملکت کی جانب سے ہونی چاہیے اس تعلیم میں موسیقی اور ورزش بھی شامل ہونی چاہیے جس میں عورتیں بھی حصہ لیں۔ عورتیں انتظامی اور عسکری فرائض میں بھی حصہ لے سکتی ہیں۔ مملکت کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو مستقبل میں حکمران بننے والے ہیں ریاضیاتی علوم اور منطق کی تعلیم دے۔ عملی زندگی میں کئی سال بسر کرنے کے بعد جب وہ ہر طرح سے قابل ثابت ہوں تو پچاس سال کی عمر میں وہ اس اعلیٰ مرتبہ میں داخل ہوں جس کے افراد کے بعد دیگرے سلطنت کا انتظام کریں۔ اس درجے میں داخل ہونے کے بعد وہ باقی تمام عمر پوری طرح کاروبار سلطنت میں وقف کر دیں۔ ایسے لوگ ذاتی ملکیت اور اہل و عیال کے بارے سبکدوش ہوں کیونکہ یہ اغراض مملکت کی وحدت کے دائمی دشمن ہیں۔

اخلاقی رویے

اپنی کتاب ریاست میں صفحہ نمبر 122 پر افلاطون کا مکالمہ درج ہے۔

اور یقیناً انہیں بزدل اور ایسے بدکردار آدمیوں کی نقل بھی کرنی چاہیے جو ہماری تلقین کے خلاف عامل ہوں اور یعنی نشے میں مدہوش ہو کر یا ہوش وحواس میں رہ کر ایک دوسرے کی ہنسی اڑائیں، یا کوسیں اور گالیاں دیں، یا جو کچھ اپنی ذلت یا اپنے ہمسایوں کے خلاف اپنے قول یا فعل سے گناہ کے مرتکب ہوتے ہوں۔ اسی طرح محافظوں کو ایسے مردوں اور عورتوں کے قول وفعل کی نقل کرنا نہ سکھانا چاہیے جو جنون میں مبتلا ہوں، کیونکہ بری اور شر کی طرح جنون بھی جاننے پہچاننے کی چیز ہے عمل پیرا ہونے اور نقل کرنے کی چیز نہیں۔

ایک اور مکالمہ میں یوں درج ہے۔

فرض کرو کے ایک نیک اور عادل آدمی کوئی چیز بیان کرتے کرتے کسی دوسرے نیک انسان کے عمل یا قول پر پہنچا، تو میرا گمان ہے کہ وہ اس کا روپ اختیار کرنا چاہے گا اور اس نقل سے ذرا نہ شرمائے گا۔ مثلاً جب یہ دوسرا شخص مضبوطی اور دانش مندی سے کوئی کام کر رہا ہے تو یہ قائل نہایت خوشی سے اس کی قائم مقامی کرنا چاہے گا۔ لیکن اگر یہ نیک شخص بیمار ہے یہ عشق میں مبتلا ہے، یا نشے میں چور ہے، تو یہ قائل ذرا مشکل سے ہی اس کی نقالی پر آمادہ ہوگا، اور اگر کہیں کسی ایسے اخلاق کا ذکر ہے جو اس کے شایان شان نہیں، تو اسے تو وہ دیکھنے تک کا روادار نہ ہوگا۔ ایسے شخص کو حقارت کی نظر سے دیکھے گا اور اگر کبھی اس کی نقل کرے بھی تو صرف ان لمحوں کی جب اس سے کوئی نیک کام انجام پا رہا ہو۔ ورنہ ان افعال کی نقل سے تو وہ سخت شرمندہ ہوگا، جو اس سے کبھی سرزد نہیں ہوئے۔ نہ وہ نیچے قسم کے لوگوں کی سی سج دھج اختیار کرے گا۔ کہ ان تدابیر کے استعمال سے (سوائے مزاح کے) وہ اپنے کو بہت بلند پاتا ہے اور اس کا دماغ ان سے آپ ہی آپ نفرت کرتا ہے۔

ایک اور مکالمہ میں افلاطون نے کہا (ص 130 ریاست)

اچھا کیا ہماری نگرانی بس یہاں ختم ہو جائے؟ اور کیا ہمارا یہ مطالبہ صرف شاعروں سے ہوگا کہ وہ اپنے کلام میں صرف نیکی اور خیر کا جلوہ دکھائیں، نہیں تو ہم انہیں ریاست سے خارج کر دیں گے! یا اس نگرانی کو دوسرے فن کاروں پر بھی عائد کیا جائے گا اور کیا ان کے لیے بھی سنگ تراشی، تعمیر یا دوسرے تخلیقی فنون میں خیر و نیکی کی ضد شر، بے اعتدالی، عدم عفت، کم ظرفی اور بدقماشی کے اظہار کو ممنوع قرار دیا جائے گا؟ اور اگر انہوں نے اس

قاعدے کی پابندی نہ کی تو ہم انہیں اپنی ریاست میں کام نہ کرنے دیں گے کہ کہیں ہمارے شہریوں کا مذاق آلودہ نہ ہو جائے؟ ہم ہرگز اخلاقی عیبوں کی فضا میں اپنے محافظوں کی نشوونما کے روادار نہیں ہو سکتے کہ اس کی مثال تو ایسی ہی ہوگی کہ ہم نے ان جانداروں کو ایسی زہریلی چراگاہ میں چھوڑ دیا ہے جہاں وہ روزانہ کچھ کچھ مضر اور زہریلی بوٹیاں کھاتے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی روح کی آلودگی کے لئے گندگی کا کافی موثر ذخیرہ فراہم کر لیں۔ ہمارے فن کار تو وہ لوگ ہونے چاہئیں جو حسن و جمال کی اصلی حقیقت کو دیکھ سکیں اور یہ صورت اسی وقت ممکن ہوگی کہ ہمارے نوجوان صحت اور تندرستی کی زمین پر آباد ہوں، دیکھیں تو جمال کا نظارہ کریں، اور سنیں تو کانوں تک حسن کا ہی ترانہ آئے۔ وہ ہر چیز کی خوبی سے متمتع ہوں اور حسن و جمال کی فراوانی ان کے سامعہ و باصرہ کو اس طرح متاثر کرے کہ گویا کسی پاک تر عالم سے صحت افزا نسیم کے جھونکے آ رہے ہیں تاکہ ابتدائی عمر سے ہی ایک غیر مخصوص طور پر ان کی روح میں جمال عقل کے ساتھ مماثلت اور ہم نوائی پیدا ہو جائے۔

یہی وجہ تو ہے 'گلاکن' کہ موسیقی کی تعلیم دوسری تمام تعلیموں سے زیادہ موثر ہوتی ہے، کیونکہ آپ کے یہ وزن اور آہنگ، یہ توازن اور تناسب روح کے اندر تک اپنی راہ نکال لیتے ہیں اور موثر طور سے اس پر اپنا تصرف کر لیتے ہیں۔ پھر جس کی تعلیم صحیح ہوتی ہے اس کی روح کو حسن و جمال کا تحفہ دیتے ہیں، اور جو روح بری تعلیم پاتی ہے بدہیئت اور کریہہ بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جس شخص کے وجود داخلی (روح) کو صحیح تعلیم نصیب ہوئی ہو وہ نہایت ذکاوت کے ساتھ کارخانہ قدرت یا فنون کی غلطیوں اور فروگذاشتوں کو محسوس کر لے گا۔ اور جہاں ایک طرف اپنے صحیح ذوق کے باعث اپنی روح کو محاسن و مکارم سے بہرہ یاب کر کے اس کی تعریف اور توصیف کرے گا اور اس سے لطف اندوز ہوگا تو اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف معائب اور مخارب کی بھی مذمت کرے گا اور ان سے نفور ہوگا۔ اور یہ سب کچھ ایسی کم سنی کے عالم میں کہ وہ اس تعریف یا مذمت کے وجوہ تک نہ بیان کر سکے گا لیکن جب اسے عقل و شعور آئے گا تو اپنے اس دیرینہ دوست کو پہچان کر اس کا خیر مقدم کرے گا جس سے اس کی تعلیم نے اسے عرصے سے مانوس کر رکھا تھا۔

ایک اور مکالمے میں درج ہے۔ لہٰذا ہم جس شہر کی بنیاد رکھ رہے ہیں تم اس کے لئے

یہ قانون مقرر کر دو گے کہ ایک دوست اپنے محبوب کے ساتھ بس اتنی ہی بے تکلفی برتے جیسی اپنے بیٹے سے برتتا ہے اور یہ بھی نیک نیتی کے ساتھ اور اس کی اجازت سے۔ تمام شخصی تعلقات میں اسے اس قاعدے کا پابند ہونا چاہیے اور کبھی اس سے آگے قدم نہ بڑھانا چاہیے۔ اور اگر وہ کبھی اس سے تجاوز کرے تو بد مذاقی اور ناشائستگی کے جرم کا مرتکب متصور ہو۔

ریاست صفحہ 361 پر درج ہے۔ اب خوشبو بخارات کے بادل چھائے ہوئے ہیں، عطر ہے، پھولوں کے ہار ہیں، شراب ہے، ایسی حالت میں اس کی دوسری شہوتیں اور اس کی بدکردار زندگی کی تمام مسرتیں اپنے بندھن توڑ کر اس کے گرد بھنبھنانا شروع کرتی ہیں، اور خواہش کے اس ڈنک کو جو انہوں نے اس کی نکھٹو فطرت میں پیوست کیا ہے خوب نشو ونما دیتی ہیں۔ بالآخر اس کی روح کا یہ بادشاہ جنوں کو اپنے محافظوں کا سردار بناتا ہے، اور لگتا ہے کھل کھیلنے۔ جہاں کسی اچھے خیال یا خواہش کو اپنے اندر پیدا ہوتے دیکھا، یا جب ذرا شرم وحیا کا کوئی شمہ اپنے میں باقی پایا تو ان سب کو ختم کر دیتا ہے، انہیں نکال پھینکتا ہے، حتیٰ کہ عفت اور اعتدال کو بالکل خارج کر کے ان کی جگہ جنوں کو کامل طور پر مسلط کر دیتا ہے۔

بداخلاق جابر کا حال

کتاب ریاست صفحہ 364 پر مکالمہ افلاطون یوں ہے۔ اب یہ سب سے پہلے تو ان کی املاک ضبط کرتا ہے۔ اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا اور جب اس کی روح پر مختلف خواہشوں کا نرغہ یوں جاری رہتا ہے جیسے چھتے پر شہد کی مکھیوں کا تو پھر کسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالتا ہے یا رات میں کسی راہ چلتے کے کپڑے اتار لیتا ہے۔ اس کے بعد عبادت گاہوں پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اسی دوران میں بچپن کے جو پرانے خیالات اس کے ذہن میں تھے اور جن کے اعتبار سے یہ نیک و بد میں تمیز کرتا تھا ان سب کو وہ نئے خیالات نکال باہر کریں گے جو ابھی ابھی رہا ہوئے ہیں اور اس کے عشق کے محافظ اور اس کی سلطنت کے شریک ہیں۔ جمہوری زمانے میں، کہ یہ ابھی اپنے باپ نیز قانونوں کا پابند تھا، یہ خیالات صرف عالم خواب میں آزادی پاتے تھے لیکن اب کہ سلطان عشق کی فرماں روائی ہے اس پر جیتے جاگتے

واقعتاً وہ کیفیت ہمیشہ طاری رہتی ہے جو پہلے گاہے گاہے اور وہ بھی خواب میں طاری ہوتی تھی۔ اب یہ حرام غذا کھالے گا اور ناپاک سے ناپاک قتل اور سنگین سے سنگین جرم کا مرتکب ہو سکے گا۔ عشق گویا اس کا مستبد ہے اور اس کے اندر بے آئین اور بے قوانین فرماں روائی کرتا ہے۔ پھر جیسے مستبد ریاست کو جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے، اسی طرح یہ عشق بھی مطلق العنان بادشاہ ہے اسے ہر بُرے کام پر آمادہ کر لیتا ہے جو اس کے اور اس کے ساتھیوں کے انبوہ کے بقاء اور قیام کا باعث ہو۔ پھر چاہے یہ ساتھی کسی برے سلسلے سے باہر سے آئے ہوں یا خود اس کی بداطواری نے انہیں یہیں پیدا کیا ہو۔ کیوں، کیا یہ اس کے طرز زندگی کی تصویر نہیں؟

برائی کا انجام

ریاست صفحہ 414 پر درج ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص روح کے غیر فانی ہونے کو تسلیم نہ کرے اور اس کا صاف منکر ہو اور یہ کہے کہ مرنے والے واقعی بد اور غیر منصف ہو جاتے ہیں تو اگر اس کا قول صحیح ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ناانصافی کو بھی مرض کی طرح غیر منصف کے لئے مہلک تصور کرنا چاہیے یعنی جنہیں یہ روگ لگ گیا وہ برائی کی اس ذاتی تباہ کن قوت سے مر جاتے ہیں جو برائی کی فطرت سے مضمر ہے اور جو جلد یا بہ دیر ہلاکی کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن یہ صورت اس سے بالکل جداگانہ ہے جس میں آج کل برے لوگ دوسرے کے ہاتھوں اپنے برے اعمال کی پاداش میں موت کا منہ دیکھتے ہیں۔

اخلاق سے روح کا تصور اور تعلق

کتاب ریاست صفحہ 414 میں افلاطون کے مکالمات یوں درج ہیں۔ لہٰذا یا تو اس کے نتیجے کا رد ہو، یا پھر جب تک بے در ہے ہم بھی یہ نہ کہیں کہ بخار یا کوئی دوسرا مرض، گلے پر خنجر کا چلنا، یا جسم کا چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا جانا روح کو تباہ کر سکتا ہے۔ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ جب جسم کے ساتھ یہ اعمال ظہور میں آئیں تو وہ (روح) بھی اس وجہ سے ناپاک یا بد ہو جاتی ہے۔ لیکن جب روح یا کوئی اور شے اپنی داخلی برائی سے تباہ

نہ ہو تو پھر یہ تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی خارجی برائی سے تباہ ہوسکتی ہے۔
گ: اور یقیناً یہ تو کوئی بھی ثابت نہ کر سکے گا کہ موت کے باعث انسانوں کی روحیں بد یا غیر منصف ہو جاتی ہیں۔
گ: نہیں۔ اگر ناانصافی غیر منصف کے لئے مہلک ہو تو اس صورت میں تو یہ اس کے لئے کچھ بہت ہیبت ناک نہ ہوگی، اس لئے کہ وہ اپنی برائی سے نجات پا جائے گا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ یعنی اگر ناانصافی میں طاقت ہو تو دوسروں کو تو قتل کرے لیکن خود قاتل کو سلامت رکھے اور خوب جیتا جاگتا۔ اس کا مسکن کہاں اور موت کا گھر کہاں؟
میں: سچ ہے۔ اگر روح کی فطری برائی اور اس کا ذاتی عیب اسے ہلاک اور برباد کرنے سے معذور ہے تو پھر جو چیز کسی دوسرے جسم کی تباہی کے لئے متعین کی گئی ہے وہ اس روح کو، یا سوائے اس چیز کے جس کی بربادی اس کا مقصود ہے کسی اور کو کیونکہ تباہ کر سکے گی۔
گ: جی ہاں، یہ تو مشکل ہی سے ممکن ہے۔
میں: لیکن جو روح کسی برائی سے تباہ نہ ہو، نہ خارجی سے نہ داخلی سے، وہ تو ہمیشہ موجود رہے گی اور چونکہ ہمیشہ موجود رہے گی اس لئے غیر فانی ہوگی؟
گ: یقیناً۔
میں: تو یہ نتیجہ نکلا۔ اور اگر یہ نتیجہ صحیح ہے تو روحیں ہمیشہ وہی رہنی چاہئیں، کیونکہ جب ان میں سے کوئی ہلاک نہ ہوگی تو ان کی تعداد بھی نہ گھٹے گی۔ اور نہ ان کی تعداد بڑھے گی، کیونکہ غیر فانی روحوں میں بڑھوتی پھر کسی فانی چیز سے آنی چاہیے اور یوں پھر سب چیزوں کا انجام جا کر بقا میں ہوگا۔
گ: بہت بجا۔
میں: لیکن یہ تو ہم یقین نہیں کر سکتے۔ عقل اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جس طرح ہم یہ بات باور نہیں کر سکتے کہ روح اپنی حقیقی ماہیت میں عدم یکسانیت، تنوع اور اختلاف سے بھری ہوئی ہوگی۔

افلاطون کا فلسفہِ ادب و فن

مذہب پسندی

افلاطون کے زمانے میں مذہب اور فن لطیف کا بہت گہرا ربط تھا افلاطون کا اپنا مذہب فلسفیانہ توحید ہے جس کے اندر خدا اور خیر کا تصور مترادف ہے اور ربوبیت کے ساتھ یہ عقیدہ وابستہ ہے کہ عالم عقل کی پیداوار ہے اور نیکی اور علم خدا کی عبادت ہے۔ خاص خدائے مطلق کے علاوہ وہ تصورات کو سرمدی دیوتا اور کائنات اور ستاروں کو مرئی دیوتا قرار دیتا ہے۔ وہ روایتی دیومالا کے دیوتاؤں کو محض تخیل کی پیداوار سمجھتا ہے اور ان کی طرف منسوب بداخلاقیوں کو دیوتاؤں کے لئے ذلت سمجھتا ہے۔ بایں ہمہ وہ یونانی مذہب کو مملکت کا مذہب بنانا اور دیوتاؤں کے افسانوں کو تعلیم کی بنیاد قرار دینا چاہتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان میں سے مضر حصوں کو نکال دیا جائے۔ وہ قومی مذہب کو منسوخ کرنے کی بجائے اس کی اصلاح کا طالب ہے۔

فن فلسفہ کے تحت ہو

سقراط کی طرح وہ حسن کو خیر کے ماتحت اور فن لطیف کو اشیاء کی حسی نمو کی نقل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک کامیڈی ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے ادنیٰ جذبات کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور سیرت کی سادگی اور سچائی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس کے خیال میں کسی بلند مقام پر پہنچنے کے لئے فن لطیف کے لئے ضروری ہے کہ وہ فلسفے کے ماتحت ہو کر چلنے اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ ہے۔ اس کا اعلیٰ ترین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ نیکی کی عمدگی اور بدی کی نفویت پر زور دے۔ تمام فن لطیف، خصوصاً شاعری اور موسیقی پر اسی اصول سے نگرانی

ہونی چاہیے۔

معتدل موسیقی وشاعری

افلاطون اپنی مجوزہ مملکت سے نہ صرف دیوتاؤں اور مشاہیر کی نسبت قصوں کو خارج کرنا بلکہ تمام ایسی موسیقی کو بھی رد کر دیتا ہے جس میں بہت زیادہ بے اعتدالی اور زنانہ پن پایا جائے۔اس کے ساتھ ہی نقلی شاعری کو بھی دھتکار دیتا ہے۔

ادب برائے زندگی

افلاطون ایک عظیم ادیب فلاسفر تھا۔اس کی ابتدائی تحریر بھی فلسفے کے ساتھ ساتھ بہترین ادب کا نمونہ ہے اور اس نے اپنی ادبی صلاحیت کو فلسفے اور اخلاقیات کے فروغ کے لئے استعمال کیا ہے۔افلاطون کے نزدیک ادب برائے زندگی اور جمالیات مکمل طور پر اخلاقیات اور فلسفہ کے ماتحت ہے۔اسی لئے خیالی ریاست کے تعلیمی نصاب میں صرف ایسی شاعری کے مطالعہ کی اجازت دی گئی جس میں نیکی، انصاف اور بہادری کے جذبات کو فروغ حاصل ہو۔افلاطون کے خیال میں اصل ادب وہ ہے جس میں اخلاقیات اور سنجیدگی کے پہلو نمایاں ہوں اور جس کا مقصد افراد کے اذہان کی اخلاقی اور عقلی نشوونما ہے۔

افلاطون کے خیال میں ایک فنکار یا ادیب اپنے فن یا ادب کو عقلی استدلال کے تحت تخلیق نہیں کرتا بلکہ وہ ایک وجدانی کیفیت میں یہ سب کچھ کرتا ہے۔اگرچہ اعلیٰ درجہ کے ادب میں کہیں کہیں عقلی استدلال کی جھلک موجود ہوتی ہے لیکن ادب کا زیادہ تر حصہ وجدانی کیفیت کی پیداوار ہوتا ہے۔اس کے خیال میں موسیقی، شعر اور صورت تراشی کے ہر طرز کو نوجوان کی تعلیم کا جزو نہیں بننا چاہیے بلکہ صرف ان طرزوں کو اپنانا چاہیے جن سے روح کی صحیح اخلاقی تربیت ہو سکے۔سچا آرٹ ہی اچھا آرٹ ہے۔آرٹ چونکہ زندگی اور کائنات کی تعبیر اور ترجمانی کا نام ہے اس لئے اسے بھی اس خیر مطلق کا پرتو ہونا چاہیے جس سے زندگی اور کائنات معمور ہے۔آرٹ کو دراصل اپنا حقیقی مقصد پورا کرنا چاہیے۔

معتدل اور موزوں مناسب موسیقی وشاعری

افلاطون شاعری، مصوری اور موسیقی کے بارے میں ناپسندیدگی کا برملا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "میرے مثالی معاشرہ میں اس قماش کی بدآموزیوں کی گنجائش نہیں ہے۔" افلاطون نے غالباً شاعری کو اس لئے بھی قابل گردن زنی قرار دیا کہ شاعر دیوتاؤں کے متعلق ناشائستہ باتیں کہتے تھے۔ اس کے خیال میں شاعری اور فنون لطیفہ جذبات برانگیختہ کر سکتے ہیں جس سے معاشرے میں انتشار پیدا ہوتا تھا لہٰذا اس فنون لطیفہ کو مثالی مملکت میں پنپنے کا سرے سے موقع ہی نہ دیا جائے۔

افلاطون کے نزدیک دنیا عالم مثالی کا عکس ہے چونکہ فنون لطیفہ اور شعر طبعی دنیا کی نقل ہے۔ اس لئے یہ نقل کی نقل ہیں اور اصلیت سے بہت زیادہ ہٹے ہونے کے سبب اعتنا کے قابل نہیں۔ اس ضمن میں وہ الجمہوریہ کی دسویں کتاب میں کہتا ہے کہ ابتدائی شباب میں میرے دل میں ہومر کی بڑی عظمت اور محبت تھی اس لئے کہ المیہ نگاروں کی اس ساری کی ساری دلفریب جماعت کا استاد اور سردار یہی شخص ہے لیکن صداقت سے زیادہ تو کسی شخص کی عزت نہیں ہو سکتی۔

اچھے شاعری کی علامات

افلاطون کے نزدیک شاعر اس وقت تک اچھا شعر نہیں کہہ سکتا جب تک اسے اپنے موضوع کا علم نہ ہو اور جو یہ علم نہ رکھتا ہو وہ کبھی شاعر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ کہتے وقت کہ یہ تمام المیہ نگار اور ان کا سردار ہومر تمام علوم وفنون سے واقف تھے اور وہ نیکی، بدی اور ایسی چیزوں کا مکمل علم رکھتے تھے تو ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں یہاں بھی نظر کا فریب تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ان لوگوں کو بھی نقالوں سے سابقہ پڑا ہو اور یہ بھی ان کے فریب میں آ گئے ہوں۔ لوگوں نے جب ان کی تصنیفیں دیکھیں تو شاید یہ یاد نہیں رکھا کہ یہ تو محض نقلیں ہیں اور پھر صداقت سے تین درجے دوری پر ان کا بنانا بھی آسانی سے ممکن ہے کیونکہ یہ صرف ظاہری شکلیں ہیں حقیقت نہیں ہیں۔ حقیقی صناع جسے علم ہے وہ بجائے نقل کے اصل میں

دلچسپی لے گا۔ اور مدحیہ قصائد کا مصنف ہونے کی بجائے ان کا موضوع بننا زیادہ پسند کرے گا۔

افلاطون کہتا ہے کہ اگر ہم ہومر سے یہ پوچھیں کہ اگر آپ نقال نہیں ہیں تو وہ کون سی ریاست ہے جس پر آپ کی مدد سے بہتر حکومت قائم ہوئی ہو۔ کسی ڈیمون کا اچھا نظام ہے لیکن کون ہے جو کہتا ہے کہ اس نے ان کے اچھے قانون نافذ کیے ہیں اور انہیں کچھ فائدہ پہنچایا ہو۔ کیا زندگی میں اس کے ایسے دوست تھے جو اس کی صحبت کے دلدادہ ہوں اور جنہوں نے آنے والی نسلوں تک اس کا طریق زندگی اپنایا ہو۔ مثلاً ایسا حلقہ جیسا کہ فیثا غورث نے قائم کیا تھا کہ لوگ اس کے عرفان کے باعث اسے محبوب رکھتے تھے اور آج کے دن تک اس کے ماننے والے اس سلسلے سے پہنچانے جاتے ہیں جو اس کے نام سے منسوب کیا گیا تھا'' تو جواب نفی میں ہوگا۔

افلاطون کے خیال میں اگر ہومر واقعی لوگوں کو سدھارنے اور سکھانے کا اہل ہوتا یعنی بجائے نقال ہونے کے اس کے پاس علم ہوتا تو اس کے بہت سے معتقد اور پیرو ہوتے جو اس کی عزت اور اس سے محبت کرتے۔ سارے کے سارے شاعر ہومر سے لے کر اس تک محض نقال ہیں یہ نیکی اور دوسری چیزوں کے عکس نقل کرتے ہیں لیکن حقیقت تک کبھی نہیں پہنچتے۔

شاعر کی مثال اس مصور کی سی ہے جو چمار کی تصویر بنا ڈالتا ہے حالانکہ وہ اس کے فن کو ذرا نہیں سمجھتا۔ اس کی تصویر بس ان کے لئے ٹھیک ہے جو خود اس سے زیادہ نہیں جانتے اور صرف رنگ اور صورت کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح شاعر اپنے لفظوں اور ترکیبوں سے مختلف فنون کا رنگ جماتا ہے اور ان کی ماہیت سے بس اسی حد تک واقفیت رکھتا ہے جتنی کہ نقالی کے لئے کافی ہو۔ دوسرے لوگ جو خود اسی کی طرح جاہل ہیں اور صرف اس کے لفظوں پر فیصلہ کر لیتے ہیں جب یہ شاعر وزن اور بحر کے ساتھ کسی بات کا ذکر کرتا ہے تو نہایت دلنشین انداز میں انہیں بیان کرتا ہے۔ وہ اس کے لئے کہ نغمہ اور بحر میں قدرتاً شریں اثر ہے۔ اگر ان شاعروں کے حصوں کو اس رنگ آمیزی سے مبرّیٰ کر دیجئے جو موسیقی نے ان پر چڑھایا جاتا ہے اور معمولی سیدھی سادی نثر میں انہیں بیان کیجئے تو ان کی پھسپھسی شکل

نکل آتی ہے ان کی مثال ان چہروں کی سی ہوتی ہے جو کبھی حسین نہ تھا بلکہ ان پر اوپر کی چمک دمک تھی جوان پر سے اتر گئی ہے۔

فن کی تشکیل

افلاطون کہتا ہے کہ تین فن ایسے ہیں جن کا ہر چیز سے واسطہ ہے ایک وہ جو اسے استعمال کرتا ہے دوسرا وہ جو بناتا ہے اور تیسرا وہ جو اس کی نقل کرتا ہے اور ہر جاندار اور بے جان چیز کی نیز ہر انسانی عمل کی خوبی، حسن، صداقت اس استعمال کے اعتبار سے ہوتی ہے جس کے لئے قدرت یا صناع نے انہیں مقصود کیا ہے۔ چنانچہ ان کے استعمال کرنے والے کو ہی ان کا سب سے زیادہ تجربہ ہونا چاہیے اور یہی بنانے والے کو بتا بھی سکتا ہے کہ استعمال کے وقت کون کون سی اچھی یا بری صفتیں اس میں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً بانسری بجانے والا ہی بنانے والے کو بتا سکتا ہے کہ اس کی کونسی بانسری بجانے میں اچھی ہے اور اسے کس طرح بانسری بنانی چاہیے اور بنانے والے کا فرض ہے کہ اس کی ہدایتوں کی پابندی کرے، اس طرح جن چیزوں کی نقالی کی جاتی ہے ان کے متعلق نقال کو کوئی قابل ذکر علم نہیں ہوتا نقالی بس ایک طرح کا کھیل ہے یا تفریح اور یہ سارے کے سارے المیہ نگار شاعر چاہے ایمبی میں لکھتے ہوں۔ چاہے رزمیہ میں بدرجہ اولی نقال ہوتے ہیں اور نقالی کو اس چیز سے واسطہ ہے جو حقیقت سے تین درجے دوری پر ہوتی ہیں۔

نقالی کی تردید

افلاطون نقالی کا سخت مخالف تھا اور اس کی نفی کرتا ہے اور تخلیقی ذہن کا مالک تھا۔ افلاطون کے خیال میں نقالی کا فن ایک نیچ ذات ہے جو نیچ ذات سے ہی بیاہ کرتا ہے لہٰذا اولاد بھی نیچ ذات ہی ہوتی ہے۔ نقال شاعر جس کا مقصد قبول عام ہے نہ تو قدرتاً اس غرض کے لئے خلق ہوا اور نہ اس کے ہنر کی غائیت ہی یہ ہے کہ روح کے عقلی اصول کو خوش کرے یا اور کسی طرح اس پر اثر ڈالے بلکہ یہ تو ترجیح دے گا جذباتی متلون طبیعت کو کہ اس کی نقل اتارنی آسان ہے۔ چونکہ شاعری کی حقیقت کے ذریعے حق تک پہنچنے کی کوئی خاص توقع

نہیں کی جا سکتی لہٰذا جو بھی اسے سنے اور اپنے اندر والے شہر کی حفاظت کا کھٹکا بھی رکھتا ہو اسے چاہیے کہ ہمارے لفظوں کو اپنا آئینہ بنائے اور اس کے بہکاوے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

شاعر کی حیثیت

اپنی کتاب ریاست میں افلاطون یہ مکالمہ پیش کرتا ہے۔ برادر عزیز: تم اور میں اس وقت ایک شاعر کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ہم تو ایک ریاست کا اساسی نظام مرتب کر رہے ہیں۔ اور ریاست کے بانیوں کا کام بس اتنا ہے کہ شاعروں کو وہ طرز بتلا دیں جس پر قصے لکھنا چاہئیں نیز انہیں ان کی حدود سے آگاہ کر دیں۔ ان کے ذمے یہ کام ہرگز نہیں آتا کہ وہ خود ہی یہ قصے کہانیاں بنا بھی ڈالیں۔

فلسفہ موسیقی

افلاطون کہتا ہے کہ اسی طرح میرا خیال ہے کہ ان محافظوں کی طبیعتوں میں جن کی تعلیم ہمارے سپرد ہے کبھی بھی موسیقی اور تناسب پیدا نہیں ہو سکتا جب تک وہ عفت اور اعتدال، شجاعت، جود وسخا، شان وشوکت وغیرہ اور ان کے اضداد کی ضروری شکلوں سے واقف نہ ہوں۔ اور ان کے پرتو ہر جگہ اور ہر ترتیب میں پہچان نہ سکیں۔ اور خواہ یہ بڑی چیزوں میں رونما ہوں یا چھوٹی میں، ہم ان کی طرف سے بے اعتنائی نہ کریں بلکہ انہیں ایک ہی فن اور علم کا موضوع بحث خیال کریں۔

یہ جذبہ اگر اس میں فطرتاً کمزور ہے تو یہ تبدیلی جلد ظاہر ہو جاتی ہے اور اگر قوی ہے تو موسیقی کی قوت اسے کمزور کر کے اس کی طبیعت کو چڑچڑا بنا دیتی ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے اور پھر فوراً ٹھنڈا بھی پڑ جاتا ہے۔ اس جذبے کے بجائے وہ اب نہایت ذکی الحس اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہے اور قوت عمل اس سے بالکل چھن جاتی ہے۔

ایک مکالمہ میں ریاست میں صفحہ نمبر 55-254 پر یوں افلاطون کہتا ہے

یہ کہ تمام وہ کرائے کے ٹٹو جنہیں عوام سافسطائی کہتے ہیں، اور وہ جنہیں ان کا مد

مقابل خیال کیا جاتا ہے، سب کے سب دراصل عوام کی رائے ہی کی تعلیم دیتے ہیں، یعنی اپنی اپنی مجلسوں کی رائے کی۔ بس یہی ان کی حکمت ہے یہ ان کا عرفان۔ میں ان کی مثال اس شخص سے دے سکتا ہوں جو ایک بڑے مضبوط جانور کو کھلاتا اور اس کے مزاج اور خواہشوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ شخص رفتہ رفتہ معلوم کر لیتا ہے کہ اس جانور کے پاس کس طرح جائے اور اس سے کیسا برتاؤ کرے، کون سے وقت اور کن وجوہ سے یہ خطرناک ہو جاتا ہے اور کن سے اس کے عکس، اس کی مختلف پکاروں اور آوازوں کا کیا مفہوم ہے، دوسرا شخص کیسی آوازیں نکالے تو یہ ٹھنڈا پڑتا، یا برافروختہ ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے اس طرح متواتر نگہداشت سے یہ شخص ان باتوں میں کامل ہو گیا تو لگا اپنے اس علم کو حکمت کہنے اس سے ایک نظام یا فن مرتب کرنے، اور اس فن کی تعلیم دینے۔ حالانکہ جن اصولوں یا جذبات کا یہ ذکر کرتا ہے اس کے ذہن میں ان کے مفہوم کا بھی کوئی حقیقی تصور نہیں۔ لیکن وہ بلا تامل اس بڑے جانور کے مزاج اور مذاق کی ہمنوائی میں ایک چیز کو عزت کے قابل اور دوسری کو مذمت کے قابل، اسے اچھا اسے برا، کسی کو مبنی برعدل اور کسی کو غیر عادلانہ بتلاتا ہے، جن چیزوں سے یہ جانور خوش ہو یہ انہیں خیر اور جنہیں یہ ناپسند کرے ان کو شر کہتا ہے، اور اس بارے میں سوائے اس کے کوئی وجہ نہیں بتلاتا کہ عدل وشرافت وہ ہے جو ضروری ہو۔ دراں حالیکہ اس نے کبھی نہ ان کا مشاہدہ کیا، نہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ دوسروں کو ان چیزوں کی ماہیت یا ان کا وسیع باہمی فرق سمجھا سکے۔ بخدا ایسا شخص کیا نرالا معلم ہو گا۔!

علم ہیئت

افلاطون صفحہ 305 ریاست میں مکالمہ میں کہتا ہے۔

کمال کا ایک ہی درجہ ہے جس تک ہر علم کو پہنچنا ہے اور وہ ہمارے شاگردوں کو بھی حاصل کرنا چاہیے۔ اس میں ناقص رہنا ٹھیک نہیں، جیسے کہ میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ ہیئت میں ناقص رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم آہنگی کے علم میں بھی یہی صورت پیش آتی ہے اور تم تو شاید اس سے واقف ہو۔ اس ہم آہنگی کے استاد بس ان آوازوں اور ان کے باہمی تطابق اور مناسبت کا مقابلہ کرتے ہیں جو سنائی دیں، چنانچہ ماہرین ہیئت کی طرح ان کی محنت بھی

رائیگاں جاتی ہے۔

علم منطق

ریاست میں صفحہ نمبر 308 پر درج ہے

لہٰذا منطق اور صرف منطق براہ راست اصل اول تک جاتی ہے اور صرف یہی وہ علم ہے جو اپنی بنیاد کو محفوظ کرنے کے لئے مفروضوں سے درگزر کرتا ہے۔ روحانی آنکھ جو سچ یہ ہے کہ ایک خارجی دلدل میں دبی ہوئی ہے اسی کی مشفقانہ مدد سے اوپر اٹھتی ہے۔ تحویل و تبدیل کے اس کام میں یہ ان علوم کو اپنا معاون اور خادم بناتی ہے جن پر ہم بحث کر چکے ہیں ۔ رواج عام تو انہیں علم کے نام سے پکارتا ہے لیکن دراصل ان کے لیے کوئی اور ایسا نام چاہئے جس سے رائے (وقیاس) کے مقابلے میں زیادہ اور علم کے مقابلے میں کم وضاحت ظاہر ہوتی ہو۔ چنانچہ اپنے پچھلے خاکے میں ہم نے اسے ''سمجھ'' کے نام سے تعبیر کیا ہے لیکن جب ایسی اہم حقیقتوں پر غور کرنا ہے تو خالی ناموں کے متعلق ہم کیوں جھگڑا کریں۔

متفرق علوم وفنون

ریاست صفحہ 399 پر درج ہے

اچھا تو اب ہومر سے ایک سوال کریں، طب یا کسی اور ایسے فنون کے متعلق نہیں جس کا حوالہ ان کی نظموں میں یوں ہی بر سبیل تذکرہ آ گیا ہے۔ اس سے یا کسی اور شاعر سے ہم یہ تو پوچھنے جائیں گے نہیں کہ آپ نے اسکلے پی اس کی طرح مریضوں کو اچھا کیا ہے یا اسکلے پی اس کے شاگردوں یا ساتھیوں کی طرح طب کا کوئی مدرسہ اپنے بعد چھوڑا ہے یا نہیں یا یہ کہ آپ طب اور دیگر فنون کے متعلق یوں ہی سنی سنائی باتیں کیا کرتے ہیں۔ ہاں تو یہ تو ہم پوچھنے نہیں لگے۔ البتہ فوجی نقل وحرکت، سیاست اور تعلیم کے متعلق اس سے سوال کرنے کا ہمیں حق ہے کہ یہ چیزیں اس کی نظموں کے مخصوص اور بلند ترین مضامین ہیں۔ اور ہم بجا طور پر ان کے متعلق اس سے پوچھ سکتے ہیں۔ اچھا تو اب ہم اس سے کہیں کہ ''دوست ہومر! اگر آپ نیکی کے متعلق اپنے قولوں میں حقیقت سے صرف دو درجے ہٹے ہوئے ہیں

تین درجے کا نہیں، یعنی اگر آپ عکس بنانے والے اور نقال نہیں، اگر آپ یہ معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ کون شغل انسان کی خانگی اور سیاسی زندگی کو اچھا اور کون برا بناتے ہیں تو ذرا فرمایئے کہ وہ کون ریاست ہے جس پر آپ کی مدد سے بہتر حکومت ہوئی ہو؟ لسی ڈیمون کا اچھا نظام لائکرگس کا رہین منت ہے اس طرح بہتیرے چھوٹے شہر ہیں جنہیں اوروں سے فیض پہنچا ہے لیکن کون ہے جو یہ کہتا ہو کہ آپ نے ان کے لئے اچھے قانون نافذ کئے ہوں اور انہیں کچھ فائدہ پہنچایا ہو، اٹلی اور سسلی کو اپنے چرون داس پر ناز ہے اور ہم میں سولن کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے لیکن کون سا شہر ہے جسے آپ کے متعلق کچھ کہنا ہو؟ کیا کوئی شہر ہے جس کا یہ نام لے سکے گا؟

شاعروں کا تذکرہ

ریاست صفحہ نمبر 400 افلاطون کا مکالمہ گلابن سے درج ہے۔ (میں سے مراد افلاطون، گ سے مراد گلابن)

گ: جی ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل درست ہے۔

میں: پھر ہم یہ نتیجہ کیوں نہ نکالیں کہ یہ سارے کے سارے شاعر، ہومر سے لے کر اب تک محض نقال ہیں، یہ نیکی اور دوسری چیزوں کے عکس کی نقل کرتے ہیں لیکن حقیقت تک کبھی نہیں پہنچتے؟ شاعری کی مثال اس مصور کی سی ہے جو چمار کی تصویر بنا ڈالتا ہے حالانکہ اس کے فن کو ذرا نہیں سمجھتا۔ اس کی تصویر بس ان کے لئے ٹھیک ہے جو خود اس سے زیادہ نہیں جانتے اور صرف رنگ اور صورت کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔

گ: بالکل بجا۔

میں: اسی طرح شاعر اپنے لفظوں اور ترکیبوں سے مختلف فنون کا رنگ جماتا ہے اور ان کی ماہیت سے بس اسی حد تک واقفیت رکھتا ہے جتنی کہ نقالی کے لئے کافی ہو، دوسرے لوگ جو خود اسی کی طرح جاہل ہیں اور صرف اس کے لفظوں پر فیصلہ کر لیتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ جب یہ نغمہ اور وزن اور بحر کے ساتھ موچی کے کام کا، فوجی نقل وحرکت کا، یا اور کسی بات کا ذکر کرتا ہے تو نہایت دل نشیں انداز میں انہیں بیان کرتا ہے۔ ہاں کیوں نہ ہو، نغمہ اور بحر میں

قدرتا یہ شیریں اثر ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اگر ان شاعروں کے قصوں کو اس رنگ آمیزی سے معرّیٰ کر دیجئے جو موسیقی سے ان پر چڑھایا جاتا ہے اور معمولی سیدھی سادی نثر میں انہیں بیان کیجئے تو ان کی کیسی پھسپھسی شکل نکل آتی ہے۔

مصور کا بیان

ریاست میں افلاطون کا مکالمہ درج ہے

اب ہم بجا طور پر اسے لے کر مصور کے پہلو بہ پہلو بٹھا سکتے ہیں کہ یہ دو طرح اس کا مثل ہے۔ اول تو یہ کہ اس کی مخلوق اپنے اندر صداقت کا ایک ادنیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ تو ہاں ایک تو اس بات میں یہ مصور کا مثل ہوا، دوسری بات یہ ہے کہ اسے بھی روح کے ایک ادنیٰ جزو سے سروکار ہے۔ لہٰذا ہم بالکل حق بجانب ہوں گے اگر اسے ایک منظم ریاست میں داخل کرنے سے انکار کریں کیونکہ یہ جذبات کو تو بیدار کرتا، ان کی آبیاری کرتا اور انہیں وقت بخشتا ہے لیکن عقل کو ضرور ی پہنچاتا ہے۔ جیسے کبھی کسی شہر میں بدکرداروں کو سارا اختیار مل جائے اور نیک مار کے الگ کر دیئے جائیں تو کیا حال ہو۔ اسی طرح انسانی روح میں یہ نقال شاعر ایک باطل دستور کو لا کر بٹھاتا ہے اس لئے کہ یہ روح کے اس غیر عاقل عنصر کی پچ کرتا ہے جسے بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں، جو اسی چیز کو کبھی بڑا اور کبھی چھوٹا خیال کرتا ہے۔ یہ شاعر بس صورت گر ہے اور حقیقت سے کوسوں دور۔

فلسفہ و شاعری کا موازنہ

صفحہ نمبر 410 (ریاست) پر درج ہے

اب کہ ہم پھر ایک بار شاعری کے موضوع پر لوٹے ہیں ہمیں چاہیے کہ اپنے پہلے فیصلے کی معقولیت اس عذر سے ثابت کریں جس کی رو سے ہم نے اس فن کو جس میں مذکورہ رجحانات ہوں اپنی ریاست سے خارج کیا تھا۔ لیکن اسی لئے کہ یہ ہم پر تشدد اور عدم رواداری کا الزام نہ لگا سکے، آؤ ہم اس سے یہ بھی کہہ دیں کہ فلسفے اور شاعری میں تو بڑا پرانا بیر ہے اور اسکے بہتیرے ثبوت ہیں "کتیا جو اپنے آقا پر بھونکتی ہے" والا مقولہ، یا "احمقوں کی

بیکار صحبت میں سر بلند''یا وہ ''انہوہ عقاما'' والا حوالہ''جوزیس کے دائیں بائیں چکر کاٹا کرتے ہیں۔''یا''وہ باریک بین نازک خیال، سارے کے سارے دریوزہ گر''الغرض اس پرانی عداوت کی ان جیسی اور بے گنتی نشانیاں ہیں۔لیکن باوجود اس کے آؤ ہم اپنی میٹھی دلاری اور اس کی دوسری بہنوں کو یقین دلائیں کہ بس اگر یہ ایک بار منظم ریاست میں اپنے وجود کا حق ثابت کر دیں تو ہم نہایت خوشی سے ان کا خیر مقدم کریں گے۔ہمیں تو خود اس کی دل آویزی کا احساس ہے لیکن ہم اس وجہ سے بھلا حق کا ساتھ تو چھوڑ نہیں سکتے۔مجھے یقین ہے کہ تم بھی اس کی دلفریبی سے اسی قدر متاثر ہوتے ہو گے جتنا کہ میں اور خصوصاً جب یہ ہومر کے پیکر میں رونما ہوتی ہے؟

میں: تو میں تجویز کروں کہ اسے جلاوطنی سے واپسی کی اجازت مل جائے۔لیکن بس اس شرط پر کہ یہ غنائی یا کسی اور بحر میں اپنی صفائی پیش کرے؟

اور یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان شعر وسخن کے شیدائیوں اور شاعری کے فن کے حمایتیوں کو جو خود شاعر نہیں اس بات کی اجازت دے دیں کہ یہ اس کی طرف سے نثر ہی میں گفتگو کریں اور ہمیں بتائیں کہ شاعری خالی لذت ہی نہیں بخشتی بلکہ ریاستوں اور انسانی زندگی کے لیے بھی مفید ہے۔ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہایت ہمدردی سے ان کا عذر سنیں گے، اس لیے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے تو ہمارا بھی فائدہ ہے، یعنی میں نے کہا اگر شاعری میں لذت کے علاوہ افادہ بھی ہو تو کیا کہنا۔

افلاطون کا فلسفہ مذہب

''ریاست''میں ایک مکالمہ کے تحت افلاطون نے لکھا ہے۔

گویا عوام کے خیال کے خلاف ہماری رائے یہ ہے کہ خدا، اگر وہ عبارت ہے خیر و برکت سے، تو وہ ہر چیز کا خالق نہیں ہوسکتا۔ وہ صرف چند چیزوں کی تخلیق کا تو سبب ضرور ہے لیکن اکثر کا نہیں۔ اس لیے کہ انسانی زندگی میں اچھائیاں کم ہیں اور برائیوں سے تو وہ بھری پڑی ہے۔ ان برائیوں کی تخلیق کا سبب کہیں اور تلاش کرنا چاہئے کیونکہ خدا کے ساتھ تو صرف خیر و برکت کی تخلیق منسوب کی جاسکتی ہے۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھا ہے۔

لہٰذا ہم ہومر اور دوسرے شاعروں کے سب ایسے بیانوں کو باور کرنے سے انکار کریں گے کہ ''بارگاہ زیس کی چوکھٹ پر دو ظرف رکھے ہیں۔ ایک میں اچھی تقدیریں ہیں، دوسرے میں بری۔ جس آدمی کو زیس ان دونوں میں سے کچھ کچھ حصہ دیتا ہے وہ کبھی آرام و مسرت کا بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور کبھی آلام و مصائب میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں'' لیکن جب غریبوں کو صرف بری تقدیر والے ظرف سے حصہ ملتا ہے وہ تمام عمر دنیا کی ساری لذتوں سے محروم، ابدی بھوک اور فلاکت کی زندگی گزارتے ہیں'' نہ ہم یہ تسلیم کریں گے کہ ''زیس ہر خیر و شر کا حاکم ہے۔'' یا اگر کوئی شخص اس دروغ حلفی اور عہد شکنی کو جو فی الواقع پندارس کی کارستانی تھی اتھنی اور زیس کی طرف منسوب کرے تو ہم ہرگز اسے نہ مانیں گے۔ نہ ہمارے نزدیک یہ بات قابل قبول ہے کہ تھیمس اور زیس کی دیوتاؤں کو جنگ و جدال پر آمادہ کیا'' اسی طرح ہم اپنے نوجوان طبقے کو ایسکلس کے اس قسم کے اقوال بھی نہ سنائیں گے کہ ''جب خدا کسی خاندان کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے تو اس میں معصیت اور جرم کو بیج بو دیتا ہے'' یا اگر کوئی شاعر نیوبی کے مصائب یا خاندان پیلاپ کی تکالیف یا ٹروجن جنگ کے

حالات نظم کرے تو اس سے بات کی اجازت نہ ہونی چاہئے کہ ان واقعات کو ذات باری کی طرف منسوب کرے اور اگر اس نسبت پر اصرار ہی ہو تو اس کی کوئی نہ کوئی تاویل ضرری ہونی چاہئے مثلاً یہ کہ خدا نے یہ سب کچھ حق اور انصاف کی حمایت میں کیا تھا اور اس کا اصلی مقصد بدکاروں کی تادیب و اصلاح تھا۔ یہ ہرگز نہ کہنا چاہئے کہ یہ سزا ان کی تخریب کا سبب ہوئی۔ ہاں شاعر یہ لکھ سکتا ہے کہ برے لوگ تکلیف اور مصیبت میں اس لئے بتلا رہتے ہیں کہ وہ اپنی برائی کی وجہ سے سزا کے مستحق ہیں اس سزا سے ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور یوں انہیں کا فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک صحیح اصولوں پر بنی ہوئی ریاست میں کوئی مصنف نظم یا نثر میں یہ کہنے کا مجاز نہ ہوگا کہ خدا لوگوں کے ساتھ برائی کرتا ہے۔ کیوں کہ اس قسم کے بیان سخت ناپاک، ضرر رساں، اور مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

اسی کتاب میں ایک اور جگہ درج ہے۔

لہٰذا کسی شاعر کو اس بات کی اجازت نہ ہونی چاہئے کہ دیوتاؤں پر اس قسم کے اتہام لگائے کہ "وہ اجنبی باشندوں کا بھیس بدل کر ہمارے شہروں میں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں" نہ پروٹیس اور تھیسٹس پر جھوٹے بہتان لگانے کی اجازت ہونی چاہئے۔ نہ دریائے آرگس کی بیٹی آئناکس کے لئے دربدر بھیک مانگتی پھرتی تھی۔ اس قسم کے تمام جھوٹے بیانوں کو یک قلم مسترد کر دینا چاہئے۔ ہاں۔ یہ بات بھی نظر استحسان سے نہیں دیکھی جا سکتی ہے کہ مائیں شاعروں کے اس قسم کے کلام کو باور کر کے اپنے بچوں کو ڈرائیں کہ رات کے وقت دیوتا مختلف شکلوں میں گھومتے پھرتے ہیں، کیوں کہ اس سے ایک تو دیوتاؤں کی تحقیر ہوتی ہے اور دوسرے خود بچوں کے دل چھوٹے ہو جاتے ہیں۔

اسی کتاب کے صفحہ نمبر 107 پر یوں لکھا ہے۔

میں: اس لئے اگرچہ ہم ہومر کے مداحوں میں سہی پر بھی ہم اس چھوٹے خواب کو ہرگز اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتے جو ہومر کے بیان کے مطابق زیلس نے اگاممنان کو دکھایا۔ نہ ہم ایسکلس کے ان اشعار کی تعریف کر سکتے ہیں جن میں تھیسٹس کا یہ بیان نقل ہے کہ "اپولو نے میری شادی کے موقع پر میری اولاد کی تعریف و تبریک میں گانا گایا تھا۔ اور وعدہ کیا تھا کہ میری نسل عرصے تک قائم اور تمام بیماریوں سے محفوظ رہے گی۔ اور ہر حیثیت سے مجھے خوش

نصیب بتا کر ایک فاتحانہ انداز میں میری روح کو تسلی دی تھی۔ میں سمجھتی تھی چونکہ یہ لفظ ایک دیوتا کی زبان سے نکلے ہیں اس لئے یہ پیشن گوئی ہرگز غلط ثابت نہیں ہوسکتی۔ لیکن ستم ظریفی تو دیکھو کہ اس دیوتا نے جس نے اس دعوت کے موقع پر یہ سب کچھ کہا تھا اسی نے آج میرے بیٹے کو قتل کر ڈالا۔"

دیوتاؤں کے متعلق ہم جب کبھی اس قسم کی باتیں سنیں تو ہمیں غصے اور ناراضی کا اظہار کرنا چاہئے۔ یہ اہتمام کرنا چاہئے کہ ایسے اشعار کبھی عام شاہراہوں پر نہ پڑھے جائیں۔ استادوں کو منع کرنا چاہئے کہ ایسے قصوں کو بچوں کی تعلیم میں استعمال نہ کریں۔ اور یہ سب اس لیے کہ ہمارا اصلی مقصد یہ ہے کہ ہمارے محافظ جہاں تک ممکن ہو دیوتاؤں کے سچے پرستار اور ان کے مشابہ اور مماثل ہوں۔

ایک اور مقام پر درج ہے۔ گویا ہمیں ایک بار پھر ہومر اور دوسرے شاعروں سے درخواست کرنی ہوگی کہ وہ ایک دیوی کے بیٹے یعنی ایکی لس کے متعلق یہ نہ بیان کریں کہ وہ کبھی بے قراری سے زمین پر لوٹتا، مضطربانہ کروٹیں بدلتا تھا اور کبھی سمندر کے کنارے دوڑا دوڑا پھرتا تھا یا دونوں مٹھیوں میں راکھ بھر بھر کر سر پر ڈالتا تھا۔ نہ دیوتاؤں کے ایک عزیز پرائم کی نسبت یہ روایت کریں کہ وہ خاک پر لوٹ لوٹ کر اور حاضرین کا نام زور زور سے پکار کر دعائیں اور التجائیں کرتا اور دادرسی کا طالب ہوتا تھا۔ ہم ہومر سے نہایت خلوص کے ساتھ یہ التجا بھی کریں گے کہ اپنے کلام میں دیوتاؤں کو تو شکوہ شکایت کرتا ہوا نہ ظاہر کرے اور اگر دیوتاؤں کا ذکر کرنا ایسا ہی ضروری ہے تو کم سے کم سب سے بڑے دیوتا کو تو ایسی سخت غلط بیانی سے معاف رکھے کہ اس کی طرف یہ لفظ منسوب کیے جائیں "الامان الامان۔ میں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ میرے ایک دوست کا پیچھا کر کے اسے شہر کے چاروں طرف دوڑایا جا رہا ہے۔ اور میرا دل غم واندوہ سے بھرا ہوا ہے!" یا یہ کہ "حیف صد حیف کہ میری قسمت میں یہ دیکھنا لکھا تھا کہ سارپی دون جو میرے لئے انسانوں میں سب سے عزیز انسان ہے، ملینی ٹی اس کے بیٹے پیٹروکلس کے ہاتھوں نیچا دیکھے۔"

کیونکہ عزیز من! اگر نوجوان لوگ دیوتاؤں کے متعلق اس قسم کی روایتیں سنیں گے تو بجائے اس کے کہ ان کی حماقت پر ہنسیں ان پر بالکل دوسرا اثر مرتب ہوگا۔ وہ سمجھیں گے کہ

جب دیوتاؤں کا یہ حال ہے تو پھر انسان کے لیے یہ حرکات کیسے باعث ذلت ہو سکتی ہیں ۔ چنانچہ اگر گریہ و بکا کرنے کی کوئی تحریک ان کی طبیعت میں ہوگی تو وہ ہرگز اسے دبانے کی کوشش نہ کریں گے ۔ اور بجائے اس کے کہ شرم سے کام لیں اور اپنی طبیعت پر قابو حاصل کریں وہ ہر ذرا ذرا سی بات پر ہمیشہ روتے پیٹتے پھرا کریں گے ۔

ایک اور جگہ درج ہے ۔

لیکن اگر شاعر ہر جگہ خود ہی ظاہر رہے اور اپنے کو چھپانے کی کوشش نہ کرے تو وہ نظم تذکرہ یا خالص ہو جاتی ہے ۔ اپنے موضوع کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے تا کہ آپ پھر یہ نہ کہیں کہ ''میں نہیں سمجھا'' میں ان دونوں قسموں میں تفریق کر کے بتلاتا ہوں ۔

دیکھئے ۔ اگر ہومر یہ کہتا کہ کرائی سس اپنے ہاتھ میں زر فدیہ لئے ہوئے آیا اور تمام اہل اخے سے عموماً اور ان کے سرداروں سے خصوصاً اپنی لڑکی کی رہائی کی درخواست نہایت لجاجت کے ساتھ کرنے لگا'' اور اس کے بعد اگر شاعر کرائی سس کی زبان سے تقریر کرانے کے بجائے خود ہی بیان کو جاری رکھتا تو پھر یہ نقل کلام نہ ہوتی بلکہ اسے تذکرہ یا خالص بیان کہتے ۔ اور نظم کی صورت حسب ذیل ہوتی (چونکہ میں شاعر نہیں ہوں اس لئے وزن و عروض کو بالائے طاق رکھتا ہوں) ''پجاری آیا اور اس نے یونانیوں کی طرف سے دیوتاؤں کی بارگاہ میں ان کی فتح اور کامرانی کی دعا مانگی تا کہ وہ ٹرائے پر قابض ہو کر صحیح سلامت اپنے گھروں کو واپس پہنچ جائیں لیکن ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ زر فدیہ قبول کر کے اس کی لڑکی کو رہا کر دیا جائے اور دیوتا کی تعظیم و تکریم کی جائے ۔ اس کلام کو سن کر دوسرے یونانیوں نے تو پجاری کی عزت اور اس کی درخواست پر اظہار قبولیت کیا لیکن گامنان کو اس پر غصہ آیا اور اس نے اس پجاری کو حکم دیا کہ نکل جائے اور پھر کبھی وہاں نہ آئے ورنہ اس کا عصا اور جبہ و دستار کچھ کام نہ آئے گا ۔ اگامنان نے یہ حکم بھی صادر کیا کہ کرائی سس کی لڑکی رہا نہ کی جائے بلکہ آرگس میں اس کے ساتھ رہ کر اپنی عمر گزارے ۔ اس کے بعد بیچارے پجاری کو پھر حکم دیا کہ اگر صحیح سلامت واپس جانا چاہتا ہو تو زیادہ غصہ نہ دلائے اور فوراً چلا جائے ۔ بیچارہ پجاری مارے خوف کے خاموش وہاں سے چلا آیا ۔ پھر اس نے لشکر سے باہر نکل کر اپولو کو مختلف ناموں سے پکارا اور اپنے تمام وہ نیک عمل یاد دلائے جو اس کی خوشنودی کے

لئے کیے تھے مثلاً قربانیاں، مندروں کی تعمیر وغیرہ۔ اوراس سے اب ان کا اعمال کا اجر چاہا اور التجا کی کہ اس کے آنسوؤں کا بدلہ اگامنان پر آسمانی تیر برسا کرلیا جائے'' وقس علیٰ ہذا۔ اس طرح نظم خالص بیانیہ انداراختیار کرلیتی۔

ایک اور جگہ مکالمہ درج ہے۔ عبادت گاہوں کی تعمیر، قربانیوں اور دیوتاؤں اور سورماؤں کے متعلق دوسری رسموں کا تعین، مردوں کے جلانے کا طریقہ، اوران تمام رسموں کے متعلق ہدایات جن کا اختیار کرنا ساکنان عالم بالا کی خوشنودی کے لئے ضروری ہے۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ ہم ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور اپنے نظام حکومت کی ترتیب میں ان معاملوں کی بابت ہمیں سوائے اپنے قدیم قومی ترجمان کے اور کسی کی نصیحت یا مشورے پر کاربند نہ ہونا چاہیے، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ دیوتا ہے جو بیچ میں ناف زمین پر اپنے پرجلال تخت کے اوپر بیٹھا ہوا تمام اس قسم کے معاملوں پر ہماری قوم کے تمام افراد کے فرائض کی ترجمانی کرتا ہے۔

افلاطون کا فلسفہ معاشیات

فلسفہ معاشیات سے پہلے چند اقوال افلاطون ملاحظہ ہوں۔

☆ جہیز لینے اور دینے پر پابندی ہونی چاہیے۔

☆ سونا چاندی رکھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

☆ غلام سے بیگار لینی چاہیے۔

☆ غیر ملکیوں کو ریاست میں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت ہونی چاہیے۔

☆ شہریوں کا ذریعہ معاش زراعت ہونا چاہیے، شہری کے پاس زرعی زمین کا ایک حصہ شہر کے قریب اور دوسرا سرحد پر ہونا چاہیے تاکہ شہری مملکت کی حفاظت کر سکیں۔

☆ دست کاری، صنعت و حرفت اور تجارت کی نگرانی غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔

☆ پیشہ ور لوگ جسمانی یا نفسانی خواہشات، سپاہی ہمت اور بہادری جبکہ فلسفی اور محافظ دانائی کے مظہر ہیں۔

☆ انسانی ذہن اپنی فطرت میں روحانیت کا مل ہے۔

☆ انسان روحانی لحاظ سے لافانی ہے اور اس لحاظ سے اس کا ذہن بھی لافانی ہے۔

☆ انسان اپنے ذہن میں موجود غیر تغیر پذیر اور لازوال تصورات کے ذریعے ماورائے کائنات میں موجود حقیقت مطلق کی ہیئت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

کتاب ''ریاست'' میں افلاطون نے لکھا ہے۔ ریاست کو اساس عدل پر قائم رکھنے کے لئے نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ افلاطون نے معیشت کے ایک اشتراکی نظام کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ لیکن اس کو صرف حکمرانوں اور سپاہیوں تک محدود کر دیا ہے۔ مثلاً املاک کے متعلق افلاطون کی تجویز ہے کہ تیسرا یعنی محنت و مشقت کرنے والا دولت آفرین طبقہ اپنی پیداوار کا اتنا حصہ حکمرانوں اور جنگ آزماؤں کو دے دیا کرے کہ بس ان کی لابد ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ یہ دولت روپے پیسے کی شکل میں بطور تنخواہ ان میں تقسیم ہو اور یہ اس کو جس طرح چاہیں صرف کریں بلکہ سب ایک جگہ ایک ساتھ کھانا

کھائیں، ایک سا کپڑا پہنیں۔ یعنی افلاطون ان طبقوں کو دولت آفرینی ہی سے منع نہیں کرتا بلکہ صرف دولت کو بھی اجتماعی شکل دیتا ہے۔

اشتراک املاک کے ساتھ ساتھ افلاطون نے اشتراک ازدواج کی بھی حمایت کی ہے اور اس تجویز پر ''ریاست'' میں کافی بحث ہے۔ حکمرانوں اور سپاہیوں کے لئے شادی بیاہ کرنا اور الگ الگ خاندان رکھنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بوڑھے تجربہ کار حکمرانوں کا یہ کام ہے کہ مقررہ اوقات پر تندرست نوجوان مرد عورتوں کو یکجا کر دیں اور ان کے اختلاط سے جو اولاد پیدا ہو اسے اس کا علم نہ ہو کہ اس کے والدین کون ہیں۔ بچوں کو پیدا ہوتے ہی ریاست کی ماؤں سے لے کر اپنے آغوش میں پرورش دے تاکہ ہر نئی نسل اپنے سے پہلی نسل کو من حیث الکل اپنے ماں باپ سمجھے اور ہر پرانی نسل چھوٹوں سے ایسی ہی محبت رکھے جیسی اپنی اولاد سے۔ افلاطون کی خواہش ہے کہ شخصی خاندان کی خود غرضیوں اور تنگ نظریوں کو مٹا کر ریاست کے دو اعلیٰ طبقوں کو بس ایک خاندان بنا دے۔ تاکہ یہ محدود خاندانی تعلقات ان طبقوں کی یگانگت میں مخل نہ ہوں۔ عورتوں کو بھی زندگی کے چھوٹے چھوٹے تفکرات سے نجات ملے اور وہ مہمات امور میں مردوں کے دوش بدوش کام کر سکیں۔

اس سلسلے میں افلاطون نے مرد عورت کی مساوات پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے اس کے معاصرین غالباً اس تجویز پر سب سے زیادہ بھڑکے ہوں گے۔ اس لئے کہ یونان میں عورتوں کی حیثیت وہ تھی جس سے ہم مشرقی ممالک کے لوگ خوب آشنا ہیں۔ یونانی زندگی مردوں کی زندگی تھی۔ عورتیں گھروں کی چار دیواری میں رہتی تھی اور گھر کی دیکھ بھال، کھانے پکانے اور بچے دینے کا کام کیا کرتی تھیں۔ سیاست میں انہیں بالکل دخل نہ تھا۔ اس مساوات کے اصول کو منوانا منطقی طور پر افلاطون کے لئے ضروری نہ تھا۔ وہ جو ریاست میں ہر ایک کو اپنا وظیفہ مخصوص دینا چاہتا تھا اور جس نے پورے محنت کش طبقے کے طبقے کو سوائے دولت آفرینی کے اور کسی ذہنی شغل کا اہل نہ جانا وہ آسانی سے عورتوں کے لئے وہی وظیفہ مخصوص کر سکتا تھا جو اس وقت کی سوسائٹی نے انہیں تفویض کر رکھا تھا۔

بظاہر ایسا نہ کرنے کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو شاید یہ ہو کہ یونان میں دیویسی مذہب کے فروغ دینے میں عورتوں کا حصہ مردوں سے کم نہیں، کچھ زیادہ ہی تھا۔

حال اور جذب میں، مذہب کے ساتھ والہانہ شیفتگی میں، اور اس کی خاطر جسمانی تکلیفیں برداشت کرنے میں، عورتیں مردوں سے کچھ آگے ہی تھیں۔ افلاطون جس نے یہ دیکھا تھا کیوں نہ سیاسی زندگی میں بھی انہیں برابر کا موقع دیتے نہیں، بلکہ ان سے برابر کام لینے کا فیصلہ کرتا۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے کے ذہنی اور سیاسی ہیجان سے حرم سرا کی عزلت نشین خواتین یوں بھی متاثر ہو چلی تھیں۔ آس پاس اکثر جگہ عورتوں نے خانگی امور کے علاوہ وسیع تر معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے کے ادب میں خود یونان میں بھی عورتوں کے گھر سے باہر نکل کر عام زندگی میں مداخلت کرنے کے تذکرے اور اشارے ملتے ہیں بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عام انتشار و بدنظمی میں لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ چلو یہ آخری آزمائش بھی کر دیکھیں، مردوں کو دیکھ چکے اب رہی سہی، عورتوں کے ہاتھ سیاست دے دیں۔ اس لئے افلاطون نے بھی، جو بنیادی اصلاح کا علمبردار تھا اور نئے اصولوں پر ہیئت اجتماعی کی جدید تشکیل چاہتا تھا، عام روایات اور رسم کے خلاف اس مساوات کے مرد و زن کی حمایت کی۔ جو خاندان اور املاک شخصی کو مٹانے کی ہمت رکھتا وہ عورت و مرد کے فرق کو کیوں نہ کالعدم کر دیتا۔

مشترکہ املاک، مشترکہ خاندان اور مساوات مرد و زن کی تجویزیں اس قدر انقلابی ہیں کہ "ریاست" کے اکثر پڑھنے والوں کی زیادہ تر توجہ ان کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اشتراک کے یہ مسائل پیش کرنا ہی اس کتاب کا اصل مقصود ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں۔ اس لئے کہ افلاطون کے نزدیک اس نظام اشتراک کی حیثیت اصولی نہیں بلکہ فرعی ہے۔ افلاطون جانتا تھا، اور ارسطو اور اس کے آئندہ معتقدین کی یک طرفہ تنقید اور نکتہ چینی سے پہلے جانتا تھا، کہ ریاست ذہن انسانی ایک خارجی تشکیل ہے۔ اس لئے اس کی حقیقی اصلاع ذہن ہی کی اصلاح سے ممکن ہے۔ گویا ارسطو اور متبعین ارسطو کا اصرار کہ نظام معاشی میں تبدیلی بے سود اور غیر ضروری ہے، سچی اصلاح صرف تعلیم کی اصلاح سے ہو سکتی ہے۔ دراصل پڑھے کو پڑھانا اور سیکھے کو سکھانا ہے۔ ہاں، مگر افلاطون یہ بھی جانتا تھا کہ ذہن انسانی اپنے ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اور اگر عدل ایک روحانی کیفیت، ایک ذہنی عادت سے عبارت ہے جس کی وجہ سے ہر آدمی بس اپنا مخصوص وظیفہ

پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کیفیت اس عادت کی کما حقہ، پختگی کے لئے ضروری ہے کہ جن حالات میں ذہن پرورش پائے وہ اس کے نشوونما کے لئے مضر اور مخالف نہ ہوں۔ افلاطون کے نزدیک اس عادت کے نشوونما پانے اور راسخ ہونے کے لئے سب سے مساعد حالات ایک اشتراکی نظام ہی میں ممکن ہیں۔ اس لئے اس نے یہ نظام پیش کیا ہے جس کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ تعلیمی نظام کو اپنے نتائج حسنہ کے پیدا کرنے میں خارجی ماحول کی مخالفت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

افلاطون کی اشتراکی تجاویز سے ایک غلط فہمی اور پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت چونکہ اکثر ممالک میں معاشی زندگی ایک اشتراکی مسلک رفتہ رفتہ رواج پا رہا ہے اس لئے افلاطون کی تجاویز کو ذرا سطحی نظر سے دیکھنے والے اس کے نظام معیشت کو جدید اشتراکی نظام سے ملا دیتے ہیں، جو صحیح نہیں۔ افلاطون کے اشتراک کو جدید اشتراک سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ اشتراک جدید پوری ہیئت اجتماعی کے لئے ایک تجویز ہے اور افلاطون کا اشتراک ریاست کے صرف ایک مخصوص طبقے کے لئے ہے۔ جدید اشتراک دولت آفرینی کا سارا کا م ریاست کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ افلاطون کے نظام میں دولت آفرینی کا سارا کام ریاست کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ افلاطون کے نظام میں دولت آفرینی بدستور افراد ہی کے سپرد ہے اور اس مجوزہ نظام کا براہ راست کوئی اثر کسی دوکاندار، مزدور یا کسان پر نہیں پڑتا۔ جدید اشتراک ہر ایک سے دولت آفرینی کا کام لے کر دولت کو بڑھانا اور پھر اس دولت کو سب میں برابر تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ افلاطون کے اشتراک میں وہ طبقہ جس کے لئے یہ نظام تجویز کیا گیا ہے دولت آفرینی میں حصہ ہی نہیں لے سکتا۔ جدید اشتراک کے پیش نظر ایک معاشی مسئلہ ہے۔ افلاطون کے سامنے ایک اخلاقی مہم ہے۔ جدید اشتراک سیاسی اور معاشی قوت کا حامل جمہور کو بنانا چاہتا ہے، افلاطون کے اشتراک تزکیہ سیاست کی خاطر اپنے حکمران طبقے کو معاشی زندگی سے بالکل بے تعلق کرنا چاہتا ہے۔ جدید اشتراک دولت کا اشتراک ہے، افلاطون کا اشتراک ترک دولت کا اشتراک۔

ایک اور جگہ پر ''ریاست'' میں درج ہے۔ ہم نے موچی کو کاشت کاری یا معماری کے کام کی اجازت محض اس لئے نہیں دی تھی کہ ہمارے جوتے اچھے تیار ہوں۔ اور اس پر کیا

موقف ہے ہر شخص کو صرف وہ ایک کام دیا گیا تھا جس کے لئے وہ فطرتاً خاص طور پر موزوں ہو، یہی کام اسے عمر بھر انجام دینا چاہیے کہ اس کے ہاتھ سے ترقی کرنے کے موقع نہ نکل جائیں اور وہ اپنے فن میں ماہر ہو جائے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ہمارے لئے اس سے زیادہ اور کون سی بات ضروری ہوگی کہ سپاہی کا کام خوبی کے ساتھ انجام دیا جائے۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ جنگ کوئی آسان فن نہیں کہ آدمی دوسرے کاموں مثلاً کاشت کاری وغیرہ میں بھی مصروف رہے اور سپاہی کا کام بھی انجام دیتا رہے۔ یوں تفریح ہی تفریح میں تو آدمی تاش اور شطرنج تک کا ماہر نہیں نہیں بن سکتا۔ مہارت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی شروع عمر ہی سے ایک کام میں لگا رہے اور کسی دوسری طرف توجہ نہ کرے۔ جس طرح خالی اوزار آدمی کو کاریگر نہیں بنا سکتے اسی طرح صرف ہتھیاروں سے آدمی سپہ گری کے قابل نہیں ہو جاتا جب تک اچھی طرح ان کا استعمال کرنا نہ جانتا ہو، محض آلات حرب سے مسلح ہو کر اور ہاتھ میں ایک سپر لے کر ایک ہی دن میں آدمی سورما سپاہی تو نہیں بن سکتا۔

فلسفہ امیر و غریب

ایک جگہ ریاست میں درج ہے۔ ان کے لئے تو بھائی کوئی اور بڑا شاندار سا نام ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک ہر ایک کئی شہروں کا مجموعہ ہے ایک شہر کہاں! اس میں کم سے کم دو شہر تو ضرور ہیں جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں، یعنی ایک غریبوں کا شہر اور ایک امیروں کا۔ اور پھر ان میں بھی اور کئی کئی شہر ہیں۔ آپ انہیں ایک شہر سمجھ بیٹھیں تو بڑی غلطی ہوگی۔ انہیں بالکل جدا جدا شہر تصور کر کے اگر آپ ایک طبقے کو دوسرے کا مال و متاع دیں گے تو ہمیشہ آپ کے دوست زیادہ ہوں گے اور دشمن کم۔ اور میں تو خیال کرتا ہوں کہ جب تک آپ کے شہر میں سلیقے کے ساتھ انہیں اصولوں پر حکومت نہ ہوگی جو ہم نے ابھی مرتب کئے ہیں تو فی الحقیقت یہ بہت بڑا شہر ہوگا۔ میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ یہ بڑے شہر کی حیثیت سے مشہور بھی ہوگا البتہ واقعاً بہت بڑا ہوگا چاہے اس کی فوج ہزار آدمیوں سے زیادہ کی نہ ہو۔ کیونکہ آپ کو اتنا بڑا شہر نہ یونان میں ملے گا نہ اس کے باہر کے متمدن ممالک میں۔ اگرچہ ایسے شہر بہت سے ملیں گے جو بظاہر اس سے کئی گنا بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ اس معاملے میں مجھ سے اختلاف تو نہیں کرتے؟

افلاطون کا فلسفہ امن

اس کے علاوہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے محافظ آپس میں لڑنے جھگڑنے کو بد ترین عادت مانیں تو ہمارا فرض ہے کہ انہیں آسمانی جنگوں کے متعلق ایک حرف بھی نہ سننے دیں، نہ ان سازشوں اور باہمی جھگڑوں کا ذرا بھی آ کر ان سے کرنا چاہیے جو دیوتاؤں کے درمیان بتلائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ تمام کی تمام روایتیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ نہ ہم کو ان روایتوں کا ذکر کرنا چاہیے جن میں دیوتاؤں کی آپس کی معرکہ آرائیوں کے حال بیان کیے جاتے ہیں اور نہ کپڑوں پر ان معرکوں کے کشیدے کاڑھنے کی اجازت دینی چاہیے۔ پھر ان دوسرے بے شمار جھگڑوں کے متعلق بھی ہمیں خاموشی اختیار کرنی چاہیے جو دیوتاؤں اور سورماؤں یا ان کے دوستوں اور عزیزوں میں ہوئے۔ اگر یہ لوگ باور کریں تو ہم تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہیں کہ جنگ وجدال سخت ناپاک کام ہے اور آج تک اچھے شہریوں میں کبھی جھگڑا فساد نہیں ہوا۔ بچپن ہی سے ان بچوں کے سامنے بوڑھوں اور بوڑھیوں کو ان باتوں پر زور دینا چاہیے اور اس کے بعد جب یہ ذرا بڑے ہو جائیں تو شاعروں کو ایسے خیالات نظم کر کے ان کے سامنے پیش کرنا چاہئیں۔ مگر اس قسم کے بیانات کو ہیفیسٹس نے اپنی ماں ہیری کو باندھ کر ڈال دیا، دوسرے موقع پر زیس نے اسے اس تصور پر نکال دیا تھا کہ اس نے مار پڑتے وقت اپنی ماں کی طرفداری کی تھی، ہم ہرگز اپنی ریاست میں روا نہ رکھیں گے خواہ شاعر نے انہیں تمثیل اور استعارے کے طور پر ہی کیوں نہ استعمال کیا ہو۔ کیونکہ ایک کمسن آدمی یہ تمیز نہیں کر سکتا اس سے لفظی معنیٰ مراد ہیں یا محض تمثیل۔ اور اس عمر میں ذہن کی حالت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جس چیز کا اثر پڑ جاتا ہے پتھر کی لکیر بن جاتا ہے۔ اور اسی لئے یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ بچپن میں جو قصے کہانیاں سنائی جائیں وہ پاک خیالوں کا نمونہ ہوں۔

کتاب ریاست میں صفحہ نمبر 269 پر یوں مکالمہ افلاطون درج ہے۔ تم واقف ہو کہ ذکاوت، حافظہ، ہوشمندی اور فہم، چالاکی اور دوسری ایسی ہی صفات اکثر یکجا نہیں ملتیں اور جن لوگوں میں یہ ہوتی ہیں، اور وہ ساتھ ساتھ فراخ دل اور عالی حوصلہ بھی ہوں تو فطرت کی طرف سے ان کی کچھ ایسی ساخت ہوتی ہے کہ وہ منظم، پرامن، پرسکون اور ایک مستقل وضع کی زندگی نہیں گزار سکتے، ان کے ہیجانات انہیں جدھر چاہتے ہیں لے جاتے ہیں اور ان کی تمام ٹھوس اصلیت ان سے ضائع ہو جاتی ہے۔

صفحہ نمبر 340 پر درج ہے۔ اور اگر آپ خود ہی نہ چاہیں تو صلاحیت کے باوجود آپ کے لئے حکومت کرنا یا محکوم بننا لازمی نہیں نہ یہ ضروری ہے کہ جب سب جنگ کریں، تو آپ بھی جنگ کریں، یا سب امن سے رہتے ہوں تو آپ بھی امن سے رہیں۔ ہاں آپ ہی کا جی چاہے تو اور بات ہے۔ نہ یہ ہی ضروری ہے کہ اگر کوئی قانون آپ کو کسی عہدے پر کام کرنے سے یا قاضی بننے سے منع کرتا ہے اور آپ کا جی چاہے اس کو چاہتا ہے تو آپ اس عہدے کو نہ حاصل کر سکیں یا قاضی نہ بن سکیں۔ کیا زندگی کا یہ طریقہ کم سے کم ایک لمحے کے لئے نہایت ہی خوش آئند نہیں معلوم ہوتا؟

افلاطون کا فلسفہ صحت

موسیقی کی طرح ورزش کی تعلیم بھی اوائل عمر ہی میں شروع ہونی چاہیے۔اس کی تعلیم پر بہت توجہ کی ضرورت ہے اور اسے تمام عمر جاری رکھنا ہے۔میرا تو عقیدہ ہے، اور میں اس بارے میں آپ سے اپنی رائے کی تصدیق چاہتا ہوں، لیکن بہرحال میرا عقیدہ ہے کہ جسم اپنی خوبی سے روح کو ترقی نہیں دیتا بلکہ اس کے برعکس ایک صالح روح اپنی خوبی سے حتی الامکان جسم کی ترقی کا باعث ہوتی ہے کیوں۔آپ کی کیا رائے ہے؟

ایک اور مکالمہ درج ہے۔میرے خیال میں تو ان لوگوں کی جسمانی کیفیت اونگھتی، سوتی، اور غالباً صحت کے لئے مضر ہوتی ہے۔تم نے دیکھا ہوگا کہ کسرتی لوگ ساری عمر بس سوتے سوتے ہی گنوا دیتے ہیں اور جہاں ذرا اپنے معمول سے ادھر ادھر ہٹے کہ شدید بیماری سے دست وگریباں ہونا پڑتا ہے۔

افلاطون کا فلسفہ جنگ

اور اسی طرح جب انسان اپنے کو موسیقی سے متاثر ہونے اور کانوں کے راستے اپنی روح میں ان میٹھے اور نرم یا المناک ترانوں کو داخل ہونے دے جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور جب اس کی ساری زندگی نغمہ سرائی اور انبساط موسیقی میں صرف ہو تو اس عمل کے ابتدائی درجوں میں تو اس کی طبیعت میں لوہے کا سا لوچ پیدا ہو جائے گا لیکن اگر نرم کرنے کا یہ عمل ذرا زیادہ جاری رہا تو پھر دوسری منزل گلنے اور ضائع ہونے کی ہے، حتیٰ کہ یہ سارا جذبہ فنا اور روح کی ساری قوت زائل ہو کر وہ جنگ آزمائی کے معیار سے نہایت کمزور انسان رہ جائے گا۔

ایک دوسرے مکالمے میں افلاطون کا کہنا ہے۔ اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم اپنے سپاہیوں کے انتخاب اور انہیں ورزش اور موسیقی کی تعلیم دینے میں اس قدر محنت اور جانفشانی کیوں کر رہے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ان پر قانونوں کا رنگ چڑھائیں تاکہ فطری جوہر اور اچھی تعلیم سے قابل خوف اشیاء نیز دوسرے معاملوں کے متعلق ان کے خیالات پکے اور انمٹ ہو جائیں اور یہ رنگ راحت والم، آرام و تکلیف، خوف و آرزو جیسی رنگ کاٹنے والی چیزوں سے بھی نہ اڑ سکے کہ یہ چیزیں اس امر میں اچھے سے اچھے کھار صابون سے زیادہ کارگر ہوتی ہیں۔ میں اسی قوت کو جو قابل خوف اور نا قابل خوف چیزوں کے متعلق صحیح اور آئینی خیالوں کو محفوظ رکھتی ہے ہمت اور جرات سے تعبیر کرتا ہوں اور آپ معترض نہ ہوں تو اسی نام سے اسے موسوم کروں۔

کتاب ریاست میں صفحہ نمبر (227) پر افلاطون یوں مکالمہ پیش کرتا ہے۔ تو ذرا سوچو کہ اگر کسی شہر میں وہ کیفیت پیدا ہو جسے ہم نے فساد کا نام دیا ہے۔ یعنی شہر میں دو فرقے ہو جائیں اور یہ دونوں لگیں ایک دوسرے کی زمینوں کو تاخت و تاراج کرنے اور مکانوں کو آگ لگانے تو یہ لڑائی کس قدر فتنہ خیز ہو جائے گی۔ ملک کا کوئی سچا محبت کرنے والا کس

طرح اپنے کو اپنی ماں (مادر وطن) اور دائی (پرورش کرنے والے وطن) کے ٹکڑے کرنے پر آمادہ کر سکے گا۔ البتہ فاتح اگر مفتوح کو اس کی سالانہ فصل سے محروم کر دے تو اس میں پھر بھی کچھ معقولیت ہے۔ لیکن اس میں بھی ان کے دلوں میں صلح اور امن ہی کا خیال ہوگا اور وہ ہرگز ہمیشہ برسرپیکار رہنے کا ارادہ نہ کریں گے۔

چونکہ خود بھی یونانی ہیں اس لئے یونان میں تاخت وتاراج نہ کریں گے، نہ کبھی مکانوں کو آگ لگائیں گے۔ نہ یہ خیال کریں گے کہ کسی شہر کی ساری کی ساری آبادی، نہ کبھی مکانوں کو آگ لگائیں گے۔ نہ یہ خیال کریں گے کہ کسی شہر کی ساری کی ساری آبادی، مرد، عورت، بچے سب ہی ان کے دشمن ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ جنگ کا جرم چند آدمیوں تک محدود ہوتا ہے اور اکثریت دراصل ان کی دوست ہے۔ ان وجوہ سے یہ نہ تو ان کی زمینیں خراب کریں گے۔ نہ ان کے مکان مسمار کریں گے۔ ان کی دشمنی بس اس وقت تک رہے گی جب تک کہ معصوم مظلوموں کی اکثریت ان چند مجرموں کو اپنے جرم کی تلافی کرنے پر مجبور کر دے۔

صفحہ نمبر 382 پر درج ہے۔ چنانچہ جو لوگ عقل اور نیکی سے نا آشنا ہیں اور سدا زبان کے چٹخارے اور نفسانی شہوتوں کی تسکین میں مشغول، وہ بس درمیانی درجے تک ہی اوپر نیچے آتے جاتے رہتے ہیں اور ساری عمر اسی علاقے میں ادھر ادھر مٹرگشت کیا کرتے ہیں اور حقیقی عالم بالا میں بیچاروں کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ نہ تو خود یہ ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں، نہ وہاں کی راہ کا انہیں پتہ چلتا ہے نہ یہ حقیقی وجود سے پر ہوتے ہیں اور نہ خالص اور دائمی مسرت سے ان کے کام و ذہن لذت یاب ان کی مثال بس مویشیوں کے ایک گلے کی سی ہے، کہ آنکھیں نیچی کئے اور اپنا سر زمین کی طرف یعنی اپنے دسترخوان کی طرف جھکائے ہیں کہ کھا کھا کر پھول رہے ہیں اور اپنی نسل بڑھا رہے ہیں۔ پھر ان مسرتوں سے انتہائی عشق کے باعث اپنے آہنگی سینگوں اور اپنی نسل بڑھا رہے ہیں۔ پھر ان مسرتوں سے انتہائی عشق کے باعث اپنے آہنگی سینگوں اور کھروں سے ایک دوسرے کو ٹکریں اور لاتیں مارتے ہیں اور غیر تسکین پذیر خواہش کی خاطر ایک دوسرے کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ اپنے کو ایک غیر حقیقی شئے سے بھر لیتے ہیں۔ لہٰذا ان کا وہ حصہ بھی جسے یہ پر کرتے ہیں غیر حقیقی، بے قابو اور بے لگام ہو جاتا ہے۔

افلاطون کا فلسفہ مثالیت

یونان میں فسطائیت کا دور

یونانی ابتدائی فلسفے کا دور انیکسے گورس پر ختم ہوا جس میں کائنات کی تشریح اور وجہ ڈھونڈے کی کوشش کی گئی، یونانی فلسفے کا دوسرا دور سوفسٹ سے شروع ہوا۔ جس میں کائنات میں انسان کی حیثیت دریافت کی گئی، سوفسطائیوں کی گمراہ کن تعلیمات کے دور میں سقراط منظر عام پر آیا۔

سقراط کا مثالی ریاست کا ادراک

سقراط نے اقتصادی نظام میں برملا کہا: کہ اگر انسان سمجھے تو رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا مکان، کھانے کے لئے سادہ غذا اور پہننے کے لئے عام کپڑوں کی ضرورت ہے، اور اس کی یہ تمام ضروریات حکومت اسے بہم پہنچائے اور فرد اس کے بدلے میں اپنے پیشے کو پوری دلجمعی اور شوق سے کرے کیونکہ معاشرے کا ہر فرد اپنے ذہنی رجحان کے مطابق کوئی نہ کوئی کام معاشرے کی خدمت کے لئے سرانجام دے گا، تب ہی ریاست سے اپنی بنیادی ضروریات حاصل کرنے کا حقدار ٹھہرے گا، ریاست کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے جو عاقل و دانا اور منصف مزاج ہوں، حقیقی علم کی بنیاد عقلی استدلال اور ذہنی شعور ہے، اور کسی چیز کا ایک خاص تصور ہی عقلی استدلال کی بنیاد ہے، اور ایک عالم کبھی غلطی نہیں کرسکتا، نیکی ایک علم ہے، لہٰذا سکھایا پڑھایا جاسکتا ہے۔ نیکی کی تمام اقسام علم سے نکلتی ہیں۔ اور تمام اخلاقیات علم سے جنم لیتے ہیں۔"

افلاطون کا "نظریہ خیال" اور مثالی علم

سقراط کے بعد افلاطون نے اپنی تھیوری آف آئیڈیاز میں کہا کہ انسانی علم کے دو

ذرائع ہیں۔

(1) ایک حواس خمسہ کے افعال

(2) دوسرا عقلی استدلال

حواس خمسہ سے مادی دنیا کی اشیاء کا تجربہ حاصل ہوتا ہے، اور عقلی استدلال سے عمومی یا آفاقی تصورات وخیالات کا ادراک ہوتا ہے، اور خیالات وتصورات کا جہاں اصل حقیقت اور سچائی ہے، اور یہی حتمی وجود ہے، جبکہ حواس خمسہ کا جہاں عدم وجود ہے۔

مثالی تصورات

خیالات اشیاء میں پنہاں ہیں اور آفاقی تصورات وجود اور عدم وجود کے درمیان میں ہیں۔ کسی چیز کا آفاقی تصور ایک ہوتا ہے، خیال زمان ومکاں کی قید سے آزاد حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء مسلسل تغیر پذیر ہیں۔

تصورات کی تین اقسام ہیں:۔

(1) اخلاقی تصورات...... جیسے انصاف نیکی اور خوبصورتی

(2) مادی اشیاء کے تصورات جیسے گھوڑا، انسان درخت وغیرہ

(3) خصوصیات یا صفات کے تصورات جیسے بہادری، ہمدردی وغیرہ

......نیکی کے اوصاف بدی اور انصاف کے ساتھ بے انصافی کا تصور موجود ہے، جس طرح ایک آفاقی تصور اپنے جیسی بہت سی چیزوں کی نمائندگی کرتا ہے، اسی طرح ایک بلندتر تصور اپنے سے چھوٹے تصورات کی نمائندگی کرتا ہے، تمام تصورات مل کر ایک سب سے بڑے تصور کے تحت آتے ہیں۔ اور یہ سب سے بڑا یا بڑا ترین تصور ایک ہے، حتمی ہے، ایک عملی حقیقت ہے، ایک ہونے کا جواز ہے، اور پوری کائنات کے ہونے کا جواز یہی سب سے بڑا تصور یا خیال ہے، کسی جسمانی شکل میں پیدائش سے قبل انسانی روح بے جسم تصورات وخیالات کی دنیا میں سوچ بچار کے عالم میں تھی، لیکن جیسے ہی وہ انسانی جسم میں داخل ہوئی، حواس خمسہ میں گم ہو کر وہ اس جہاں میں کسی خوبصورتی کو دیکھتی ہے، تو اسے خوبصورتی کے اس ایک تصور کی یاد آتی ہے، جو خیالات کی دنیا میں تھا، اور جب روح ایک

کے بعد دوسری خوبصورتی کو دیکھتی ہے، تو اسے یقین ہو جاتا ہے، کہ یہ تو اس خوبصورتی کے ایک خاص تصور والی خوبصورتی ہے، جو اپنے آپ کو ان خوبصورت چیزوں میں پیش کر رہی ہے، خوبصورت اجسام کے بعد روح خوبصورت ارواح اور پھر خوبصورت علوم کی طرف متوجہ ہو کر خوبصورتی کے ایک تصور کی جانب متوجہ ہو جاتی ہے، خوبصورتی سے محبت کا جذبہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اور یہ جذبہ انسان میں اس لئے موجود ہے، کہ وہ عقلی استدلال کی صفت سے متصف ہے۔''

مثالی حواس خمسہ

افلاطون کے ہاں طبیعیات کا تعلق مادی دنیا کے مظاہر فطرت سے ہے، وہ دنیا کی تخلیق کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے

''حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء آفاقی تصورات کی نقل یا عکس ہے، آفاقی خیالات اصل وجود اور حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء نیم حقیقی یا عدم وجود ہیں۔ اور عدم وجود کا ختمی اصول مادہ ہے، جسے آفاقی تصورات نے چیزوں میں تبدیل کر دیا ہے۔''

مثالی فلسفۂ روح

افلاطون کے مطابق خدا نے سب سے پہلے دنیا کی روح کو تخلیق کیا جو غیر مادی ہونے کے باوجود جگہ گھیرتی ہے، اس نے اس روح کو جال کی طرح خلا میں پھیلایا پھر اسے اندرونی اور بیرونی حصوں میں منقسم کیا، یہ دونوں حصے نصف دائرے کی صورت میں ہیں۔ اور ان کا مقصد یا نصیب یہ ہے کہ سیاروں اور ستاروں کے حلقے بن جائیں، بعد ازاں وہ مادہ لے کر اسے چاروں عناصر سے روح کے خالی ڈھانچے میں باندھتا ہے، جس سے کائنات کی تکمیل ہوتی ہے۔ انسانی روح بھی دنیا کی روح سے ملتی جلتی ہے اور اس سے مماثلت رکھتی ہے۔ اور یہی روح انسانی جسم میں حرکت کی وجہ ہے اور اسی دنیا میں انسان کا عقلی استدلال پنہاں ہے، انسانی روح کا تعلق آفاقی ہمہ گیر تصورات اور حواس خمسہ دونوں جہانوں سے ہے، یہ دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے، اور دونوں حصوں میں سے ایک حصہ پھر دو حصوں میں بٹ جاتا

ہے، بالائی حصہ عقلی استدلال والا ہے، جو آفاقی تصورات کے عالم کا ادراک اور فہم کرتا ہے۔ روح کا عقلی استدلال والا حصہ غیر فانی ہے، جبکہ غیر استدلالی حصہ فنا ہو جانے والا ہے، اور یہ حصہ نیکی اور بدی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مثالی کائنات

روایات کے مطابق افلاطون کو مثالیت پسندانہ فلسفے کا بانی و خالق بھی کہا جا سکتا ہے، اس کا یہ فلسفہ مجموعی طور پر عام اصولوں پر قائم ہے۔ افلاطون کے مطابق موجودہ مادی کائنات اپنی شکل وصورت اور ہیئت کے مطابق حقیقت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس حقیقی کائنات جو ماورائے کائنات میں حقیقت مطلقہ کی صورت میں موجود ہے، کا عکس یا اس کا پرتو ہے، ٹھوس مادی ہیئت میں موجود کائنات موجودات صرف ماورائے کائنات میں موجود اصل حقیقت کی حد تک حقیقی اور اس حقیقت مطلقہ کا عکس ہیں۔ اسی طرح دیگر موجودات بھی ماورائے کائنات میں موجود اصل مظاہرات کا عکس ہیں۔ بنیادی طور پر انسانی روح ایک ایسی خارجی قوت ہے۔ جو عرش سے پھوٹ رہی ہوتی ہے جو اپنی فطرت میں لافانی ہے اور اس کا تعلق اس حقیقی کائنات سے ہے جو ہمارے حواس سے بالاتر کہیں اور موجود ہے جس تک صرف عقل کے ذریعے رسائی ممکن ہے۔ انسانی ذہن اپنی فطرت میں روحانیت کا حامل ہے۔ انسان روحانی لحاظ سے لافانی ہے اور اس لحاظ سے اس کا ذہن بھی لافانی ہے۔ انسان اپنے ذہن میں موجود غیر تغیر پذیر اور لازوال تصورات کے ذریعے اس حقیقت مطلق جو ماورائے کائنات موجود ہے کی ہیئت معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

افلاطون کے خیال میں تخلیق کائنات کا مبداء واحد کوئی نہ کوئی نفس، روح، خدا یا مطلق وجود ہے۔ یہ مظہری دنیا اصل اور حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ ہر لحہ تغیر وتبدل کے عمل سے گزرتی ہے اور یہاں عروج وزوال اور موت وزیست کا لامتناہی سلسلہ جاری وساری ہے۔ یہ کائنات عمومی طور پر اپنے اصل کی نقل ہے اور ہر مظاہر فطرت کا عین مطلق عالم بالا یا عالم مقام میں موجود ہے جو غیر متبدل اور غیر فانی ہے۔

کائنات اور اس کے مظاہر ایک بامقصد تخلیق ہے۔ فطرت کا کوئی آزاد وجود نہیں ہے

فطرت کے وسیع روحانی نظام کے پیچھے کسی ایسی ہستی کا وجود ضرور موجود ہے جو اسے باضابطہ، بے مثال، خودکار اور منظم نظام کے تحت چلاتی ہے اور وہ ہستی اسی جگہ موجود ہو سکتی ہے جہاں حقیقی کائنات اپنے موجودات کے اپنے لاثانی اور لافانی فطرت میں حقیقت مطلق کی صورت میں موجود ہے۔ موجودات کائنات میں کوئی چیز اپنی فطرت اور ہیئت کے بارے میں واضح معلومات نہیں رکھتی بلکہ صرف انسان اپنی عقل کے ذریعے ان کے بارے میں ایک واضح تصور قائم کر لیتا ہے۔

مثالی دلائل

حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہونے والا علم نامکمل اور غیر یقینی ہوتا ہے حقیقی، مستند اور پائیدار علم صرف اور صرف دلیل پر مبنی ہوتا ہے۔ دلیل ہی وہ دماغی قوت ہے جو حقیقت مطلقہ تک رسائی کا ذریعہ بننے کے ساتھ ساتھ اشیاء اور موجودات کی اصل روحانی شکل کو ان کے مادی اظہار سے علیحدہ کرتی ہے۔ ہر دلیل کے پیچھے بلاشبہ عقل ہوتی ہے اور عقل ہی سچائی کو پرکھ سکتی ہے۔ انسانی عقل علم کے ذریعے معنی اور ترتیب تلاش کر کے موجودات کی نوعیت اور ان کی حقیقت کو خود پر عیاں کرتی ہے۔ نیکی، بھلائی، سچائی اور خوبصورتی کی حیثیت و نوعیت پر متغیر اور ابدی ہوتی ہے یہ نہ تو تاریخی تواتر کے ساتھ تبدیل ہوتی رہی اور نہ ہی مختلف معاشرہ میں نسل در نسل تبدیلی کے عمل سے گزرتی ہیں۔ روحانی لحاظ سے یہ اپنی فطرت میں ابدی اور مسلسل غیر تغیر پذیر ہوتی ہیں اور ان کی تخلیق میں انسان کا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ یہ اس روحانی کائنات کا حصہ ہیں جو ماورائے کائنات کہیں موجود ہے۔

مثالی معاشرہ

ایک مثالی زندگی ایک مثالی معاشرے میں ہی ممکن ہوتی ہے اور ایک مثالی معاشرہ اس وقت تک تشکیل نہیں پا سکتا جب تک کہ مثالی اقدار اس کی بنیاد نہ بنے۔ انسانی زندگی در وسیع تر کائنات کے روحانی نظام کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے اقدار سے آگاہی اور ان کی پاسداری ضروری ہے اس لئے معاشرے کے ہر فرد کو معاشرتی اقدار کی

پاسداری کرنی چاہیے۔ برائی نہ صرف پورے معاشرے کونقصان پہنچاتی ہے بلکہ کائنات کی ابدی روح کوبھی نقصان پہنچتا ہے۔ برائی ایک نامکمل اچھائی اور کائنات کی بے ترتیبی اور بے قاعدگی کا نتیجہ ہے جسے صرف علمیاتی اور مابعد الطبعیاتی تصور کے اصولوں کومعاشرہ میں منطبق کر کے ختم کیا جاسکتا ہے۔

مثالی عالم

افلاطون کا مثالی فلسفہ دنیا نہایت اہمیت کا حامل ہے، اس کے مطابق اقدار چونکہ حقیقی روحانی کائنات کا ایک حصہ ہے اس لئے انسان انہیں اپنانے پر مجبور ہے۔ حسن اپنی ہیئت میں وسیع روحانی نظام کی فطرت کا عکس ہے اور اسے کبھی بھی انسانی محسوسات کا خارجی اظہار نہیں سمجھنا چاہیے۔ افلاطون کے خیال میں عالم دو ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرا حقیقی۔ عالم مثال حقیقی اور سکونی ہے جبکہ عالم ظاہری میں حرکت وتغیر ہے جوفریب نگاہ ہے، خیر مطلق فکر محض ہے، کائنات بامعنی ہے، موت کے بعد روح باقی رہتی ہے، حسن ازل کی کشش ارواح کواپنے مبداء حقیقی کی یاد دلاتی رہتی ہے اور کائنات عقلیاتی کل ہے جس کی حقیقت کا ادراک صرف عقل استدلال ہی کرسکتی ہے۔ اس کے نزدیک کائنات ازلی وابدی ہے اور مثال اور مادہ ازل سے موجود ہیں۔ ہر مادی شے بالقوہ سے بالفعل ہوتی رہتی ہے فاعل کسی ہیئت کوخلق نہیں کرتا۔

افلاطون کا فلسفہ کلیات

کلیات کے مسئلے سے فلسفے کو سب سے پہلے افلاطون نے متعارف کرایا اور اس کی تمام نگارشات میں اس سے اس کی دلچسپی نمایاں ہے۔ پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ مسئلہ اس کے سامنے کس شکل میں آتا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی تنقیدوں اور متاخر نظریات پر نظر ڈالیں گے۔ افلاطون کی نظر ''حقیقت'' کے ایک معنی میں (گو اسے بہت سے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے) حقیقت کہا گیا ہے کیونکہ افلاطون کے خیال میں کلیات ایک مخصوص معنی میں واقعتاً موجود ہیں۔ حقیقت جزئیات اور کلیات دونوں پر مشتمل ہے۔ نیلے رنگ کی یہ منفرد مثال جزئیات (نیلی اشیاء) ہیں۔ اسی طرح یہ کلی اور وہ کلی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک کلیہ بھی ہے جیسے ''کلی ہونے کی کیفیت'' یا ''کلی پن'' کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان کلیات کے لئے کوئی الگ لفظ نہیں ہے اس لیے ''پن'' لگا کر اس کا اظہار کیا جاسکتا ہے جیسے نیلا پن، بلی پن، سیدہ پن وغیرہ۔

لیکن افلاطون کا کلیات سے سروکار خصوصاً ان دو ضمنوں میں تھا: (1) اخلاقی خصوصیات اور (2) ریاضیاتی حقائق۔ کامل نیکی یا خیر یا عدل کامل دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ کوئی مخصوص صورت حال اس کی مکمل مثال نہیں بن سکتی۔ نہ ہی دنیا میں کامل خط مستقیم یا کامل دائرہ ہوتا ہے۔ تاہم کامل خیر یا کامل استقامت (ریاضیات) کے تصورات نہیں حاصل ہوتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک کھینچی ہوئی ہندسی شکل کامل دائرہ نہیں ہے تو ہمارے ذہن میں کامل دائرے کا تصور ہوتا ہے ورنہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ شکل کامل نہیں۔ اس سے افلاطون نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی نہ کسی معنی میں کامل دوری شکل ہونی چاہیے۔ جس کی یہ مخصوص شکل ایک غیر کامل اور ناکافی مثال ہے' افلاطون کا یہ عقیدہ تھا کہ کلیات کی غیر مثالیں جزئیات ہوتے ہیں اور اس طرح سے ان کلیات سے خاص طور پر سروکار تھا جو ان جزئیات میں مظاہر نہیں ہوتے جن کا ہمیں تجربہ ہوتا ہے۔

افلاطون کے مطابق کلیات اور جزئیات کے درمیان کیا نسبت ہے؟ ان کی ماہیت

ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہے کہ ان کے درمیان کسی نسبت کا ہونا مشکل ہے۔ جزئیات زماں ومکاں میں موجود ہوتے ہیں مگر کلیات نہیں۔ خواہ کوئی منفرد مثال کامل دائرہ کی نہ ہوتا تاہم کامل دائریت کا وجود ہوتا ہے۔ گو صرف اقلیم کلیات میں جو زماں کی قید سے آزاد اور غیر متبدل پذیر ہے۔ دنیا میں نیلی چیزوں کا وجود ہوتا ہے' نیلا پن کا نہیں۔ لیکن یہ بات اب تک واضح نہیں ہوئی کہ دونوں کس طرح ایک دوسرے سے منسوب ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر افلاطون کا ایک واحد متوافق نظریہ نہیں ہے تاہم اس کی تمام تر نگارشات کی روشنی میں دو اہم نظریوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

1۔ صورت اولیٰ (ARCHETYPE): افلاطون کے اولین مکالموں میں جو نظریہ پایا جاتا ہے۔ اس کی روشنی میں دونوں کے درمیان اصل اور اس کی نقل کی نسبت ہے یا نمونہ اور اس کی نقل کی درمیانی نسبت۔ دنیا میں جو گھوڑے ہیں وہ تمام تر غیر کامل ہیں اور حقیقت میں کہیں کامل گھوڑے کا وجود نہیں۔ جس کی حقیقت گھوڑے کی نقل ہیں اور یہی بات تمام گھوڑوں کے بارے میں صادق ہے۔

لیکن دو عالم تصور کامل اشیاء بمقابل نقلوں کے عالم' خواہ کتنا ہی قابل قبول اور دلچسپ معلوم ہو لیکن کلیات نظر کے لیے یہ کافی نہیں ہے کیونکہ ایک نمونہ یا صورت اولی آخر ایک منفرد شئے ہے جو خواہ کامل کیوں نہ ہو پھر بھی منفرد ہوتے ہوئے زمان ومکاں میں موجود ہوتا ہے۔ نقل اس چیز کے درمیان جس کی یہ نقل ہے جو نسبت ہے وہ ایک منفرد شئے کے درمیان جو نسبت ہوتی ہے وہی ہے۔ ممکن ہے دونوں میں کامل مطابقت نہ ہو اور اس لیے ہم ایک کو دوسرے کی غیر کامل ناقص نقل کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ایک کلیے کی ایک منفرد مثال کامل یا غیر کامل کیسے ہوسکتی ہے؟ ایک مخصوص رنگ آیا نیلے پن کی مثال ہے یا نہیں ہے۔ نقل اور اصل نمونے کے درمیان جو نسبت ہوتی ہے وہ مثال کی نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں کو افلاطون نظریہ شاعرانہ اور رفعت بخش نظر آتا ہے کیونکہ اس کا یہ عقیدہ کہ زمان ومکاں سے پرے ایک عالم ارفع وکامل وجود ہے بہت سے لوگوں میں جوش وخروش کا احساس پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کی جو بھی خوبی ہو کامل وغیر کامل دنیا کا یہ مقابلہ کلیات کا نظریہ پیش کرتا کیونکہ کامل جزئیات بہرحال جزئیات ہی نہیں۔ نمونہ (اصل) ونقل کا تصور محض ایک استعارہ ہے۔

2۔شرکت(PARTICIPATION): اس سلسلے میں افلاطون ایک دوسرا استعارہ استعمال کرتا ہے جو ''شرکت'' ہے جزئیات کلیات میں شریک ہوتے ہیں۔لیکن یہاں ''شرکت'' کو غیر معمولی معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔کیا جزئیات کلیات میں اس طرح شریک ہوتے ہیں جس طرح لوگ دعوت میں شریک ہوتے ہیں؟ اگر ہاں تو جس طرح بہت سے لوگوں کے دعوت میں شریک ہونے سے کھانا ختم ہوسکتا ہے کیا اسی طرح بہت سے نیلے جزئیات کا نیلا پن میں شریک ہونے سے اس کے ناکافی یا کم ہونے کا خدشہ ہوسکتا ہے؟ افلاطون کے مطابق مثال کے طور پر بادبان زیادہ لوگوں کے لیے ناکافی ہوسکتا ہے اسی طرح کیا بہت سے جزئیات کے ہونے سے کلیہ ناکافی ہوگا؟

یہ تصور بھی کلیات کے نظریے کی حیثیت سے ناکافی ہیں۔جس چیز میں شرکت کی جاتی ہے وہ بھی اتنی ہی منفرد ہے جتنی وہ اشیاء جو شریک ہوتی ہیں۔بادبان گو بڑا ہی تاہم اس طرح ایک منفرد ہے جس طرح وہ اشخاص جو اس کے سائے میں آتے ہیں۔افلاطون نے بیشک ان باتوں کا ذکر تمثال کے طور پر کیا ہے مگر ان تمام قیاس آرائیوں یا مثالوں میں یہ لازمی ہے کہ دونوں میں کچھ مواد ضرور ہو گو مطابقت نہ ہو، مگر مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں ہم نے دیکھا کہ ہر دو چیزوں (اصل ونقل اور وہ شئے جس میں کوئی شریک اور شریک ہونے والی شئے) جز ئیہ اور جز ئیہ کی نسبت ہے۔

یہ ممکن ہے کہ افلاطون خصوصاً بیک وقت دو کام کرنا چاہتا ہے .... ایک تو عالم تصور کی تشکیل اور دوسرا نظریہ کلیات۔لیکن اس کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو نظریہ کلیات کے ضمن میں اس کا تصور غیر تشفی بخش ہے۔کلیات و جزئیات کے درمیان نسبت اس طرح کی نہیں ہوسکتی جیسی افلاطون نے پیش کی ہے۔اس نسبت کا زیادہ مناسب بیان وہ ہے جس کی طرف اس نے اشارہ تو کیا ہے مگر صریحاً بیان نہیں کیا۔ان دونوں میں مثال ہونے یا بننے کی نسبت ہے جو دیگر نسبتوں سے مختلف ہے اور اس لیے اس کو کسی دیگر نسبت سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی ہے۔ایک نیلی منفرد شئے نیلے پن کی مثال ہے اور یہ مثلث پن کی مثال ہے۔منفرد شئے اور خصوصیت کے درمیان جو نسبت ہے وہ ہمیشہ مثال ہونے کی ہے۔

اس میں ایک وقت ہے جس کا احساس افلاطون کو تھا اور اس نے اس سے بحث بھی کی

ہے۔ مثلث‘ مثلث پن کی اور نیلا آسمان‘ نیلے پن کی مثالیں ہیں۔ لیکن کیا یہ بڑی شئے بڑے پن کی مثال ہے؟ کیا الف جنوب کے شمال میں ہے شمال پن کی مثال ہے؟ لیکن یہ ممکن نہیں۔ چیزیں بذات خود بڑی یا چھوٹی نہیں ہوتیں بلکہ دوسری چیزوں کے مقابل انہیں بڑی یا چھوٹی کہا جاتا ہے۔ اگر دنیا میں صرف ایک شئے ہوتی...... مثلاً ہاتھی...... تو یہ نہ تو چھوٹی ہوتی اور نہ بڑی۔ یہ دونوں اضافی حدود ہیں۔ ہاتھی چوہے کے مقابلے میں بڑا اور مکان کے مقابلے میں چھوٹا ہوتا ہے۔ ''بڑا پن'' ایک خصوصیت نہیں بلکہ نسبت ہے یا اسے اضافی خصوصیات کہہ سکتی ہیں۔ اسی طرح شمال میں ہونا بھی ایک نسبت ہے۔ مثلاً لندن کی مناسبت سے اڈنبرا شمال میں ہے۔ اس امر کو ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ حقیقت میں تین اجزاء یا موجودات میں جزئیات، کلیات اور نسبتیں یا اس سے زیادہ غیر گمراہ کن طرز بیان یہ ہوگا کہ کائنات میں صرف دو چیزیں ہیں۔ جزئیات اور کلیات اور کلیات کو یوں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (1) خصوصیات (مربع پن، نیلا پن وغیرہ) اور (2) نسبتیں (اوپر ہونا، شمال میں ہونا وغیرہ) خصوصیات اور نسبتوں کی مثالیں ملتی ہیں اور اس لئے یہ دونوں کلیات ہیں۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنا اہم ہے کہ نسبتوں کو ذہن کے حیطے میں شامل نہیں کیا جا سکتا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جبکہ اشیاء ''خارجی دنیا'' میں ہیں ان کے درمیان نسبتیں ذہن کی پیداوار ہے۔ افلاطون اس سے پوری طرح باخبر تھا۔ ایتھنس اور اسپارٹا (قدیم یونان مدائن جن میں ایتھنس اسپارٹا سے بڑا اور اس کے شمال میں تھا) کے درمیان نسبتیں اتنی ہی معروضی اور خارجی نہیں جتنا کہ ان کا وجود۔ افلاطون نے کہا کہ کلیات کا وجود اتنا ہی معروضی ہے جتنا ان چیزوں کا جو ان کی مثال بنتی ہیں۔ تو افلاطونیت کا یہ نظریہ بھی صحیح نہیں کہ کلیات محض ذہن کے اندر خیالات ہیں کیونکہ یہ خیالات بھی جزئیات ہیں۔ اگر میں ایتھنس کے بارے میں سوچتا ہوں تو یہ خیال ایک مخصوص یا منفرد خیال ہے جس طرح آپ کے ذہن میں اسی کا خیال...... گو یہ طبعی نہیں بلکہ ذہنی جزئیہ ہے۔ خیالات، خواب اور دیگر ذہنی مظاہر اسی طرح جزئیات ہیں جس طرح وہ منفرد اشیاء جن کے خیالات ہمارے ذہن میں ہوتے ہیں۔ افلاطون خصوصاً اس نظریے کے خلاف تھا کہ ریاضیاتی حقائق صرف ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ جب کوئی کسی ریاضیاتی فارمولا بنیادی ومسلمہ اصول کی دریافت کرتا ہے تو یہ ایجاد نہیں

ہوتی اور یہ دریافت کسی حقیقی شئے کی ہے۔ ایک اصول مسلمہ، ایک چیز ہے اور اس کا خیال دوسری چیز۔ خدا کے ذہن میں بھی خیالات (جنہیں کچھ عیسائی مفکروں نے کلیات کا مترادف بنایا تھا) جزئیات ہیں جو ایک مخصوص ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ خواہ یہ ذہن فوق ذہن کیوں نہ ہو۔ جزئیات کو کلیات کا ہم معنی بتانا ایک مغالطہ قسم (Category Mistake) ہے۔

کلیات کو قیاس کے طور پر بھی کسی ایسی چیز کا مماثل نہیں ٹھہرانا چاہیے۔ جو جزیہ ہو کیوں کہ ایسا کرنا انہیں کلیات تسلیم نہ کرنا ہے۔ کلیات و جزیات کی درمیانی نسبت کسی اور نسبت کی مانند نہیں ہے۔ لیکن یہ بہت ممکن ہے کہ اسے ایک مختلف نسبت سے جو جنس اور اس کی انواع کے درمیان ہوتی ہے ملا دیا جائے۔ گلناری یا قرمزی رنگ سرخ رنگ کی نوع ہے اور سرخ جنس رنگ کی نوع ہے۔ لیکن جنس اور نوع کی نسبت کلیات کے سلسلہ مدارج میں ایک کلیہ کی دوسرے کلیے سے نسبت ہے۔ ایک وسیع تر کلیہ (رنگ) ایک محدود تر کلیہ (نیلا پن) کو اپنے اندر شامل رکھتا ہے۔ نیلا پن بھی ایک کلیہ ہے جس کی مثالیں نیلی چیزیں ہیں۔ نیلے رنگ کے تحت اگر ہم لاکھوں مختلف رنگوں کو ممیز کر سکیں پھر ہر مخصوص مختلف رنگ کا ایک کلیہ ہوگا جس کی کچھ مثالیں بھی مل سکیں گی اور اس کی ہر مخصوص مثال ایک جزیہ ہوگا۔ کلیات کی اسی طرح بڑی اور چھوٹی اصناف ہوتی ہیں اور صرف اس معرفہ سے مقصود ایک منفرد شئے ہے جو کسی خصوصیات کے نام سے نہیں مگر جب ان میں سے ایک مخصوص کتے کا نام ''ٹومی'' ہوتا ہے تو یہ کسی خصوصیات کا نام نہیں بلکہ ایک منفرد مخلوق کا نام ہے۔

افلاطون کے مطابق کلیات ہوتے ہیں جن کا وجود زیات کے وجود سے مختلف ہوتا ہے اگر ان کی منفرد مثالیں نہ بھی ہوں تاہم ان کا وجود ممکن ہوگا۔ اگر کے معنی یہ نہیں (جیسا افلاطون اپنے اولین مکالموں میں تسلیم کرتا ہے) کہ کہیں نہ کہیں ایک کامل دائرہ ہوتا ہے۔ خواہ اس کی منفرد مثال نہ ہو کیوں کہ اگر کسی کامل دائرہ کا وجود ہے تو وہ بھی ایک منفرد شئے ہے جو بذات خود ''دائریت'' (کلیہ) کی مثال ہے۔ کامل دائرہ خود دائریت نہ ہو کر دائریتی کی مثال ہے۔ لیکن افلاطون اپنے اس نظریے میں حق بجانب تھا کہ ہم ان الفاظ کے معنی تصور کر سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ جن سے مقصود خصوصیات کا وجود کائنات میں نہ ہو۔ مثلاً دس

لاکھ اضلاع والی ہندسی شکل ''ارنا گھوڑا'' بھوتنا وغیرہ جن کی حقیقت میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان میں سے جو خصوصیات مقصود ہیں ان کی مثالیں نہیں ملتی تاہم ان کا تصور ممکن ہے۔ افلاطون ان کے متعلق یہ کہے گا کہ ان تمام کلیات کا وجود ہے اور یہ گویا اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کی مثالیں پیدا ہوں۔ لیکن اقلیم کلیات میں یہ حقیقی ہیں گو ان کی منفرد مثال نہیں ہیں۔

ہمیں ان کے تصورات کیسے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ہم نے ان کی مثالیں کبھی نہ دیکھی ہوں؟ افلاطون نے اس کی توضیح کے لئے مقابل وجود کا نظریہ اپنایا لیکن یہ ضرورت نہیں۔ ہم سادہ تصورات کو یکجا کر کے مرکب تصورات حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک بظاہر سادہ تصور مثلاً استقامت (سیدھا پن) کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟ ہم نے اب تک ایک قطعی خط مستقیم نہیں دیکھا تاہم یہ ہم جانتے ہیں کہ خط مستقیم کیا ہے۔ لیکن اس مثال کے لئے بھی ماقبل وجود کا نظریہ ضروری نہیں۔ استقامت کا تصور ہمیں ان اشیاء سے دستیاب ہوتا ہے جن ہیں ہم دیکھتے اور چھوتے ہیں۔ بیشک کاغذ پر پنسل سے جو خط آپ کھینچتے ہیں وہ صحیح معنوں میں خط مستقیم نہیں ہے لیکن یہ مستقیم نظر آتا ہے اور استقامت کا تصور ان مشاہدات سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی خط کو اگر خوردبین سے دیکھا جائے تو ٹیڑھا میڑھا نظر آئے گا۔ لیکن ہمارا تصور اس کے بغیر چیزوں کو دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ سچ پوچھیے تو علم الہندسہ کی اشکال (دائرہ، نقطہ وغیرہ) کوئی نہیں دیکھ سکتا لیکن جو شکلیں ہم دیکھتے ہیں وہ ہمیں دوریت، استقامت وغیرہ کے تصورات بخوبی بہم پہنچاتے ہیں۔

یہ تو ان تصورات کے مبدا کے بارے میں بات ہوئی لیکن یہ تصور کسی چیز کا تصور ہے اور افلاطون کے مطابق یہ کلیہ ہے۔ تصور ہمارے ذہن میں ہے مگر یہ تصور جس چیز کا ہے وہ ہمارے ذہن میں نہیں بلکہ خارجی طور پر حقیقت کا حصہ ہے اور حقیقت میں دو طرح کی چیزیں ہیں، جزئیات جو کلیات کی مثال ہیں اور کلیات جن کی مثالیں ہوتی ہیں۔ گو کلیات کا مشاہدہ جزئیات کی طرح ممکن نہیں۔

کلیات کی تشکیل

کلیات کے نہایت پیچیدہ مسئلہ کو جسے بہت سے فلسفی مابعد الطبیعات کا مرکزی مسئلہ

سمجھتے ہیں کے فلسفہ کو سب سے پہلے افلاطون نے متعارف کرواتے ہوئے کہا کہ کلیات ایک مخصوص معنی میں واقعتاً موجود ہیں، حقیقت منفردات اور کلیات دونوں پر مشتمل ہے، اخلاقی خصوصیات اور ریاضیاتی حقائق کا کلیات حصہ ہیں، کامل نیکی یا عدل پوری دنیا میں موجود نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں کامل خط مستقیم یا کامل دائرہ ہوتا ہے اور کلیات کی غیر کامل مثالیں منفردات ہوتے ہیں۔

کلیات اور منفردات کی ماہیت

افلاطون کے نزدیک کلیات اور منفرد منفردات کی ماہیت ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہے کہ ان کے درمیان کسی نسبت کا ہونا مشکل ہے۔ منفردات زمان ومکان میں موجود ہوتے ہیں مگر کلیات نہیں۔ کامل دائرہ کی کوئی منفرد مثال نہ ہونے کے باوجود کامل دائریت کا وجود ہوتا ہے اس کے خیال کے مطابق دنیا میں نیلی چیزوں کا وجود ہوتا ہے نیلے پن کا نہیں۔

افلاطون کے ادلین مکالموں میں یہ نظریہ موجود کہ دنیا میں جو گھوڑے ہیں وہ تمام تر غیر کامل ہیں اور حقیقت میں کہیں کامل گھوڑے کا وجود ہے جس کی حقیقی گھوڑے نقل ہیں اور یہی بات تمام چیزوں کے بارے میں صادق آتی ہے۔ اس نے لفظ شرکت کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ منفردات کلیات میں شریک ہوتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک کلیات کا وجود اتنا ہی معروضی ہے جتنا ان چیزوں کا وجود ان کی مثال بنتی ہیں۔ کلیات ہوتے ہیں جن کا وجود منفردات کے وجود سے مختلف ہوتا ہے اگر ان کی منفرد مثالیں نہ بھی ہوں تب بھی ان کا وجود ممکن ہوگا۔ تصور ہمارے ذہن میں ہے مگر یہ تصور جس چیز کا ہے وہ ہمارے ذہن میں نہیں بلکہ خارجی طور پر حقیقت کا حصہ ہے اور حقیقت میں دو طرح کی چیزیں ہیں منفردات جو کلیات کی مثالیں ہیں اور کلیات فن کی مثالیں ہوتی ہیں گو کلیات کا مشاہدہ منفردات کی طرح ممکن نہیں۔

ارسطو نے افلاطون کے اس نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ منفردات سے الگ کلیات کی دوسری دنیا نہیں۔ اگر دوسرے عالم کا وجود تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی یہ عالم کلیات نہیں ہوگا بلکہ منفردات کا دوسرا عالم ہوگا جو کامل تر منفردات پر مشتمل ہوگا۔

افلاطون کا فلسفہ خیالات وتصور

تھیوری آف آئیڈیاز

افلاطون کی تھیوری آف آئیڈیاز کی بنیاد سقراط کی تھیوری آف نالج پر ہے۔ اس تھیوری کی ابتدا ''علم کیا ہے'' اور ''حقیقت کیا ہے'' سے کرتے ہوئے وہ علم یا حقیقت کے متعلق پروٹے گورس کے اس نظریہ کو کہ ''حواس خمسہ علم ہے اور جو چیز جس آدمی کو جیسی نظر آتی ہے وہ اس کے لئے ویسی ہی ہے'' کو رد کرتے ہوئے ثابت کرتا ہے کہ حواس خمسہ کے محسوسات یا حواس خمسہ کا عمل علم نہیں بلکہ یہ ایک دھوکا اور فریب ہے۔

حواس خمسہ کے پہلو

اولاً حواس خمسہ کے عمل کے ذریعے مستقبل کے واقعات یا حالات کی پیشگوئی ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص کی سوچ ہے کہ وہ اگلے سال چیف جسٹس ہوگا لیکن وہ اس کے برعکس قیدی بن جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیشن گوئی کا درست ہونا ضروری نہیں ہے۔ دوم حواس خمسہ کے تاثرات عموماً متضاد ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک چیز دور سے چھوٹی نظر آتی ہے جبکہ قریب سے بڑی۔ ایک چیز سرخ روشنی میں سرخ نظر آتی ہے نیلی روشنی میں نیلی اور اندھیرے میں اس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ ایک چیز کو اگر ایک مخصوص زاویہ سے دیکھا جائے تو وہ ایک خاص صورت میں نظر آتی ہے جبکہ زاویہ بدلنے سے اس چیز کی صورت بدلی ہوئی نظر آتی ہے سوم اگر حواس خمسہ کا عمل علم ہے تو حواس خمسہ کے عمل کے تمام تاثرات درست ہونے چاہئیں جبکہ ایک چیز کے بارے میں دو آدمیوں کی بحث دو مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے اور ان دونوں کے تاثرات سے ہٹ کر اصل حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ چہارم

اگر حواس خمسہ کا عمل علم ہے تو پھر ایک جانور جو محسوس کرتا ہے یا سمجھتا ہے وہ بھی علم ہے۔ پنجم پروٹے گورس کا یہ کہنا کہ ایک چیز ایک آدمی کو درست نظر آتی ہے تو وہ اس کے لئے درست ہے اور اگر وہی چیز دوسرے شخص کو غلط نظر آتی ہے تو وہ اس کے لئے غلط ہے بذات خود اس کے نظریہ کی نفی کرتا ہے مزید اس کا یہ فلسفہ، درست اور غلط، جائز اور نا جائز، روا اور نا روا، انصاف اور بے انصافی میں فرق نہیں کرتا۔ ششم علم صرف حواس خمسہ کے اعمال پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اس میں عقل کے عمل کی شمولیت ضروری ہے۔ دماغ کے عمل کا نام سوچنا ہے اور دماغ حواس خمسہ ایک علیحدہ چیز ہے اور اس کا عمل بھی ان کے اعمال سے علیحدہ ہے۔ دماغ حواس خمسہ سے برتر ہے اور اس کا عمل بھی حواس خمسہ کے اعمال سے برتر حیثیت کا حامل ہے۔

علم میں خیال کی اہمیت

افلاطون کے نزدیک کسی چیز کے بارے میں حقیقی علم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عالم اس بات سے ہی واقف نہ ہو کہ یہ چیز ایسی ہے یا اس طرح ہے بلکہ اس کو اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ یہ چیز ایسی کیوں ہے۔ کسی تبدیلی کے بغیر حقیقی علم اس چیز کے ''خیال یا تصور'' کے اندر پنہاں ہے اور ایک خیال یا تصور ایک وضاحت کے مماثل ہوتا ہے اور یہ وضاحت اور تصور حتمی اور آفاقی ہوتا ہے اور یہ کسی فرد کی ذاتی رائے یا تاثر کا تابع نہیں ہوتا۔ وہ ایک معروضی حقیقت ہوتا ہے۔ اس کا اپنا وجود اور اپنی حقیقت ہوتی ہے اور کوئی شخص اپنی ذاتی رائے یا تاثر سے اس معروضی حقیقت کے باوجود اصلیت کو تبدیل نہیں کر سکتا اور ایک خیال یا تصور یا وضاحت کی بنیاد عقلی استدلال پر ہوتی ہے۔

عقلی مباحثہ کی ضرورت

جدلیات کے لفظی معنی کسی چیز کے بارے میں عقلی بحث مباحثہ ہے۔ سقراط کے مطابق جدلیات کا مطلب خیالات کا اصول ہے اور اس کا یہ نظریہ رہا ہے کہ جدلیات کے ذریعے خیالات کو ترتیب دیا جاتا ہے افلاطون بھی جدلیات کے ذریعے اپنی مادی خیالات کو

تجریدیت میں تبدیل کرتا نظر آتا ہے۔افلاطون کی تھیوری آف آئیڈیاز کا نچوڑ یہ ہے کہ کسی چیز کا تصور دماغ میں پیدا ہونے والا صرف ایک خیال ہی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے اور وہ معروضی حقیقت دماغ کے باہر اور خود مختار ہے اور سچائی کا مطلب معروضی حقائق سے مطابقت ہے۔ اگر مجھے اپنے سامنے پانی کی ایک جھیل نظر آتی ہے اور حقیقت میں وہ جھیل بالکل اسی طرح ہے تو میرا خیال سچا ہے اور اگر حقیقت میں میرے خیال جیسی کوئی جھیل اپنا وجود نہیں رکھتی تو پھر میرا خیال غلط ہے۔لیکن یہ ایک فریب اور ایک خیال ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے دماغ کا خیال دماغ سے باہر کسی وجود رکھنے والی چیز کی نقل ہے۔

تصور کی فوقیت

افلاطون کے نزدیک حواس خمسہ صرف انفرادی اشیاء کو محسوس کرنے میں جبکہ ذہن یا شعور اس چیز کا ایک عمومی آفاقی تصور پیش کرتا ہے۔حواس خمسہ یا آنکھوں سے دیکھے جانے والے گھوڑے یا ہاتھوں سے چھوئے ہوئے تمام بڑے چھوٹے یا کالے یا سفید گھوڑے اصل میں ایک فریب ہیں جبکہ گھوڑے کا وہ عمومی تصور اصلی ہے جو "Intellect" کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ کسی چیز کی اصل حقیقت اس چیز میں نہیں بلکہ اس کے تجریدی تصور میں پنہاں ہے۔یعنی اصل چیز عدم وجود یعنی not being ہے جبکہ اس چیز کا تصور یا خیال اصل وجود یا being ہے۔

موت کی اصل حقیقت موت میں نہیں بلکہ موت کے خیال میں پنہاں ہے یا زندگی کی اصل حقیقت بذات خود زندگی میں نہیں بلکہ زندگی کے تجریدی خیال میں ہے۔ایک خیال یا تصور اپنی ذات میں مکمل چیز اور خود کفیل ہے۔اسے اپنی ذات کی وضاحت کے لیے کسی بیرونی مدد کی ضرورت نہیں بلکہ ایک خیال یا تصور خود اپنی وضاحت ہے۔اس لحاظ سے وہ ایک حتمی اور مکمل حقیقت ہے۔اور اس کا وجود اس کی اپنی ذات میں پنہاں ہے۔ان عمومی خیالات کا انحصار کسی بیرونی مادی چیز پر نہیں بلکہ بیرونی مادی اشیاء کا انحصار ان آفاقی تصورات اور خیالات پر ہے اور یہی خیالات اس کائنات کی تخلیق کا پہلا اصول ہے یہ تصورات آفاقی ہیں اور یہ خیالات ایک اکائی ہے۔مثلاً دنیا میں گھوڑے لاکھوں ہزاروں

ہیں لیکن گھوڑے کا ''عمومی تصور'' صرف ایک ہے۔اسی طرح انصاف سے مماثل بہت سے اعمال ہو سکتے ہیں لیکن انصاف کا عمومی تصور صرف ایک ہے۔ اس کے علاوہ یہ عمومی تصورات غیر متغیر اور غیر فانی ہیں اور ان آفاقی تصورات کی حیثیت وضاحت جیسی ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں ہے۔ان کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا اور یہ کہ مادی اشیاء فانی ہیں' جبکہ ان کے آفاقی تصورات جو ایک وضاحت کی مانند ہیں غیر فانی ہیں۔مثال کے طور پر اگر دنیا کے سارے انسان مر بھی جائیں تو انسان کا ایک آفاقی تصور جو لفظ ''انسان'' کی وضاحت کی حیثیت رکھتا ہے ہمیشہ قائم رہے گا اور یہ کہ یہ اشیاء کی اصل حقیقت ہیں۔جیسے ڈائنوسارس کی نسل تو ختم ہو چکی ہے مگر اس کے نام کا تصور موجود ہے اور وجود اس کی ایک مثال یوں ہے کہ اگر ہم کہیں کے انسان ایک عقلی جانور ہے تو انسان کی اصلی حقیقت اس کی عقلیات میں ہے نہ کہ اس کے جانور ہونے میں۔

تصور میں اصل حقیقت ہے

افلاطون کے خیال میں ہر تصور اپنی قسم کا ایک منفرد تصور ہے اور وہ ایک حتمی اور مکمل حقیقت ہے۔مثلاً انسان کا ایک تصور ہے اور وہ ایک مکمل انسان کا تصور ہے۔انسان کے اس تصور میں اس کی جسمانی تکمیل اور خوبصورتی بھی شامل ہے اور اس کی عقلی اخلاقی صفات بھی اس تصور میں موجود ہیں۔لیکن ضروری نہیں کہ دنیا کے تمام انسان جسمانی اور عقلی و اخلاقی لحاظ سے ''انسان کے اس آفاقی تصور'' کے مطابق ہوں یا اس پر پورے اتریں۔اور یہ کہ یہ آفاقی تصورات زماں ومکان کی حدود وقیود سے باہر ہیں۔اور ایسا اس لیے ہے کہ یہ تصورات مادی اشیاء نہیں بلکہ وضاحت کے طور پر عمومی حالات ہیں۔اور یہ کہ ان کی نمایاں صفت یہ ہے کہ انہیں صرف عقلی استدلال 'Reason'' سے پہچانا جا سکتا ہے لیکن حواس خمسہ کے افعال سے انہیں محسوس نہیں کیا جا سکتا۔اور یہ کہ یہ نہ صرف زمان ومکان کی حدود وقیود سے باہر ہیں بلکہ ان کا زمان ومکان سے کوئی خاص رابطہ یا تعلق بھی نہیں۔بلکہ یہ دائمی ہیں۔

خیالات کا اصل جہاں اصل حقیقت اور سچائی ہے اور یہی حتمی وجود Absolute

Absolute Being ہے جبکہ حواس خمسہ کا جہاں ایک مکمل یا حتمی غیر حقیقت Unreality یا عدم وجود Absolute Unbeing ہے ماسوائے اس کے کہ یہ خیالات اشیاء میں پنہاں ہیں۔اس لحاظ سے یہ آفاقی تصورات وجود اور عدم وجود کے درمیان ہیں۔کسی چیز کا آفاقی تصور ایک ہوتا ہے جبکہ چیزیں لامحدود۔خیال زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے جبکہ مادی اشیاء زمانی بھی ہیں اور مکانی بھی،خیال دائمی اور غیر متغیر ہے جبکہ حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء مسلسل تغیر پذیر ہیں۔اشیاء خیالات میں شامل ہوتی ہیں یا شمولیت کرتی ہیں،سفید رنگ کی چیزیں سفیدی کے خیال میں شمولیت کرتی ہیں۔اس طرح خوبصورت اشیاء خوبصورتی کے ایک آفاقی تصور میں شمولیت کرتی ہیں۔اس لحاظ سے خوبصورتی کا تصور خوبصورت چیزوں کی نہ صرف وضاحت پیش کرتا ہے بلکہ یہ تصور ان چیزوں کی علت کا کردار بھی ادا کرتا ہے اور وہ چیزیں اس علت کا حصول ہیں۔لہٰذا اس اصول کے مطابق یہ خیال خود تخلیقی ''ذاتی'' یعنی Self created ہیں اور ان چیزوں کے وجود کے مرہون منت نہیں بلکہ وہ چیزیں اپنے وجود کی مکمل پہچان' شناخت یا وضاحت کے لیے ان تصورات کی محتاج ہیں اور جس قدر یہ چیزیں ان آئیڈیاز کے مطابق ہونگی یہ زیادہ اصلی اور حقیقت ہونگی۔اور جوں جوں چیزوں کی تصور سے مماثلت کم ہوگی ان کی اصلیت بھی کم ہوجائے گی۔

تصورات کی تین اقسام

افلاطون کے نزدیک تصورات کی تین قسمیں ہیں۔(1) اخلاقی تصورات جیسے انصاف،نیکی اور خوبصورتی۔مادی اشیاء کے تصورات جیسے گھوڑا،انسان،درخت،ستارے اور دریا وغیرہ(2) خصوصیات یا صفات کے تصورات جیسے بہادری، ہمدردی، سفیدی، بھاری پن،یا مٹھاس وغیرہ۔(3) پھر اچھائی کے ساتھ برائی،نیکی کے ساتھ بدی،انصاف کے ساتھ بے انصافی کے تصورات بھی موجود ہیں۔اگر واحد یا ایک کا تصور ہے تو متعدد یعنی زیادہ کا تصور بھی لازم ہے۔کیونکہ جب ہم ایک چیز کے وجود کا اقرار کرتے ہیں تو دراصل ہم اس چیز کے متضاد کا بھی اقرار کر رہے ہوتے ہیں۔مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ بہادری ایک

تصور ہے تو دوسری طرف ہم خود بخود بزدلی کے تصور کا بھی اقرار کرتے ہیں۔

تصورات کی درجہ بدی

تصورات کی درجہ بندی یا Classification بھی ہوتی ہے اسی طرح ایک آفاقی تصور ایک جیسی بہت سی چیزوں کی نمائندگی کرتا ہے اسی طرح ایک بلند ترین تصور اپنے سے چھوٹے تصورات کی صفات ان چھوٹے تصورا ت میں بھی ہوتی ہیں۔ جیسے سفیدی، نیلا پن، اور سرخی سب چھوٹے تصورات ہیں اور یہ ایک بڑے تصور رنگ (Colour) کے تحت آتے ہیں۔

تصوراور وحدت

افلاطون کے نزدیک تمام تصورات مل کر ایک سب سے بڑے تصور کے تحت آتے ہیں اور یہ سب سے بڑا تصور ایک حتمی مکمل حقیقت اور جواز کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ جواز اس کے اپنے ہونے اور دوسرے تمام تصورات کے ہونے کا بھی ہے اور یہی جواز پوری کائنات کا سب سے بڑا تصور اور خیال ہے اور یہ سب سے بڑا تصور اور خیال ہے اور یہ سب سے بڑا تصور اور خیال خدا کل ہے۔ خدا خالق ہے اور پوری کائنات کو چلاتا ہے اور اس کا حکمران ہے اور تمام انسانوں کی زندگیوں کی رکھوالی کرتا ہے۔

آفاقی خیالات میں اصل وجود

افلاطون کے خیالات میں آفاقی خیالات اصل وجود ہے اور حواس خمسہ سے محسوس ہونے والی اشیاء نیم حقیقی اشیاء اور نیم غیر حقیقی ہیں۔ نیم حقیقی اشیاء اس لیے کہ یہ وجود میں شامل ہیں اور نیم غیر حقیقی اس لیے کہ وہ عدم حقیقی میں بھی شامل ہیں عدم وجود کا حقیقی اصول مادی آفاقی تصورات پر مہر کی طرح لگ کر مادے کو چیزوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس طرح انسان کے آفاقی تصور نے مادے کی شکل دی۔ ذیلر (Zeller) کے تبصرے کے مطابق اس قسم کے مادے سے افلاطون کی مراد محض خالی خلا ہے اور یہ خالی خلا ایک وجود رکھنے والا

، بالکل غیر متعین اور بے شکل ہے۔

افلاطون نے اپنے ان نظریات میں نہ تو ہر آفاقی تصورات سے اشیاء کی تخلیق کے اصول بیان کیے ہیں اور نہ ہی یہ وضاحت کی ہے کہ خالق وجود ہے یا ایک آفاقی تصور اور اگر اکائی تصور ہے تو اس نے وجود کی تخلیق کیسے کی۔

تصور کی چار تقسیمیں

افلاطون کتاب ''ریاست'' میں یوں مکالمہ درج کرتا ہے

بہ ہر صورت، پہلے کی طرح ہم مطمئن ہیں کہ چار تقسیمیں ہونی چاہیں، دو عقل کے لیے اور دو رائے اور قیاس کے لئے۔ پہلی تقسیم کو علم (یا حکمت) کہنا چاہئے، دوسری کو سمجھ (یا فہم) تیسری کو یقین (یا عقیدہ) اور چوتھی کو سایوں کا ادراک۔ رائے اور قیاس کا تعلق مشہود سے ہوگا اور عقل کے وجود سے۔ چنانچہ ہم یہ نسبت قائم کر سکتے ہیں:

وجود کو جو نسبت شہود سے ہے، وہی نسبت عقل خالص کو رائے اور قیاس سے ہے۔ اور عقل کو رائے اور قیاس سے جو نسبت ہے، وہی نسبت علم کو یقین اور سمجھ کو سایوں کے ادراک سے ہے۔

لیکن رائے اور عقل کی مزید تقسیم اور ان کے باہمی تعلقات کے مسئلے کو اس وقت ملتوی کرنا چاہئے کیونکہ یہ بڑی لمبی تحقیق ہوگی، یعنی جو تحقیق ہو چکی ہے اس سے کئی گنا لمبی۔

افلاطون کا فلسفہ محبت

انسانی روح میں عقلی استدلال

افلاطون کے نزدیک ایک انسانی روح جو انسانی جسم میں حرکت کی وجہ ہے دنیا کی روح کی طرح ہے اور اسی میں انسان کا عقلی استدلال پنہاں ہے۔ انسانی روح کا تعلق آفاقی تصورات اور حواس خمسہ کے دونوں معانوں سے ہے۔ یہ پہلے دو حصوں میں اور پھر ہر حصہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ روح کا عقلی استدلالی حصہ بناوٹ میں سادہ اور نہ قابل تقسیم ہے یہ آفاقی تصورات کے جہاں کا ادراک کرتا ہے اور فنا نہیں ہوتا ہے۔

روح کے غیر استدلالی حصے

جبکہ روح کے غیر استدلالی حصے دو حصوں پر تقسیم ہوتے ہیں۔ اچھے حصے نیک اور اچھے جذبات رکھتے ہیں جبکہ بڑے حصے سے حیاتی بھوک کا تعلق ہے۔ روح نے جسم میں داخل ہونے سے قبل آفاقی تصورات کے جہاں جو کچھ دیکھا وہ جسم میں داخل ہوتے وقت اپنے ساتھ لائی وہ جسم میں داخل ہونے کے بعد آہستہ آہستہ ان تصورات کو یاد کرتی ہے اور یہی علم کی اصل صورت ہے۔ یہ علم عقلی استدلال ہے جو آفاقی تصورات کے ادراک کے مماثل ہے۔

محبت کا تعلق حسن سے ہے

افلاطون کے نزدیک محبت کا تعلق ہمیشہ خوبصورتی سے ہے۔ کسی جسمانی شکل میں پیدائش سے قبل انسانی روح بے جسم حالت میں پڑی تھی اور تصورات وخیالات کی دنیا میں

رہتے ہوئے گہری اور خالص فکر کے عالم میں تھی لیکن جیسے ہی وہ انسانی جسم میں داخل ہوئی روح حواس خمسہ کے جہاں میں ڈوب کر تصورات وخیالات کے جہاں کو بھول گئی۔ یہ انسانی روح جب حواس خمسہ کے جہاں میں کسی خوبصورت چیز کو دیکھتی ہے تو اسے خوبصورتی کے اس ایک تصور کی یاد آتی ہے جو خیالات کی دنیا میں تھا اور جب یہ روح ایک کے بعد دوسری خوبصورت چیز کو دیکھتی ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ تو ایک خوبصورتی کے ایک خاص تصور والی خوبصورتی ہے اپنے آپ کو ان خوبصورت چیزوں میں پیش کر رہی ہے۔

افلاطون کے نزدیک تصور وخیالات کی دنیا میں بدصورتی کا تصور بھی موجود تھا اور اس دنیا کی بدصورت چیزوں میں اسی بدصورتی کے تصور کی بدصورتی جھلکتی ہے۔ روح جب ایک خوبصورت چیز سے محبت کے جذبے سے آشنا ہو جاتی ہے تو پھر وہ دوسری خوبصورت چیزوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ پھر وہ خوبصورت اجسام سے خوبصورت ارواح کی طرف بڑھتی ہے اور آخرکار وہ خوبصورت علوم (Sciences) کی طرف بڑھتی ہے۔ اس طرح روح خوبصورت چیزوں پر متوجہ ہونے کے بعد خوبصورتی کے تصور پر توجہ دیتی ہے اور پھر روح کی محبت کا مرکز اصل خوبصورتی کے ایک تصور کا علم بن جاتا ہے۔ پھر وہ ان تصورات وخیالات کے پورے نظام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے جہان فلسفہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک خوبصورت یا خوبصورتی سے محبت کا جذبہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے انسان میں خوبصورتی یا خوبصورتی سے جذبہ محبت اس لئے نہیں کہ وہ حواس خمسہ سے محسوس کرنے والا جانور ہے بلکہ محبت کا یہ جزبہ اس کے عقلی استدلال کی صفت سے متصف ہونے کے باعث ہے۔

فلسفہ محبت کی اہمیت

افلاطون کے خیال میں فلسفہ کسی خاص مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ خود ایک عظیم مقصد ہے، فلسفہ کسی شے کے لئے نہیں بلکہ سب چیزیں فلسفے کے لئے ہیں۔

فلسفۂ خاندان وعائلی زندگی

افلاطون کتاب ریاست میں صفحہ نمبر 13-212 پر درج مکالمات میں عائلی زندگی پر یوں روشنی ڈالتا ہے۔

گلاکن--- گ: اور اس مدت میں آپ عمر کے کون سے سال شامل کریں گے؟

افلاطون--- میں: عورت بیس برس کی عمر سے ریاست کے لئے بچے پیدا کرنا شروع کر سکتی اور چالیس سال کی عمر تک اس کام کو جاری رکھ سکتی ہے۔ مرد اپنا کام پچیس سال کی عمر سے شروع کر سکتا ہے' یعنی اس وقت کے گزرنے کے بعد جب نبض حیات کی رفتار سب سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے اور اسے پچپن سال کی عمر تک جاری رکھ سکتا ہے۔

گ: بے شک' عورت اور مرد دونوں کی ہی زمانہ جسمانی اور دماغی قوت کے معراج کا زمانہ ہے۔

میں: ان مقررہ حدود سے کم یا زیادہ عمر کا کوئی شخص اگر عام جشنوں میں حصہ لے تو وہ سخت ناپاک اور بڑے کام کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ اگر اس کا کوئی بچہ زندہ رہ گیا تو سمجھا جائے گا کہ یہ حمل اس قربانی اور عبادت کے زیر اثر قرار نہیں پایا جو ہر شادی کے جشن کے موقع پر تمام پجاریوں' پجارنوں' اور سارے شہر کی طرف سے اس لئے ادا کی جاتی ہے کہ آئندہ نسل اپنے ماں باپ سے بہتر اور مفید تر ثابت ہو۔ بلکہ اس شخص کی اولاد ظلمت اور شہوت پرستی کا نتیجہ متصور ہو گی۔

گ: درست۔

میں: اور یہی قانون مقررہ حدود کے اندر عمر والوں پر بھی عاید ہو گا' اگر وہ عنفوان شباب میں حاکموں کی اجازت کے بغیر کسی عورت سے تعلق پیدا کر لیں۔ کیونکہ پھر وہ ریاست کے لئے حرامی بچے پیدا کریں گے جن کی نہ تصدیق ہو گی اور نہ تقدیس۔

گ: بے شک۔

میں: اور جب عمر کے مقررہ حدود سے یہ لوگ نکل جائیں تو پھر انہیں آزادی ہونی چاہئے کہ جس سے چاہیں ملیں جلیں اور تعلق رکھیں' البتہ یہ ضروری ہو کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا

نواسی یا اپنی ماں نانی سے تعلق نہ پیدا کر لے۔اسی طرح عورتوں کے لئے اپنے بیٹوں پوتوں یا باپ اور دادا سے تعلق ممنوع ہو۔ان لوگوں کو پہلے سے تاکید کے ساتھ اس امر پر باخبر کر دینا چاہئے کہ اگر اس طرح کوئی حمل قائم ہوا تو بچے کو پیدا نہ کرنے دیا جائے گا اور اگر کسی طرح پیدا ہو ہی جائے تو والدین کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ایسی اولاد کی پرورش نہیں کی جاسکے گی۔

گ: یہ تجویز بھی معقول ہے۔لیکن یہ فرمایئے کہ انہیں یہ معلوم کیسے ہوگا کہ کون باپ ہے اور کون بیٹی؟

میں: ہاں' اس کا تو انہیں کبھی بھی علم نہ ہوگا۔لیکن یہ طریقہ رکھیں گے کہ شادی کے جشن کے دن سے ساتویں یا دسویں مہینے تک جتنے لڑکے پیدا ہوں گے انہیں ہر دولہا اپنا لڑکا اور جتنی لڑکیاں پیدا ہوں گی انہیں اپنی بیٹی کہے گا۔یہ سب اسے باپ کہہ کر پکاریں گے' ان بچوں کے بچوں کو وہ پوتا پوتی سمجھے گا اور یہ اسی سن جماعت کے سارے افراد کو دادا دادی کہیں گے۔ماؤں اور باپوں کی خلوت کے وقت جن جن کا حمل ساتھ قرار پایا تھا وہ بھائی بہن مانے جائیں گے اور ان میں باہم شادی منع ہوگی۔لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ بھائی بہنوں کی شادی کی یہ ممانعت بالکل قطعی ہے۔اگر قرعہ اندازی اس کی موافقت کرے اور پیتھیا کے کاہن سے بھی اجازت مل جائے تو قانون بھی اس کی اجازت دے دے گا۔

گ: بہت درست۔

میں: محافظوں میں بیویوں اور خاندان کے اشتراک سے متعلق تو یہ تجویز ہے۔اب غالباً آپ یہ چاہیں گے کہ اسے جماعت کے دوسرے حصوں سے بھی مطابقت ثابت کیا جائے اور یہ بھی ظاہر ہو سکے کہ اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں۔کیوں آپ یہی چاہتے ہیں نا؟

تصانیف افلاطون

تمام قدیم مورخیں اور سوانح نگار افلاطون کی سیرت کو قابل احترام قرار دیتے ہیں۔اور اس کی تصانیف بھی اس کی اعلیٰ سیرت کی شہادت دیتی ہیں۔وہ نہایت اعلیٰ دوجے کی عقل کا مالک تھا، جس کی تمام قوتوں میں توازن کائم ہوکر اخلاقی جمال پیدا ہوگیا تھا، اس کی یہ تصانیف اس کی پاکیزہ سیرت کا آئینہ ہیں۔اس کا دور تصنیف سقراط کی صفات سے فوراً بعد شروع ہوتا ہے، اور تادم آخر جاری رہتا ہے، وہ پچاس برس سے زیادہ عرصہ تک اپنی تصانیف کی تکمیل میں منہمک ومحو رہا،

افلاطون کا تصنیفی کام (works) یعنی مکالمات افلاطون

قرون وسطیٰ کے توسط سے افلاطون کے لئے ہوئے کاموں کی جو تفصیل ہم تک پہنچتی ہے، ان میں ایک 41 جلدوں میں مشتمل ڈائلاگز (Dialoguse)، علاوہ ازیں 13 خطوط (مکاتیب) اور ایک کتاب تعریفات (DWFINATIONS)_____

مذکورہ تمام کام افلاطون کے اپنے ہاتھ کا لکھا نہیں ہے، مگر کچھ کتب اس کی ذاتی تحریر کردہ ہیں مکالمات (ڈائلاگ) جو کہ یقیناً افلاطون سے منسوب ہیں۔ان کی اشاعت کا باقاعدہ آغاز 1920ء میں BUDE کلیکشن کے نام سے ہُوا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ افلاطون کا تحریر کردہ کام ہے،

(1) HAPPIAS MINOR

(2) ALCIBIADES

(3) SOCRATE'S APOLOGY

(4) EUTHYPHRO

(5) CRITO

(6) HIPPIAS MAJOR

(7) CHARMIDES

(8) LACHES

(9) LYSIS

(10) PROTAGORAS

(11) GARGIAS

(12) MENO

(13) PHEDO

(14) SYMPOSIUM

(15) PHEDRUS

(16) ION

(17) MENEXENUS

(18) EUTHDEMUS

(19) CRATYLUS

(20) REPUBLIC

(21) PERMENIDES

(22) THEATETUS

(23) STATES MAN

(24) PHILEBUS

(25) TIMOUS

(26) CRITIAS

(27) LAWS

(28) EPINOMIS

حسب ذیل ایسی کتب جو افلاطون کی طرف منسوب تو ہیں مگر حقیقتاً اس کی نہیں۔

(1) SECOND ALCIBIADES

(2) HIPPARCHUS

(3) MINOS

(4) THE RIVAL LOVERS

(5) THE AGES

(6) CHITOPHON

(7) ABOUT JUSTCE

(8) ABOUT VIRTUR

(9) DEMODOCUS

(10) SISPHUS

(11) ERYXIAS

(12) AXIOCHUS

کچھ مکاتب بھی ایسے ہیں جو افلاطون کے نہیں ہیں۔

افلاطون کے ڈائیلاگ کو تھیٹر میں بھی روایت ملی اور اس کے چار گروہ بنا دیے گئے، جس کو TETROLOGIES کہتے ہیں۔ جو پہلی صدی عیسوی میں بھی پیش ہوئے،

مذکورہ مسودات میں بعض قرون وسطی تک بچ گئے،

ابھی تک 9 TETROLOGIES تشکیل پا چکے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے

(1) ETHYPHRO,APOLOGY,CRITO,PHEDO

(2) CRATYLUS, AHEATETUS,SOPHIST, STATEMAN

(3) PARMINIDES,PHILEBUS,SYMPOSIUM,PHEDRUS

(4) ALCIBIADES,2ND ALCIBIADES,HIPPURCHUS,RIVAL LOVERS

(5) THE AGES,CHARMIDES,LACHES,LYSIS

(6) EUTHYDEMUS,PROTAGORAS,GARGIAS,MENO

(7) HIPPIAS\MAJOR,HAPPIAS MINOR,ION,MTNENUS

(8) CHITOPHON,REPUBLIC,TIMOUS,CRITIAS

(9) MINRS,LAW,EPINRMIS,LETTERS.

ایک اور گروپ وضع کیا گیا ہے،اس کو"TRILOGIES" کا نام دیا گیا ہے۔جن میں ایک میں 3 کا طرز فکر ہائے فلسفہ کا اسلوب ہے،ان کی تعداد 5 ہے

(1) REPUBLIC,TIMOUS,CRITIAS

(2) SOPHIST,STATESMAN,CRATYLUS

(3) LAWS,MINOS,EPINOMIS

(4) THTATITUS,EUTHYPHRO,APOLOGY

(5) CRITO,PHEOPO,LETTERS

ایک نقطہ یہاں قابل بیان ہے کہ یونانی تھیٹر میں TETROLOGIES میں کامیڈی کوملحوظ رکھا گیا ہے جبکہ TRILOGY میں ٹریجڈی کا عنصر غالب ہے۔

تمام کتب قدیم یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں۔اوران کا ترجمہ کیا گیا۔

(ا) کچھ مختصر شاعری (نظمیں) بھی افلاطون سے منسوب کی جاتی ہیں۔اس میں افلاطون کی زندگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اور خطوط بھی اس مد میں رہنمائی کرتے ہیں۔

BUDE مجموعہ فرینچ میں ترجمہ ہوا، جو یونانی ولاطینی زبانوں میں بھی شائع ہو چکا تھا۔1920ء میں اس کی اشاعت کا آغاز ہوا جو ابھی مکمل ہوا۔ابھی تمام جلدیں دوبارہ طبع ہو چکی ہیں۔اسی کا انگریزی ترجمہ لوئب کلاسیکل لائبریری نے شائع کیا اور اس کی طباعت ہارورڈ یونیورسٹی پریس میں کی گئی۔اسمیں یونانی مع انگریزی ترجمہ تمام تر مواد موجود ہے،

(3) خالص ڈائیلاگ (مکالمات) کا انگریزی ترجمہ ویب سائیٹ پر بھی دستیاب ہے۔اس کی کمپوزنگ تھریسلائن ٹیٹرالوجیس انداز میں ہے۔اور اس کو 5 جلدوں میں اکسفورڈ کلاسیکل ٹیکسٹس (OCT) کلیکشن (PLATONIS OPERA) کے نام سے اکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے طبع کیا،

VOL#01=) ETHYPHRO,APOLOGIA

SOCRATIS,CRITO,PHAEDO

CRATYLUS,THEAETITUS,SOPHISTA,POLITICUS

VOL#02=) PARMENIDES, PHILEBUS,

SYMPOSIUM, PHAEDRUS ,ALCIBIADTS,I, II,

HIPPARCHUS, AMATORES

VOL#03 =)THEAGRS, CHARMIDES, LACHES,

LYSIS, EUTHYDEMUS, IROTAGORAS, GARGIAS,

MENO, HIPPIAS MAJOR, HIPPIAS MINOR,

HIPPIAS MINOR, ION, MENIXENUS

VOL.#04=) CHTOPHO, RES PUBLICA,

TIMAEUS, CRITIAS

VOL.#05=) CHITOPHO, RES PUBLICA,

TIMAEUS, CRITIAS

اسی طرح کے مکالمات (ڈائیلاگز) متفرق اشکال میں موجود ہیں۔جس میں یونانی اورانگریزی ترجمہ دونوں ٹیکسٹ موجود ہیں۔12 جلدوں میں یہ ایڈیشن اوپر ذکر ہو چکا ہے اس کو LOEB COLLECTION کا نام دیا گیا ہے، ان کی تفصیل یہ ہے۔

VOL # 01.=(i)EUTHPHRO

(ii) APOLOGY

(iii) CRITO

(iv) PHAEDO

(v) PHAIDRUS

VOL # 02=) (i) LACHES

(ii) PROTAGORAS

(iii) MINO

(iv) EUTHYDEMUS

VOL. # 03=) (i) LYSIS

(ii) SYMPOSIOM

(iii) GORGIAS

VOL. # 04=) (i) CRATYLUS

(iiPARMINDES)

(iii) GREATER HIPPIAS

(iv) LESSER HIPPIAS

VOL. # 05=) (i) THE REPUBLIC

(ii) BOOKS (I-V)

VOL. # 06=) (i) THE REPUBLIC, BOOKS (VI-X)

VOL.# 07=) (i) THEATITUS

(ii) SOPHIST

VOL..# 08=) (i) STATES MAN

(ii) PHILEBUS

VOL. # 09=) (i) TIMAEUS

(ii) CRITIAS

(iii) CHITOPHON

(iv) MENEXENUS

(v) EPISTLE

VOL. # 10=)

(i) THE LAWS

(ii) BOOKS (I - VI)

VOL. # 11=) (i) THE LAWS

(ii) BOOKS (VII - XII)

VOL. # 12=) (i) CHARMIDES

(ii) ALCIBIADES I & II

(iii) HIPPARCHUS

(iv) THE LOVERS

(v) THE AGES

(vi) MINOS

(vii) EPINOMIS

افلاطون کا مکمل/جامع کام

تعارف اور نوٹس (حواشی) جوھن ایم کوپر، ھیکٹ پبلیشنگ کمپنی انڈین اوپلس کیمبرج، 1997ء میں اس کا ترجمہ متفرق مترجمین کے ہاتھ سے لکھا طبع کیا گیا، ان میں سے اکثر کو مختلف طرز کے ساتھ اسی ناشر نے چھاپا، یہ حقیقت میں مکمل اور جامع طباعت ہے، اس کام کی تفصیل یہ ہے، (بمطابق انگریزی حروف تہجی)

	NAME OF BOOKS	TRANSLATED BY (IN ENGLISH LANGUAGE)
1	ALCIBIADES	D.S. HUTCHINSON
2	ALCIBIADES (2)	ANTHONY KENNY
3	APOLOGY	G.M.A. GRUBE
4	AXXIOCHUS	JACKSON P. HERSNBELL
5	CHARMIDES	ROSAMOND KENT SPORAGUE
6	CHITOPHON	FRANCISCO J GONZALEZ
7	CRATYLUS	C.D.C REEV
8	CRITO	G.M.A GRUBE
9	DEFINITIONS	D.S. HUTCHINSTON
10	DEMODOCUS	JONATHAN BARNES
11	EPIGRAMS	J.M EDMONDS / REV. JOHN.M. COOPER
12	EPINOMIS	MC. KIRANAN, JR
13	ERYXIAS	MARK JOYAL

14	EUTHYDEMUS	ROSAMOND KENT SPRAGUE
15	EUTHYPHRO	G.M.A. GRUBE
16	GORGIAS	DONALD J. ZEYL
17	HALYCON	BRAND INWOOD
18	HIPPARCHUS	NICHOLAS D SMITH
19	HIPPIAS MAJOR OR (GRAETER HIPPIAS)	PAUL WOOD RUFF
20	HIPPIAS MINOR OR (LESSER HIPPIAS)	NICHOLAS D SMITH
21	ION	PAUL WOOD RUFF
22	ON JUSTICE	ANDREW S BEKCKER
23	LANCHES	ROSE MOUND KENT SPRAGUE
24	LAWS	TREVOR J SAUNDERS
25	LETTERS	GLENN R MORROW
26	LYSIS	STANLEY LOMBARDO
27	MENEXEMUS	PAUL RYAN
28	MENO	G.M.A GRUBE
29	MINOS	MALCOLN SCHOFIELD

30	PARMENIDES	MARY LOUIST GILL / & PAULRYAN
31	PHAEDO	G.M.A GRUBE
32	PHAEDRUS	ALEXINDIR NIHAMAS / PAUL WOODRUF
33	PHILEBUS	DOROTHEA
34	PRATAGORAS	STANALY
35	REPULIC	G.M.A GRUBE
36	RIVAL LOVERS	JEFFREY
37	SISIPHUS	DAVID GALLOP
38	SOPHIST	NICHOLAS
39	SYMPOSIUM	ALEXENDER & PAUL
40	THEAETETES	M.J. LEVETT
41	THE AGES	NICHOLAS
42	TIMAEUS	DONALD
43	ON VIRTUE	MARK REUTER

تعارف تصانیف افلاطون

مکالمات افلاطون سے مراد یہ ہے کہ افلاطون مختلف افراد سے ہم کلام ہوتا اور پھر ان سے سوال جواب کا سلسلہ مکالمہ کی صورت میں بیان ہوتا۔ انہیں کتابی صورت میں درج کر دیا۔ بعض دیگر کتب بھی ہیں۔ یوں تو افلاطون نے بہت سی کتب تحریر کیں، مگر زمانے کے بے رحم ہاتھوں سے بچ کر درج ذیل کتب ہی ہم تک پہنچ سکیں،

(1) اپالوجی (APOLOGY)

اس کتاب میں سقراط پر مقدمہ کی روداد اور اس کی صفائی بیان کی گئی ہے۔ خطابت پردازی کا جو کرشمہ اس میں رچا ہوا ہے وہ افلاطون کے زور قلم کا نتیجہ ہے اس مکالے کو پڑھ کر سقراط کے رویے کے، شعوری اور لاشعوری محرکات سے آگاہی ہوتی ہے وہ اپنی تقریر کے آخر میں جج صاحبان کو مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ''آپ جج حضرات کو چاہئے کہ موت کے بارے میں اچھی توقعات وابستہ کریں۔ کم سے کم اس بات کی حقیقت پر ایمان رکھیں کہ ایک نیک آدمی کو کوئی برائی ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتی نہ اس دنیا میں، نہ اس دنیا میں اور نہ ہی کبھی اللہ کی طرف سے اس کے معاملات نظرانداز کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے میرا یہ انجام بھی محض اتفاق نہیں ہے بلکہ مجھے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ میرے لئے اب مرنا اور دنیا کی تکالیف سے چھٹکارا پانا ہی بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے الہامی نشان نے مجھے ٹوکا نہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں ان سے قطعاً خفا نہیں جنہوں نے مجھے مجرم ٹھرایا یا جنہوں نے مجھ پر الزام لگائے ہیں۔ تاہم جب انہوں نے مجھ پر الزام لگائے تھے تو ان کی نیت یہی تھی کہ مجھے نقصان پہنچائیں بس اسی معاملے میں وہ مورد الزام ہیں۔ مجھے ان سے ایک کام بھی ہے۔ جب میرے بیٹے بڑے ہو جائیں اور پھر اگر وہ نیکی کہ مقابلے میں مال و دولت کو ترجیح دینے لگیں تو آپ لوگ انہیں ایسے ہی تنگ کیجئے گا جیسے میں آپ لوگوں کو کیا کرتا تھا۔ اگر وہ یہ ظاہر کرنے لگیں کہ بڑی اہم شخصیت بن گئے ہیں جبکہ حقیقتاً ایسا نہ ہو تو ان کا محاسبہ کرنا جیسے

میں آپکا محاسبہ کیا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی حفاظت نہیں کر رہے جس کی حفاظت کرنی چاہیے تھی اور اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگ گئے ہیں جبکہ حقیقت میں نہیں ہیں۔ اگر آپ لوگ ایسا کریں گے تو میں اور میرے بیٹے دونوں آپ کے ہاتھوں صحیح انصاف پائیں گے۔ اب جانے کا وقت آ گیا ہے ہم اپنے اپنے راستوں کی طرف جاتے ہیں۔ میں مرنے کو اور آپ زندہ رہنے کو۔ کون سا راستہ بہتر ہے ''اللہ ہی کو معلوم ہے۔''

2۔ کرائٹو (Crioto)

اس کتاب میں سقراط کو بغیر کسی معقول الزام میں جیل میں ڈالے جانے اور اس کے وہاں سے فرار ہونے کے پروگرام کی تشکیل اور سقراط کے انکار کے بارے میں مکمل دلائل روداد کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ سقراط نے زندان سے فرار ہونے سے کیوں انکار کیا۔ اگرچہ سقراط عمر بھر ایتھنز کی تمام حکومتی پالیسیوں اور سیاسی رہنماؤں پر تنقید کرتا رہا لیکن یہاں وہ اس بگڑی ہوئی ریاست سے اپنی عمیق اور سادہ وفاداری کا اظہار کرتا ہے۔ بے شک ایتھنز نے اپنے اداروں کی غلط روی سے اسے غیر مصنفانہ اور احمقانہ طور پر موت کی سزا سنائی لیکن عمر کہ جو ستر سال اس نے ایتھنز میں بسر کیے وہ ریاست کے قوانین اور رسوم کے ساتھ ایک خاموش میثاق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سقراط اس تحفظ کا شکر گزار ہے جو ان قوانین کی وجہ سے اسے نصیب ہوا۔ وہ بدی کا جواب بدی سے نہیں دینا چاہتا اور نہ ہی قانون کی خلاف ورزی اسے منظور ہے۔

3۔ ایوتھیفرون (Euthyphorn)

سقراط پر بدکاری کا الزام، مقدمے کا انتظار، تقوائی اور نیکی پر بحث اس مکالماتی کتاب کا اصل Topic ہے۔

اس میں سقراط عدالت جا رہا ہے جہاں اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ راستے میں اسے ایوتھر فرد نامی نوجوان ملتا ہے جو انصاف کے خاطر خود اپنے باپ جس سے بڑی نے وردی

سے ایک غلام کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا پر مقدمہ دائر کرنا چاہتا ہے۔اس حوالے سے سقراط اتقا پر بات کرتے ہوئے معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ایوتھر فرد کے ذہن میں اتقا کا کیا تصور ہے۔ایوتھر فرد نے اتقا کی کئی تعریفیں پیش کیں جن میں سے کوئی بھی سقراط کی جرح کی متحمل نہیں ہوسکتی اس بحث کے خاص نقطہ کے ذریعے بالواسطہ انداز میں سقراط پر عائد فرد جرم کی مہملیت کو واضح کیا گیا ہے۔اعتذاز میں صفائی کا وہ بیان ہے جو سقراط کے عدالت کے سامنے دیا۔اس مکالمے کو پڑھ کر سقراط کے رویے کے شعوری اور لاشعوری محرکات سے حیرت ناک آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

4۔لاشز(Lashes)

یہ مکالماتی کتاب جرات کے مواضوع پر تحریر کی گئی ہے۔

5۔آیون(Ion)

شعراء اور خطبا کے خلاف مکالماتی کتاب ہے۔

6۔پروٹا گورس(Protagoras)

اس کتاب میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ علم فضیلت موجود ہے اور اس کی تعلیم ممکن ہے۔پروٹا گورس میں ڈرامے کا سا لطف ہے۔سقراط ایک مشہور سوفطائی معلم پروٹا گورس سے پوچھتا ہے کہ آیا نیکی یا اچھی صفات سکھائی جاسکتی ہیں۔پروٹا گورس کا جواب ہاں میں ہوتا ہے جسے سقراط نہیں مانتا۔دونوں کے نظریات متضاد ہونے کی وجہ سے مثبت نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں لہٰذا آخر میں اشارتاً کہا گیا ہے کہ سقراط اور ریوٹا گورس کو اصل میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے تھا کہ نیکی سے کیا مراد ہے۔

7۔کارمیڈس(Charmides)

یہ تصنیف عفت یا ضبط نفس کے بارے میں ہے۔

8۔لی سیز (Lysis)

یہ کتاب رفاقت کے بارے میں ہے لیکن رائیٹر نے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

9۔جمہوریہ (Republic)

یونانی زبان میں Republic کا مطلب بلا تخصیص آئین مملکت اور معاشرہ ہے افلاطون چونکہ اس تصنیف میں ان معاشرتی مسائل کو ہی زیر بحث لایا ہے لہٰذا اس کتاب کا عنوان بھی اس نے Republic رکھا۔ یہ کتاب افلاطون کی مثالی مملکت کے آئین کی حیثیت رکھتی ہے اور اس نے اپنی مثالی مملکت کا نظم ونسق چلانے کے لیے جن نظام ہائے زندگی کی ضرورت محسوس کی ان پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب سیاست اور فلسفہ کو ایک ہی دھاگے میں پروتی ہے اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ عدل کے بارے میں ہے جبکہ حصہ دوم سیاست کا تصور مثالی ریاست اور عام دنیاوی ریاستوں میں فرق پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں افلاطون کے بنیادی نظریے اور اصول ہیں جنہیں دلیلوں اور مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں سماج کی تشکیل سیاسی تنظیم کی ماہیت اور مثالی مملکت کے اجزائے ترکیبی کے علاوہ زندگی کے بنیادی عمل کو اجاگر کرنے کے لیے اخلاقی فلسفیانہ مذہبی نفسیاتی مابعد الطبعیاتی اور تاریخی بلکہ غیر سیاسی نظریے جو اس دور میں یونانی قدیم کے علم سیاسیات کے حصہ تھے بیان کیے گئے ہیں۔

یہ ایک مکالمہ ہے جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ سیاسی اور معاشرتی فتنوں پر صرف فلسفی حکمران قابو پاسکتا ہے اور وہی انصاف کی ضمانت دے سکتا ہے۔ اس تصنیف میں صحیح فلسفی پیدا کرنے پر زور دیا گیا ہے جس کے لیے تعلیم اور معاشرے کی تنظیم میں کارفرما اخلاقی اصولوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ روح کے تینوں حصوں نفس امارہ نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کی طرح معاشرے کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نچلے طبقے کو جس کے ذمہ معاشرے کی تمام مادی اور معاشی ضروریات کو پورا کرنا ہے کو نفس امارہ یعنی شکم، سورماؤں کے طبقہ کو نفس

لوامہ یعنی دل اور حاکموں کے طبقہ کو نفس مطمئنہ یعنی دماغ قرار دیا گیا ہے۔اس تصنیف میں نظام تعلیم، نظام عدل اور نظام معیشت پر بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ مشہور اور بحث انگیز تصنیف دس ابواب پر مشتمل ہے اور اس کی دسویں حصہ میں ایرامنی کے مرنے اور بارہویں دن جی اٹھنے کے بعد جزا و سزا کے نظام، روحوں کو دوبارہ انسانی یا حیوانی قالب اختیار کرنے اور عالم ناسوت سے واپسی کا نظریہ جو غالباً اواگون سے مشابہ ہے بیان کیا گیا ہے۔

افلاطون کا سیاسی فلسفہ اس کی تین کتابوں ''جمہوریہ''مدبر''اور قانون'' میں ملتا ہے۔ان کتابوں میں مشہور کتاب ''جمہوریہ'' ہی ہے جس میں افلاطون نے معلوم تاریخ میں پہلی دفعہ ایک تمدن اور مہذب معاشرتی زندگی کے ایسے مسائل پر بحث کی ہے گذشتہ صدیوں کے دوران ہر زمانے میں ہر معاشرہ ان مسائل کو اپنے مسائل سمجھتا آرہا ہے اس کی یہ تصنیف آج بھی مغربی سیاسی و تمدن زندگی کی فلسفیانہ اساس ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی پیش کردہ تصورات ونظریات نے تاریخ انسانی میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

قدیم یونان میں چونکہ Specialization کی کمی تھی اس لیے افلاطون کی اس تصنیف میں اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات اور تاریخ میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی گئی ہے اور یہ کتاب بیشتر موضوعات کا مرکب ہے۔ چونکہ اس وقت یونان کی تمدنی زندگی فرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر آمریت کی طرح چھائی ہوئی تھی اس لیے اس کتاب کا بنیادی موضوع بحث شہری مملکت ہے۔افلاطون نے اس کتاب میں اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کے لیے عمرانی علوم کے تمام طریقہ ہائے مطالعہ جن میں استخراجی جدلیاتی، مکالماتی، مشابہتی، مقصدیتی، تجزیاتی، تاریخی اور استقرائی طریقہ ہائے مطالعہ شامل ہیں استعمال کیے ہیں۔

اس زمانے میں اہل مقدونیہ میں جہل کی کثرت تھی اور کوئی مثالی حکومت بھی ابھی موجود نہیں تھی۔افلاطون نے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی اس مشہور زمانہ کتاب ''جمہوریہ'' میں ایک مثالی ریاست کا نظام دیا جس کی مدد سے وہ ایک فلسفی بادشاہ پیدا کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسکا خیال تھا کہ صرف چند آدمیوں کی محنت ومشقت سے انسانیت اوج ثریا تک پہنچ سکتی ہے۔اس کا کہنا تھا کہ ہر آدمی عقل وفہم رکھتا ہے لیکن ہر کوئی اسے استعمال نہیں کرتا۔وہ درحقیقت مثالی ریاست کے روپ میں ایسا باغ تشکیل دینا چاہتا تھا جس کی

چار دیواری میں صرف اعلیٰ درجے کے اور نایاب پودے ہی پرورش پا سکیں۔

مشتملات کے اعتبار سے ''الجمہوریہ'' کو افلاطون کی وفات کے بعد لمبائی کے اعتبار سے دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سیاسیات کے علاوہ تعلیم' انصاف' اخلاقیات' فلسفہ' مذہب' خاندان اور نجی ملکیت پر بحث کی گئی ہے۔ معاشرتی زندگی پر حصہ اول سے پانچویں تک کی ماہیت' مثالی مملکت کی تنظیم' نظام تعلیم اور اخلاقیات چھٹے اور ساتویں حصہ میں الطبعیاتی مسائل' فلسفی حکمرانوں کی خصوصیات' مطالعے کے مضامین' تعلیم وتربیت اور اشتمالی تصورات آٹھویں اور نویں حصہ میں ناقص معاشروں پر بحث اور آخر باب میں فلسفی حکمرانوں کے کردار' شاعری کے مضر اثرات اور حیات بعد الموت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں اگرچہ انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے لیکن زیادہ تر توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے۔ اس لیے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پُر ہے۔ فلسفہ کی بلندی' اتحاد کا جلوہ' اخلاق کا سبق' تعلیم کے مسائل' سیاسی زندگی میں رہنمائی' عروج وزوال' کا اسرار ورموز اور فلسفہ تاریخ کے مشکل ابواب سب کچھ اس کتاب میں موجود ہے جیسے افلاطون کے اپنے مرکزی خیال ''آدمی اچھا کیسے بنے'' کی خاطر بحث کے طور پر شامل کیا ہے۔ افلاطون کے نزدیک ہر اچھا انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے کسی جماعت یا ریاست کا رکن بنتا ہے اور چونکہ اچھا آدمی صرف اچھی ریاست میں پیدا ہو سکتا ہے اس لیے افلاطون کو اچھی ریاست کا خاکہ اور پھر اس ریاست کے لیے فلسفہ اخلاق اور پھر اجتماعی تعاون کے لیے تخصیص کار کے اصول پیش کرنے پڑے۔ افلاطون کے خیال میں چونکہ اجتماعی زندگی ہی سچا اصول عدل ہے اس لیے اس کتاب کو تحقیق عدل کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔

افلاطون نے اس کتاب میں نظام تعلیم' ماہیت عدل اور نظام معیشت پر مفصل بحث کی ہے۔ افلاطون کے نزدیک عدل کوئی ہنر مندی یا مہارت نہیں بلکہ روح کی ایک صفت اور ذہن کی ایک عادت ہے۔ حکومت اگر فن ہے تو اس کا مقصد بھی اپنے موضوع کے نقائص کو رفع کرنا ہوگا اور حکمران کے لیے اگر وہ سچا حکمران ہے بے غرض اور محکموں کے مفاد کا ضامن ہونا لازمی ہے، عادل شخص ظالم سے زیادہ دانش مند' زیادہ قوی اور زیادہ خوشحال ہوتا

ہے۔عدل کسی مخصوص جزو کا جوہر نہیں ہے بلکہ کل کا جوہر ہے اور اسی باعث تمام محاسن اخلاق کی شرط اول ہے۔محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ شجاعت وجرات سے ریاست کی حفاظت کرے دولت مندوں کا عدل یہ ہے کہ وہ حکمت کی روشنی میں ریاست کے لئے مقاصد متعین کرے اور اس کے وسائل تجویز کر کے ریاست سے ان پر عمل کروائے۔مددگار محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی کے کل پرزوں کو اعتدال کے ساتھ چلاتا رہے۔

الجمہوریہ میں جو نظام تعلیم پیش کیا گیا ہے وہ جنگ آزماؤں اور حکمرانوں کے لیے ہے پہلے حصے کی تعلیم کا مقصد شہریوں کو ریاست کے تحفظ کے لئے تیار کرتا ہے جبکہ دوسرے حصے کا مقصد ان میں سے چند کو حکمرانی کا اہل بنانا ہے۔پہلے حصے میں جذبات کی تہذیب اور سیرت کی تربیت جبکہ دوسرے حصے میں فلسفہ وحکمت کی معرفت، عقل وفرد کی تعلیم پیش نظر ہے۔

افلاطون کی اصطلاح میں ارباب علم اور اصحاب عمل فلسفی بادشاہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں جاہل اور خودغرض سیاستدانوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔یہی لوگ نظارہ حقیقت سے بہرہ یاب ہیں ان پر نہ تو قانون کی پابندی لاگو ہے اور نہ بے جا رسم ورواج کی بندش۔

اس کتاب میں افلاطون نے ریاست کی معیشت کو مضبوط کرنے کے لئے ایک اشتراکی نظام پیش کیا اور اس نظام کی بدولت اسے تاریخ میں اشتراکیت کے بانی کے طور پر یاد رکھا گیا ہے۔اشتراک املاک کے ساتھ ساتھ اس نے اشتراک ازواج کی حمایت کی جس پر بعض ناقدین خصوصاً ارسطو نے کافی تنقید کی ہے لیکن اس کے نزدیک یہ نظام اشتراکیت فروعی ہے اور وہ اس چیز سے بخوبی واقف تھا کہ ریاست ذہن انسانی کی ایک خارجی تشکیل ہے اس لئے اس کی حقیقی اصلاح ذہن کی اصلاح سے ممکن ہے نور نظام اشتراکیت کا تمام مقصد یہ ہے کہ تعلیمی نظام کو اپنے نتائج حسنہ کے پیدا کرنے میں خارجی ماحول کی مخالفت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

اس کتاب میں شخصی حکومت کے مقابلہ میں جمہوری حکومت کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے قانونی حکومت کو قابل عمل نظام حکومت قرار دیا گیا ہے۔جبکہ ''قانون'' میں عملی لحاظ سے اچھی حکومت کا تصور پیش کیا گیا ہے۔''ریاست'' میں قانون، عدالت اور قانون دانوں

کو غیر ضروری کہا گیا ہے۔

افلاطون نے اس کتاب میں استخراجی طریقہ مطالعہ کو استعمال کر کے خیالات و تصورات پر مبنی فکر کو اجاگر کیا اور بہترین نتائج اخذ کیے۔ اس نے اس تصنیف میں جدلیاتی طریقہ مطالعہ کی بنیاد رکھی اور تضاد کے ذریعے اپنے نقطہ نظر کو آگے بڑھایا۔ افلاطون کے اس طرز استدلال کو مدنظر رکھتے ہوئے بعد میں ہیگل اور کارل مارکس نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے۔

افلاطون نے اگرچہ مکالماتی طریقہ مطالعہ کو اپنی تمام تصانیف میں شعوری طور پر اپنایا ہے لیکن الجمہوریہ میں اس نے جن کرداروں کا ذکر کیا ہے وہ تقریباً تمام حقیقی کردار تھے۔ اس کتاب میں اس نے مشابہتی طریقہ مطالعہ استعمال کرتے ہوئے ایک اہم تمثیل ''فرد اور مملکت ایک دوسرے سے مشابہہ ہیں'' پیش کی ہے اور یہ تمثیل بلاشبہ اس تصنیف کی روح ہے۔ اس طریقہ مطالعہ کو استعمال کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ''انسان اور مملکت کے طبقات کے درمیان مماثلت ہے۔ مملکت اور انسانی ذہن میں کوئی فرق نہیں انسانی ذہن تین اجزا یعنی اشتہا، حوصلہ اور عقل کا مجموعہ ہے اور مملکت کے تینوں طبقے معاشی طبقہ، فوجی اور حکمران طبقہ اسی ذہنی عکس کی پیداوار ہے۔ اعلیٰ ترین طبقہ فلسفی حکمران، درمیانی طبقہ فوجی اور دیگر اعلیٰ عہدہ دار اور نچلا طبقہ معاشی طبقہ ہے۔

افلاطون کے نزدیک مثالی مملکت کے سب سے زیادہ قریب طرز حکومت Timocrasy ہے اور یہ حکومت عقل کی برتری پر قائم ہے۔ عقل کی برتری کم ہو جانے پر اس کی جگہ Spirit اور پھر Appetite کا عنصر غالب آ جاتا ہے۔ افلاطون اس تصنیف میں مقصدیت کا طریقہ مطالعہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''تصورات ہی حقیقت ہیں۔ حقیقی مملکت کی تکمیل انسانی زندگی کا اولین مقصد ہے۔ جاری وساری مملکتیں سب نامکمل ہیں اور یہ مملکتیں مثالی مملکت کے جس قدر قریب ہیں اتنی ہی حقیقت کے بھی قریب ہیں۔'' افلاطون کے بعد مقصدیت کے اس طریقہ مطالعہ کو ارسطو اور گرین نے بھی اپنایا ہے۔

افلاطون نے اپنی اس تصنیف میں تجزیاتی طریقہ مطالعہ کے تحت اپنی مثالی مملکت کو تین طبقات میں تقسیم کرتے ہوئے سماجی اداروں کو مملکت کے اجزا قرار دیا۔ اس نے تاریخی

طریقہ مطالعہ استعمال کرتے ہوئے اپنے مشاہدات میں وہی حقائق بیان کئے ہیں جو اس کے عمومی نظریے سے مطابقت رکھتے تھے۔ اس نے استقرائی طریقہ مطالعہ کے ذریعے معاشرے میں ٹھوس حقائق کا تجزیہ کیا اور اپنے فلسفیانہ تصورات کی وضاحت کے لئے اس طریقہ کو کہیں کہیں استعمال کیا ہے۔

اس کتاب میں افلاطون نیکی اور اچھائی کو اصل علم قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ''ہماری جستجو دنیا کے سب سے اہم مسئلے یعنی نیک اور بد زندگی سے متعلق ہے۔ اس کے نزدیک مملکت افراد کے مجموعے کا نام ہے اور مملکت بڑے پیمانے پر فرد کا نمونہ ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک دنیا میں سب انسان مساوی اور برابر نہیں ہیں اور متذکرہ اصل علم مملکت کے وہی چند افراد حاصل کر سکتے ہیں جنہیں فلسفی کہا جاتا ہے اور جو عقل مندی، دانشمندی اور ذہانت میں اعلیٰ ترین مقام رکھتے ہوں۔ چونکہ حکمرانی مشکل ترین فنون میں سے ہے لہٰذا حکومت کی باگ ڈور مملکت کے ان دانا اور ذہنی اعتبار سے اعلیٰ ترین افراد جن میں وسیع النظری اور معاملہ فہمی کی استعداد موجود ہوتی ہے کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے۔ انہیں لامحدود اختیارات حاصل ہونے چاہئیں لیکن عیش وعشرت کے لئے مراعات نہیں ملنی چاہئیں۔ طبعاً دلیر اور شجاع لوگوں کے ذمہ ملک کی حفاظت ہونی چاہیے کیونکہ وہ بہادری کے لئے ممتاز ہوتے ہیں۔ کاشت کار، دستکار مزدور اور دیگر پیشہ ور لوگ اپنے اپنے کاموں کے لئے فطرتاً زیادہ موزوں ہیں لیکن ان میں حکومت کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ اگر یہ تینوں طبقے اپنا اپنا کام کرتے ہوئے ایک دوسرے کی مدد کریں تو مثالی سماج جنم لے گا اور اس سماج میں انصاف قائم ہوگا۔

اس کتاب میں افلاطون کا سیاسی نظام سماج کے تین طبقوں کے گرد گھومتا ہوا ان کی تین خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دانائی محافظوں یا حکمرانوں کی امتیازی خوبی ہے۔ مملکت میں اتحاد قائم کرنے کے لئے دانائی بہادری اور اعتدال کا ربط ضروری ہے اور اسی ربط کے ذریعے افراد کمال حاصل کرتے ہیں۔ سیاسی نظام عدل کے قیام کے لئے سماج کی تین طبقوں میں تقسیم اس معیار پر ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے کام میں ماہر ہو اور وہ اس کام میں مداخلت نہ کرے جس کی اس میں اہلیت نہ ہو۔

اس کتاب میں افلاطون جمہوریت کی بنیاد ''تصور'' پر رکھتے ہوئے اسے حقائق کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے۔ وہ مادی علوم کے ساتھ ساتھ سچائی (روح) کی جستجو، فرد اور معاشرے میں ہم آہنگی کے لئے انصاف کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں مسرتوں سے ہم کنار ہونے کے لئے ہر شخص سے اہلیت، صلاحیت اور گنجائش کے مطابق کام لینا ضروری ہے۔ وہ اپنے فلسفہ کو انصاف کے اصول پر رکھتے ہوئے عالمی انصاف کے تقاضوں پر اجتماعی فرائض کی پابندی کا درس دیتا ہے۔ اس کے خیال میں ''راست عمل'' صرف اچھائی کے تصور سے ممکن ہے اور کسی شخص میں بھی خیر سگالی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ اچھائی اور برائی کے جانچنے کا علم بھی موجود ہونا چاہیے۔ اس کی نظر میں مثالی شہری کی زندگی کے حقائق کا مجموعہ سچائی سے بھر پور منظم زندگی ہوتی ہے اور مثالی مملکت میں ہر طرف اچھائی، نیکی اور انصاف کا دور دورہ ہوتا ہے۔

اس کے نزدیک مثالی شہری میں جسمانی حسن، ذہنی بالیدگی حصول علم کی قابلیت و خواہش، ذوق جمال، برائی سے نفرت، ذہنی اختراع، اچھائی کی پہچان، یونانیوں سے محبت، جسمانی توانائی اور حاضر دماغی جیسی صفات موجود ہونی چاہئیں۔ وہ معاشرے کو تین طبقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ حکمران، سپاہی اور مزدور طبقہ۔ اس کی سیاست میں تیسرا طبقہ مجبور ومحکوم طبقہ ہے جسے فرائض کی نسبت حقوق بہت کم دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں افلاطون مثالی مملکت کے تین بنیادی اصولوں ''اشتہا'' ''روح'' اور ''عقل سلیم'' کو ریاست اور فرد کی مشابہت سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ریاست میں موجود مزدور، کاشتکار، صنعتکار، کلرک، فنکار یا دیگر کاروباری طبقہ انسانی جسم کے معدہ کی مانند ہے۔ شجاعت سپاہیوں کا طرہ امتیاز ہے جبکہ ''اعتدال'' تینوں طبقوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔ وہ انسانی سیرت کی فطری صلاحیتوں کی بنیاد پر ''جسمانی یا نفسانی خواہشات'' ''ہمت و شجاعت'' اور ''دانائی وعقل مندی جیسے تین قدرتی اوصاف میں تقسیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سماج میں مختلف طبقوں کی خاص صفتوں کے لحاظ سے جو تقسیم کی گئی ہے اسے اگر سیرت انسانی سے تشبیہہ دی جائے تو کاشتکار دستکار اور دوسرے پیشہ ور لوگ جسمانی یا نفسانی خواہشات، سپاہی ہمت اور بہادری جبکہ فلسفی اور محافظ دانائی کے مظہر ہیں اور یہ تقسیم فطری صلاحیتوں

کے عین مطابق ہے۔ اس کے لئے وہ نچلے طبقے کی ذہنی تربیت اس عقیدے کے ذریعے کرنے پر زور دیتا ہے کہ خدا نے فلسفیوں اور محافظوں کو سونے سے، سپاہیوں کو چاندی سے اور نچلے طبقے کو تانبے سے بنایا ہے۔ لہٰذا نچلے طبقے پر لازم ہے کہ وہ دونوں برتر طبقوں کی جو انسانیت کے بہترین عناصر ہیں کی پوری اطاعت کرے۔ وہ دراصل طبقوں کی حکومت کے ذریعے سچائی نیکی کا بول بالا اور انسانی سیرت کی اعلیٰ ترین حیثیت دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی مثالی مملکت سیاسی رنگ سے زیادہ مذہبی اور اخلاقی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اصول اور نظریوں میں حکمرانوں کے طور طریقوں اور عقیدوں کی وضاحت کی گئی ہے تاکہ روحانیت کا پرچار ہوسکے۔

اس کتاب میں افلاطون اپنے سیاسی نظام میں ہم آہنگی، اخلاقی وسماجی قوانین کی پیروی اور فرائض کی ادائیگی کو عدل کا نام دیتا ہے۔ اس کے نزدیک مملکت کا دستور جس قدر گراہوا ہوگا مملکت کے شہری اسی نسبت سے سچی خوشی، حقیقی مسرت اور سکون سے دور ہوں گے وہ سیاسی نظام کی بہتری کے لئے عدل کی تعلیم کو ضروری قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ عدل اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب ہر شخص کا تعلق اپنی فطری صلاحیت اور استعداد کے مطابق کسی نہ کسی طبقے سے ہو۔ وہ اس بات کی تردید کرتا ہے کہ زیادہ قدرت رکھنے والے قانون کو اپنے مفادات کو مدنظر رکھ کر بناتے ہیں اور خود پرست انسان دنیا میں گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اس کے نزدیک سیاسی عدل کی اصل غرض ہر طبقے کے تمام افراد کو ان کاموں میں مصروف رکھنا ہے جن کے لئے وہ فطری مناسبت اور صلاحیت کی بنا پر موزوں ہیں۔

اس کتاب میں سپاہیوں کو گھریلو مسرت، ذاتی اور نجی ملکیت سے دور رکھتے ہوئے نچلے طبقے پر فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ اس طبقہ کی ضروریات زندگی کو پورا کرے۔ محافظوں کی ذاتی اور نجی جائیداد بلکہ کسی چیز پر قبضہ یا ملکیت کی ممانعت دراصل معاشی مسائل کو حل کرنا تھا۔

افلاطون نے الجمہوریہ میں محافظ اور سپاہی عورتوں کے بچوں کی تربیت مملکت کی ذمہ داری قرار دی اور ان کی معاشی زندگی کے لئے اصول اشتمالیت تجویز کیا۔ جس میں سپاہیوں اور محافظوں کو جسمانی اور ذہنی خوبیوں کے حامل مردوں اور عورتوں سے عارضی نکاح کرنے

کی اجازت دی گئی تا کہ وہ شہوانی خواہشات پوری کر سکیں۔ خود غرض عورتوں کی محکومیت سیاسی زندگی کے استحکام اور محافظوں اور سپاہیوں کے طبقے کو ایک بڑے خاندان کی حیثیت دینے کے لئے اس نے تجویز کیا کہ پیدائش کے بعد بچے کو ماں سے جدا کر دیا جائے تا کہ ماں کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس کا بچہ کون سا ہے۔ اس لاعلمی سے وہ تمام بچے جن کی پیدائش ایک وقت میں ہوگی اس کی ماتا کے مستحق اور حقدار ہوں گے۔

افلاطون نے الجمہوریہ میں شہری ریاست کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ اپنی نوعیت کا واحد کارنامہ تھا۔ جس میں اس نے تمام مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی پیش کردہ مثالی ریاست میں درج ذیل نکات زیادہ اہم ہیں۔

(1) بادشاہت

(2) اشرافیہ

(3) جمہوریت

حکومت کا حق صرف اور صرف فلاسفر کنگ کے لئے تفویض کیا گیا اور مثالی ریاست کی بنیاد انصاف پر رکھی گئی جس میں اس نے معاشرے کو درج ذیل تین حصوں میں کلاسفائیڈ کیا۔

(1) حکمران طبقہ

(2) فوجی طبقہ

(3) مزدور اور دیگر پیشہ ور طبقہ

اس ریاست میں نچلہ طبقہ اشتہا سے مشابہت رکھتا ہے۔ ریاست کا سپاہی انسانی قلب کی مانند ہے جسے روح سے تشبیہ دی گئی ہے۔ فلسفی یا حکمران انسانی دماغ کی مانند ہے جو عقل سلیم کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے نزدیک ایک فرد میں وہ تمام خواص چھوٹے پیمانے پر موجود ہوتے ہیں جن کا بڑے پیمانے پر ایک معاشرہ حامل ہوتا ہے۔ دونوں میں اشتہا، روح اور عقل سلیم کے عناصر مشترک ہیں اور اس عتبار سے معاشرہ نہ صرف ایک فرد کے پھیلانے کا نام ہے بلکہ ایک فرد ریاست کا اختصار بھی ہے۔

افلاطون کی مثالی ریاست تین عناصر نظام اشتراک، عمل واشتراک املاک، نظام تعلیم

اور فلسفہ کی حاکمیت پر مشتمل ہے۔اس کے خیال میں سپاہیوں اور حکمرانوں کے پاس نجی املاک نہیں ہونی چاہیے اور صرف املاک اور کنبہ کے بارے میں اشتراکیت کا نظام مناسب حالات پیدا کر سکتا ہے۔ تعلیم ایک بنیادی چیز ہے اور اس پر فلسفیانہ ضابطوں کے تحت کنٹرول ضروری ہے۔ تعلیم روح کی پیدائش اور اس کی نشوونما کا نام ہے اس لیے نظام تعلیم کو مکمل طور پر ریاست کے قبضے میں ہونا چاہیے فلسفیوں میں فہم و ادراک، عقل سلیم اور وجدان موجود ہوتے ہیں، ان کا عمل ریاست عمل ہوتا ہے، وہ ہر وقت سچائی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں لہٰذا انہیں حکمران ہونا چاہیے۔انہیں دنیاوی خواہشات اور اقتصادی مشکلات سے آزاد ہونا چاہیے۔

افلاطون کے خیال میں اقتدار 50 سے 70 سالہ عمر کے 37 منتخب عوامی نمائندوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔جن کے ذمہ قانون سازی کے علاوہ سرکاری شعبوں کی نگرانی بھی ہوگی۔اس 37 رکنی جماعت کی مدد 360 رکنی جماعت کرے گی جن کے ذمہ برسر اقتدار جماعت کے احکامات پر عمل درآمد اور ان کا نفاذ ہوگا۔اس کے علاوہ اشراف مرد اور عورتوں پر مشتمل جیوری ہوگی۔ایک دس رکنی جماعت مقننہ کی مدد کرے گی اس کے علاوہ بیس پادریوں پر مشتمل جماعت بیس اور نوجوانوں کی مدد سے پروپیگنڈا کے علاوہ فرسودہ خیالات اور توہمات کو ختم کر کے نئی روشنی کا درس دے گی۔

الجمہوریہ میں مثالی مملکت میں کاشت کار اور درست کار کو تعلیم اور علم سے محروم رکھا گیا۔تبدیلیوں اور ترامیم کر کے مثالی ریاست کے نظام تعلیم کو بھی تین حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے۔

(1) درجہ اول جس میں پیدائش سے لے کر چھ سال کی عمر کے بچوں کو ان کی آیاؤں کے ذریعے مثبت اور اخلاقی کہانیوں، کہاوتوں اور قصوں سے تربیت کی سفارش کی گئی ہے۔

(2) درجہ دوئم جس میں چھ سے اٹھارہ سال تک صرف جمناسٹک اور موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا ضروری قرار دی گئی کیونکہ افلاطون نے جمناسٹک کو صحت مند ذہنی تربیت کے لیے اور موسیقی کو جذباتی صحت کے لیے لازمی قرار دیتا تھا جس کے بعد وہ ان کے امتحان کی سفارش کرتا ہے اور فیل ہو جانے والوں کو وہ تیسرے طبقے میں رکھنے کی سفارش کرتا ہے اس

کے بعد دو سال تک فوجی تربیت لازمی قرار دیتا ہے اور دو سال بعد امتحان میں کامیاب ہونے والے اشخاص کو فوجی طبقہ میں شامل کرنے کی سفارش کرتا ہے۔

(3) درجہ سوئم جس میں 20 سے 35 سال تک وہ ریاضی اور فلسفہ کی تعلیم کے لیے سفارش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ 35 سال کی عمر تک ہونے والے تمام امتحانات میں کامیاب ہونے والے شخص کو حکمران بننے کا حق ہوگا البتہ مزید 15 سال تک جو عملی سیاست کی تربیت حاصل کرے گا وہ فلاسفر کنگ ہوگا جس کو حکومت کے لیے سب پر ترجیح دی جائے گی۔

افلاطون کے خیال میں تعلیم وتدریس کا مقصد انسانی روح کو ایسے ماحول سے روشناس کرانا تھا جس کے تحت اس کی بالیدگی یا ریفائیشن ممکن ہو اس کا خیال تھا کہ ''جس طرح جسم انسان کے لیے خوراک ضروری ہے بالکل ویسے ہی روح کی بالیدگی کے لیے تعلیم اہم ہے اس کے نزدیک مقصد حیات عدل کی تکمیل ہے اور تعلیم عدل کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ہے۔ جب تک افراد کو زیور تعلیم سے آراستہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک عدل کی تکمیل ممکن نہیں ہے اور اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے مثالی ریاست ''Ideal state'' کا نظریہ پیش کیا جس کا مقصد لوگوں کے عام کردار کو بلند کرنا اور ان میں تعلیمی رجحان کا فروغ تھا۔

اس زمانے میں تعلیم کا حصول بالکل ذاتی مسائلہ تھا اور صرف مخصوص اور بااثر افراد کے لڑکے ہی تعلیم حاصل کر پاتے تھے جبکہ لڑکیوں میں تو اول تعلیم نام کو بھی نہ تھی اور اگر چند ایک گھرانوں کی لڑکیاں اس قسم کی جرات کا مظاہرہ کوتیں تو انہیں صرف مخصوص قسم کے مضامین ہی پڑھائے جاتے تھے جن کا تعلق گھریلو زندگی سے ہوتا تھا افلاطون اس سسٹم کے خلاف تھا اور چاہتا تھا کہ لڑکیاں بھی چار دیواری سے باہر نکلیں اور دوسرے تمام مضامین پر تعلیم حاصل کریں وہ تعلیم کو عورت کا حق سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''کتاب ہمارا بہترین دوست ہے اگر وہ چوکیداری کرسکتا ہے تو کیا ایک کتیا یہ کام نہیں کرسکتی یہ درست ہے کہ عورت مرد سے جسمانی طور پر کمزور ہے لیکن اتنی کمزور بھی نہیں کہ اسے تمام حقوق سے محروم کرکے محض بچے جننے یا پیدا کرنے کی مشین سمجھ کر گھر کی چاردیوری میں قید کرلیا جائے۔''

افلاطون نے مثالی مملکت کی بنیاد اخلاق اور مذہب پر رکھی۔قرون وسطیٰ کے ادارے افلاطون کی تصانیف ''ریاست'' اور ''قانون'' کی تعلیم سے نہ صرف متشابہ میں بلکہ ان کے مذہبی اور معاشی نظام میں طبقوں کی وہی تقسیم موجود ہے جو افلاطون نے سیاسی نظام میں پیش کی تھی۔

الجمہوریہ ایک جامع ہے۔ایک کنبہ اور چرچ ہے۔دراصل ایک عالم کے دل کی ابدی آواز ہے۔ایک دانش ور کے یقین کا اظہار ہے۔جو علم اور بصیرت میں ایسی قوتیں کارفرما دیکھا ہے جن پر معاشرتی ترقی کا انحصار ہے۔ارسطو اس کتاب کو اخلاقیات پر الہامی کتاب کا درجہ دیتا ہے۔آگسٹائن کی نظر میں یہ کتاب علم سیاسیات پر مستند اور جامع کتاب ہے۔روسو اس کتاب کو تعلیم کے حوالے سے سب سے بہتر کتاب تسلیم کرتا ہے جبکہ گرین بسانکٹ اور دیگر عینیت پسند مفکر اس تصنیف سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔پروفیسر سیبائن کہتا ہے کہ افلاطون کی اس تصنیف کو کسی ایک موضوع سے منسلک کرنا اس کتاب کی علمی حیثیت کی توہین ہے۔مصنف نے اس کتاب میں اخلاقیات، سیاسیات، نظام تعلیم، نفسیات، معاشیات، مابعد الطبعیات، فوجی تربیت، فلسفی حکمران اور مذہب سے تعلق تصورات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔سینٹ اگسٹائن نے اس کتاب کو سیاسیات پر ایک اہم اور مستند کتاب قرار دیا ہے۔تاریخ سیاسیات میں افلاطون کی مثالی مملکت کی تقلید سسرو، سینٹ آگسٹائن اور سرٹامس مور نے اپنی مثالی مملکتوں کے خاکوں میں اور یورپ کے نشاۃ ثانیہ کے بعد روسو اور ہیگل سیاسی فلسفہ میں کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کی افلاطون کے اپنی اس تصنیف میں نظام تعلیم کے جو تصورات پیش کیے تھے مختلف ادوار میں مختلف اقوام بالخصوص یورپی ممالک کے لیے سنگ میل ثابت ہوئے ہیں اور آج بھی مختلف ممالک میں حالات و ماحول کے مطابق ترمیم و اضافہ کے ساتھ رائج ہیں۔روسو کہتا ہے کہ الجمہوریہ جیسی عظیم کتاب نظام تعلیم پر نہ اس سے پہلے لکھی گئی اور نہ اس کے بعد لکھی جائے گی۔جیورٹ کے مطابق الجمہوریہ ایک یونیورسٹی ہے۔جان لاک لکھتا ہے کہ افلاطون نے اپنی اس تصنیف میں جو تعلیمی تصورات پیش کیے ہیں یہ تصورات ایک باضابطہ نظام تعلیم کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ابن خلدون کے مطابق الجمہوریہ کے تعلیمی تصورات

یورپی ممالک کے نظام ہائے تعلیم کی فلسفیانہ اساس ہے۔ پروفیسر سیبائن کہتا ہے کہ الجمہوریہ نظام تعلیم پر دنیا کی پہلی مستند کتاب ہے۔

10۔ گورجیس یا گورگیاس (Gorgias)

اس کتاب میں عملی سیاست دان، طاقت ور کے حقوق، ہر قیمت پر عدل اور فلسفی کی اہمیت وحقوق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ گورجیس بظاہر خطابت پردازی کے حسن وقبح کے بارے میں ہے لیکن بعد میں بحث کا مرکز اخلاقیات بن جاتا ہے۔ اس کتاب میں افلاطون سقراط کی زبان میں ثابت کرتا ہے۔ کہ حق پژوہی اور حق پر عمل درآمد ہی انسان کا بنیادی مقصد ہے اور خطابت پردازی، ناقص اور گمراہ کن فن ہے۔ سقراط کلی کلیس سے بالآخر منواتا ہے کہ بعض فنون جھوٹے اور بعض سچے ہوتے ہیں اور اسی طرح لذتیں جھوٹی سچی یا اچھی بری ہوتی ہیں۔ سقراط کے مطابق سیاستدان کہلانے کا وہی مستحق ہے جو اخلاقی اقدار سے باخبر ہو اور قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائے۔ آخر میں سقراط نے ایک اسطورے کی مدد سے عالم آخرت میں جزا وسزا پر روشنی ڈالی ہے۔

11۔ مینو (MENO)

یہ کتاب فضیلت کی تعلیم کے بارے میں ہے اور اس امر کو نظریہ امثال سے واضح کیا گیا ہے۔ مینو میں پروٹاگوس کی بحث جاری ہے اور اس اہم مسئلہ پر بحث ہوتی ہے کہ ایسے استاد کہاں سے بہم پہنچائے جائیں جو نیکی کی تعلیم دے سکیں اور اس کی کیا وجہ ہے کہ سیاستدان جو دوسروں کو راہ دکھانے کا دعویٰ کرتے ہیں خود اپنی اولاد کو کچھ نہیں سکھا سکتے۔ سقراط کے خیال میں علم تذکارا کا دوسرا نام ہے۔ ہماری روحوں نے بار بار جنم لیا ہے اور یہ روحیں دونوں جہانوں کی ہر بات سے واقف ہیں۔ یہ وقوف روحوں میں موجود تو ہے مگر گہنا گیا ہے۔ تعلیم وتربیت کا کام اتنا ہے کہ اس خوابیدہ وقوف کو جگا دے۔ ان تمام موشگافیوں کے باوجود اس کتاب کے آخر تک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ نیکی کس طرح سکھائی جا سکتی ہے اور سقراط یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آسمانی توفیق شامل حال نہ ہو تو کچھ بھی حاصل نہیں

ہوسکتا۔

12۔ یوتھیڈیمس (Euthydemus)

'یہ مکالمہ بعد میں آنے والے سوفسطائیوں کے منطقی مغالطوں کے بارے میں ہے۔

13۔ ہپیس (Hyppias)

''حصہ اول''۔ حسن کے بارے میں ہے۔

14۔ ہپیس (Hyppias)

''حصہ دوم'' اس میں اس مسلہ پر تحقیق و بحث کی گئی ہے کہ ارادتاً برا کام بہتر ہے یا غیر ارادی طور پر۔

15۔ کریٹلس (Cratylus)

یہ کتاب نظریہ لسان سے متعلق ہے۔

یہ اشتقاق اور لسانیات کے بارے میں آب و تاب سے پر اور قدرے ظریفانہ مباحثہ ہے۔ زبان کے فلسفے کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر یہ پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے کہ لفظوں کا چیزوں سے کیا رشتہ ہے۔ بحث اس بات پر ختم کی جاتی ہے کہ لفظوں کو براہ راست اشیاء کی ماہیت سے مشتق سمجھنا بہت مشکوک ہے لہٰذا لفظوں کی مدد سے اشیاء کی ماہیت کو سمجھنا بھی ناممکن ہے۔ پھر اشتقاق پر تمسخر آمیز گفتگو کے ساتھ ساتھ تاریخ اور فلسفے کے اہم نکات بیان کئے گئے ہیں۔

16۔ مینکسی نس (Menexenus)

اس کتاب میں خطابت کے نقائص بیان کئے گئے ہیں۔ اصل مضمون یہ ہے کہ تمام دنیاوی حسن حسن حقیقی کے باعث ہے۔ یہ کتاب افلاطون کا عظیم ترین ادبی شاہکار ہے افسانوی رنگ سے سجی سجائی اس روداد میں افلاطون کی قوت ایجاد تمام بندشوں سے آزاد ہو

کر اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ پس منظر میں اگاتھون نامی المیہ ڈرامہ نگار کے گھر پر ہونے والی ضیافت میں سقراط شامل ہے اور جملہ حاضرین خود کو عشق کی ثنا خوانی کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ پاؤسانیا اس کے مطابق عشق دو طرح کا ہوتا ہے اعلیٰ تر اور ادنیٰ تر۔ ادنیٰ صورت میں مردوں اور عورتوں سے دل لگایا جاتا تھا اور نفسانی خواہشات کی تسکین کے سوا کسی بات کا خیال نہیں آتا۔ اعلیٰ تر عشق نوجوانوں سے ہوتا ہے تاکہ ان کی رفاقت میں اعلیٰ اقدار کو پوری طرح اپنانے کا موقع ملے۔ اس کے بعد ایروکسی ماخوس نے اس موضوع کا پیشہ ورانہ اور تکنیکی زاویوں سے جائزہ لیا ہے۔

مشہور طربیہ نگار ارستوفانیس نے دعویٰ کیا کہ انسان اصل میں مکمل تھے اور ان کی تین جنسیں تھیں۔ مرد، عورت اور مخنث۔ زیوس دیوتا نے ناراض ہو کر انہیں دو نیم کر دیا۔ تب سے وہ دن رات اپنے نصف باقی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ عشق گویا اپنی تکمیل کی خواہش اور جستجو ہے۔ مرد عورت خواہاں ہیں کہ کسی طرح وہی حسین دور وصال لوٹ آئے۔ ارستو فانیس تسلیم کرتا ہے کہ عشق ایک ضرورت ہے اور ضرورت بھی ایسی جس میں جسمانی تقاضوں سے پورا بھی بہت کچھ شامل ہے۔ عشق راحت گم گشتہ دوبارہ حاصل کرنے کی تمنا ہے۔

اس کے بعد اگاتھون کی تقریر ہے جو خطابت پردازی کا عمدہ نمونہ ہے جسے سقراط ارستوفانیس کے نظریات کے مقابلے میں ہیچ قرار دیتا ہے۔ آخر میں سقراط دیوتیما نامی فرضی کردار کے ذریعے اپنی گفتگو کرتا ہے۔ دیوتیما سقراط کو سمجھاتی ہے کہ عشق حیاتی اور ابدی دنیا کے مابین رابطوں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ وسیع پیمانے پر تمام لوگ اچھائی سے عشق کرتے ہی لیکن عام طور پر اس سے جنسی لگاؤ ہی مراد ہوتا ہے۔ لیکن عشق کے اس قماش کے دوام کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ توالد و تناسل کا سہارا لیا جائے۔ دیوتیما کے کہنے کے مطابق روحانی توالد کہیں افضل ہے۔ روحانی توالد سے روح کی وہ سرگرمی مراد ہے جس کی برکت سے نہ صرف تمام فنون جنم لیتے ہیں بلکہ تمدنی ارتقاء سے معاشرہ نظم و ضبط سے متعارف ہوتا ہے۔ حقیقی عاشق وہی ہے جو فلسفی ہو اور حسیات کی دنیا سے بلند ہو کر جی سکے۔ ان روحانی مراحل میں پہلے کسی فرد کی ظاہری خوبصورتی سے پھر اس کے جسمانی

حسن سے اور آخر میں روح کے جمال سے عشق کیا جائے۔ گویا یہ سفر مجاز سے حقیقت کی طرف ہے۔ دیوتیما نے جو اصطلاحیں برتی ہیں ان کا رشتہ اسراری مذاہب سے ہے اور اصطلاحیں تمام مراحل اسرار آشنائی کے مراحل سے متشابہ ہے۔

سقراط کی تقریر کے بعد نشے میں چور الکی بیادیس آدھمکتا ہے اور سقراط کی تقریر کو شجاعت اور دانش کا پیکر قرار دیتا ہے۔ الکی بیادیس کو سقراط کی ذات، بلند خیالی، انکسار، روحانیت اور دیوتاؤں جیسی دلربائی کا شستہ امتزاج نظر آتا ہے اس طرح مجازی سطح پر تو الکی بیادیس معشوق اور سقراط عاشق ہے لیکن روحانی سطح پر ان کے کردار الٹ جاتے ہیں۔ الکی بیادیس یہ بتانے سے قاصر رہتا ہے کہ سقراط میں وہ کیا خوبی ہے جو اس کے دل کو کھینچتی ہے۔ دیوتیما کے حوالہ سے وہ سقراط کی روح کے جمال پر فریفتہ تھا۔

17۔فیڈو (Pheado)

اس کتاب میں امثال اور بقائے دوام کے نظریات پر بحث کی گئی ہے۔ فیڈو میں سقراط کی زندگی کے آخری دن کا ذکر ہے۔ اس روز سقراط کے کئی قریبی دوست قید خانے میں موجود تھے اس کی دکھیاری بیوی اور تین کمسن لڑکے بھی ملاقات کے لئے آئے ہوئے تھے لیکن سقراط نے انہیں جلدی رخصت کر دیا تا کہ وہ آہ وزاری مردوں کی گفتگو میں خلل نہ ڈالے۔ موت کی بات چھڑی تو سقراط نے دعویٰ کیا کہ جو آدمی صحیح معنوں میں فلسفی ہوتا ہے اسے موت کی دہشت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وہ اگلی زندگی پر گفتگو کرتے ہوئے اس یقین کے حق میں دلائل پیش کرتا ہے کہ انسانی روح لافانی ہے۔ زندگی کا سرچشمہ روح ہے موت اور زندگی کی طرح موت اور روح بھی متبائن ہیں۔ اس طرح روح کے ابدی ہونے میں کلام نہیں۔ ہم مجرد اور ابدی معاملات کا جو علم رکھتے ہیں وہ سب روح کی دین ہے۔ اس کے بعد دوست غم سے نڈھال اور سقراط مسرور نظر آتا ہے پھر وہ یہ کہتے ہوئے زہر پی لیتا ہے کہ شفا کے دیوتا اس کے پیوس کو ایک مرغا بھینٹ دیا جائے یہ بھینٹ بیمار لوگ شفایابی کی امید یا شفایاب ہونے پر دیتے تھے۔ اس طرح سقراط نے اپنے مخصوص انداز میں بتایا کہ اس عارضے کا جسے ہم زندگی کا نام دیتے ہیں کا علاج موت ہے۔

18۔ فارڈس یا فائیڈروس (Phaedrus)

یہ کتاب محبت کی نوعیت کے متعلق ہے۔ فائیڈروس در حقیقت گورگیاس اور منادمہ کے مباحث کو نئی آب وتاب کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے اس مکالمے میں افلاطونی فکر کے بہت سارے اہم پہلو ہیں جن کی تلخیص ممکن نہیں۔ اس کتاب میں خطابت پردازی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ فن بھی علمی یا فلسفیانہ متانت کا حاصل ہوسکتا ہے۔ سقراط نے عشق کو روحانی قوت قرار دیتے ہوئے کہا کہ انسانی روح ایسے رتھ کی مانند ہے جس میں وہ ایسے گھوڑے جتے ہوں جس میں ایک روحانی اور دوسرا شائستہ ہو۔ منطقی اور علوی کشاکش میں مبتلا روح کو اگر عشق کی رہنمائی نصیب ہوجائے تو وہ اس عالم غیب کی سیر کرسکتی ہے جو ماورائی حقیقتوں کا امین ہے۔ یہی نہیں بلکہ عشق سے سرشار انسان عالم ناسوت میں میں بھی بہت سے عالی ظرفانہ کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔ عشق دیوتاؤں کی دین ہے جو انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے۔

19۔ تھیاٹیٹس (Theaetutes)

سوفسطائیہ کے اس نظریہ کی حفاظت کہ "علم حسی ادراک ہے" اس کتاب کا موضوع علمیات ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ شرطیں کون سی ہیں جنہیں پورا کر کے علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ افلاطون کے خیال میں علم کی بنیاد احساس ہے نہ کہ ذہن۔ احساس کی حقیقت خود اپنے تک محدود ہے اور خیالات الفاظ کا الٹ پھیر ہیں۔ لہٰذا صرف دل ودماغ پر تکیہ کرنے سے علم کا حصول ممکن نہیں۔ اس مکالمہ کا امتیازی پہلو عبارت کی رعنائی اور خوش تماشی ہے۔

20۔ پارمینڈیز (Parmanides)

اس کتاب میں نظریہ امثال پر کی جانے والی تنقید کا جواب دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مشہور فلسفیوں پارمینڈیز، زینو اور سقراط کی افسانوی ملاقات اور ان میں ہونے والی گفتگو کو

رقم کیا گیا ہے۔ گفتگو میں سقراط کی حیثیت زیادہ تر سامعہ کی ہے۔ پہلے پارمینڈیز کی مثالی نمونوں پر تنقید ہے اس کے بعد آٹھ ایسے مابعد الطبیعاتی مقدمات کا سلسلہ ہے جو اعتراضات کی تاب نہیں لا سکتے خود اپنی تغلیط ہیں اور انجام کار چیستانوں میں بدل جاتے ہیں۔ یہ مکالمہ جس کا آخری نصف لفظی اور ذہنی درا کی کا حیرت انگیز کارنامہ ہے خوب ادق ہے۔ پارمینڈیز کی یہ تنقید ایک نادر مثال ہے۔

21۔ سوفسطائیہ (Sophistes)

اس کتاب میں نظریہ امثال کا دوبارہ بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

22۔ پولیٹکس (Politicus)

حکمران فلسفی ہونا چاہیے۔ کسی ریاست کا نصب العین مثالی ریاست کا آئینہ دار ہونا چاہیے اس کتاب کے موضوعات ہیں۔

افلاطون کی دوسری سیاسی فلسفہ پر مبنی اس کتاب میں مدبر کی صفات بیان کی گئی ہیں جو کم وبیش وہی ہیں جو جمہوریہ میں فلسفی یا محافظ کے بیان میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب افلاطون نے اپنی آخری ایام میں 360 ق م میں لکھی۔ اس کتاب کا مقصد حکمران کا مثالی تصور پیدا کرنا اور سیاسیات کو علم کے میدان میں مناسب جگہ دینا ہے یہ کتاب ''قوانین'' سے چند سال پہلے لکھی تھی بارکر کے مطابق اس کتاب میں قانون کے بارے میں ایک نظریہ پیش کیا گیا ہے جو بظاہر قانون کے خلاف ہے اور یہی دونوں اوصاف اس کتاب کا حسن ہے۔

اس کتاب میں افلاطون کے نزدیک ''مدبر'' تمام علوم کا حامل اور قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ ماتحتوں پر جبر کرنے کا حق رکھتا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ مدبر محض قانون بنانے والا ہوتا ہے اور اس سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ان مملکتوں میں جہاں محافظ اور فلسفی موجود نہ ہوں وہاں قانون کی حکومت ہونی چاہیے۔ افلاطون نجی املاک کے خلاف تھا اور خاندان پرستی کی سخت ممانعت کرتا تھا وہ نجی املاک کا حق صرف تیسرے طبقے

کو دیتا تھا اور اس کی خیالی مملکت میں بیویاں رکھنے کا حق بھی صرف اسی کے لئے محفوظ تھا۔

افلاطون کے نزدیک نظام تعلیم اصل مقصد کے حصول کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ خیر یا نیکی کا حصول تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مثالی مملکت انسانی ذہن کی مظہر اور انصاف انسانی ذہن کی صفت ہے لہٰذا انسان کی تربیت اعلیٰ پیرائے پر ہونی چاہیے اور اس مقصد کے لئے بہترین طریقہ تعلیم ہے۔

افلاطون کے نزدیک مملکت کو چاہیے کہ وہ اپنی زیر نگرانی طبقاتی اور مخلوط نظام تعلیم جبری طور پر جاری کرے اور مختلف مدارج کے لئے الگ الگ نصاب کا تعین کرے۔ سات سال تک کی ابتدائی تعلیم میں بچوں کو اعلیٰ اخلاقیات کی حامل کہانیاں سنائی جائیں۔ اٹھارہ سال تک ثانوی تعلیم میں جمناسٹک اور موسیقی کی تعلیم دی جائے تا کہ صحت مند جسم اور صحت مند دماغ ایک ساتھ پرورش پا سکیں۔ ثانوی تعلیم میں صرف کامیاب بچوں کو مزید دو سال تک تعلیم دی جائے اور ناکام بچوں کو نچلی سطح کے فرائض سونپے جائیں۔ دو سالہ تعلیم میں ریاضی اور عملی تربیت پر زور دیا جائے۔ بیس سال کی عمر میں امتحان میں کامیابی حاصل کرنے والوں کو مزید تعلیم دی جائے۔ جبکہ ناکام بچوں کو فوجی فرائض سونپے جائیں۔ 20 سے 35 سال کی تعلیم کے دوران طلباء کو علم ریاضی علم طب، علوم نجوم مابعد الطبیعات اور فلسفہ پڑھایا جائے اور 35 سال کی عمر میں کامیاب ہونے والوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے منتخب کیا جائے اور ناکام ہونے والوں کو وکیل، مجسٹریٹ اور حکومت کے دیگر انتظامی عہدوں پر فائز کیا جائے 35 سالہ تعلیم کے حصول کے بعد کامیاب ہونے والوں کو فلسفہ اور منطق پڑھایا جائے۔ یہ لوگ پچاس سال کی عمر تک تعلیم حاصل کراتے رہیں گے اور فلسفی کہلائیں گے اور یہی لوگ عنان حکومت سنبھالنے کے قابل ہوں گے۔ اس کے یخال میں فلسفی ہی حقیقت اور سچائی کی پہچان بن سکتے ہیں اور انصاف کے ذریعے مثالی مملکت قائم کر سکتے ہیں۔

''مدبر'' میں قانون کو سیاسی زندگی میں ضروری اور ''قانون'' میں قانون کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس کتاب میں وہ اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ قوانین فطری ہوتے ہیں اور فطرت سے لڑنا آسان نہیں ہے اس لئے ہر شخص قانون کی بالادستی تسلیم کر کے ہی اپنی زندگی میں تسلسل برقرار رکھ سکتا ہے۔

افلاطون کہتا ہے کہ '' جب تک قدرت یا تو مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو دانا اور ایماندار یعنی فلسفی بنا دے یا پھر دانا اور ایماندار فلسفیوں کو ریاستوں کا حکمران بننے کا موقع عطا کر دے اور جب تک ان دو میں کوئی ایک کام نہیں ہوگا ریاست کی سماجی زندگی اور اقتصادی وسیاسی حالات کبھی درست نہیں ہوں گے۔

افلاطون کے نزدیک مدبر ربط اور مقصدیت پیدا کر کے افراد اور سماج کو مملکت بنا سکتا ہے۔ اس کتاب میں عدل کی جگہ اعتدال اور دستور اور حقیقی علم کی بجائے ہم آہنگی اور اتحاد باہمی کو سیاسی زندگی کا اصول قرار دیا گیا ہے۔

23۔ فیلی بس (Philebus)

اس کتاب میں لذت اور خیر کے متعلق تشریح کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا مقالہ ہے جس کے ذریعے عقلی اور منطقی تدبر کی قوت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس میں زیادہ تر منطقی بحث ہے اس لئے اصل موضوع یعنی سیاستدان کا کردار اور مقام کتاب کے آخر میں موضوع بحث آیا ہے جس میں تھیوری اور پریکٹس کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے سیاستدان کے لئے عملی سیاست کے ساتھ ساتھ فلسفہ کے علم کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کے نزدیک Politics کی بنیاد Politics Science ہے اور تھیوری عقل اور منطق پر مبنی علم ہے۔

افلاطون کے نزدیک علم کے دو حصے ہیں۔ تنقیدی علم اور حکم دینے والا علم۔ تنقیدی علم کا کام معاملات کا تنقیدی جائزہ لینا جبکہ حکم دینے والے علم کا کام غور و فکر کے بعد حکم صادر کرنا ہے۔ وہ حکم دینے والے علم کو مختلف اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے تجزیہ پیش کرتا ہے کہ پہلی قسم جو حکم دیتی ہے وہ مقتدر اعلیٰ ہے، دوسری قسم اپنے سے برتر ہستی کے احکامات کی بجا آوری کے لئے نچلے درجے کی نوع کو حکم دیتی ہے اور سیاستدان اول درجہ کی نوع سے تعلق رکھتا ہے اور وہی اعلیٰ درجہ علم کا حکم دینے والا ہوتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک علم سیاسیات ایک ایسی سائنس ہے جو ان تمام دوسری سائنسوں سے اعلیٰ اور برتر ہے جن کا تعلق عمل سے ہے۔ یہ سائنس دراصل ریاست کی حکومت کو درست خطوط پر چلانے کی سائنس ہے اور سیاستدان ایک گڈریے کی مانند ہے جو اپنے

سارے ریوڑ کا رکھوالا ہوتا ہے۔ اس کے تمام احکامات انسانوں کی اجتماعی بہتری کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن آخر میں وہ اس مسئلہ کے حل کے لئے ایک فرضی دیو مالائی قصہ کا سہارا لیتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک آئین کی تین قسمیں ہیں۔ قسم ایک ایسے آئین کی ہے۔ جس کی رو سے ایک سربراہ یا مقتدر اعلیٰ ہو۔ دوسری قسم میں یہ فرض کچھ لوگ مل کرادا کرتے ہیں اور تیسری قسم میں بہت سے لوگ مل کر یہ فرض ادا کرتے ہیں۔ افلاطونؒ کے خیال میں آئین کے تین اور معیار بھی ہیں۔

(1)۔ دولت اور غربت کی موجودگی

(2)۔ قانون کی موجودگی یا غیر موجودگی

(3)۔ عوام کی اطاعت بذریعہ جبر یا رضا کارانہ

ان تین قسموں میں سے پہلی دو قسموں سے ہر قسم کو دو مزید قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(1)۔ قانونی بادشاہت اور غیر قانونی آمریت

(2)۔ اشرافیہ یا چند سری

لیکن ان قسموں میں سے کوئی قسم بھی ایک حقیقی ریاست کے وجود کی لازمی شرط نہیں۔

افلاطون کے نزدیک اگر حکمران حقیقی ہے تو معاشرے کے لوگوں کے تمام طبقات خوشحال اور مطمئن ہوں گے اور حکومت کا ہر شعبہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے کام سرانجام دے گا۔ پولیٹیکل سائنس کا علم ہی ایک سیاسی رہنما کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ریاست کی صحیح قانونی اور اخلاقی حکومت وہی ہے جو اس علم کی بنیاد پر فرائض سرانجام دیتی ہے۔

افلاطون کے نزدیک سیاسی فلسفہ کا علم یا تو ایک خاص فرد حاصل کر سکتا ہے یا چند ایک بہتر صلاحیت والے لوگ۔ سارا معاشرہ اس علم کو پوری طرح نہ سیکھ سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ یقیناً اس دور کی صدارتی اور پارلیمانی سیاسی نظاموں کی ابتدائی صورت ہے۔

افلاطون کے مطابق ایک نقلی سربراہ یا سیاستدان عوامی مفاد کے بجائے اپنے ذاتی مفاد یا اپنے ساتھیوں کے مفاد کے لیے قانون بناتا اور نافذ کرتا ہے جس سے عوام کو نقصان

پہنچتا ہے اور عوام ان قوانین اور ضابطوں کو تسلیم نہیں کرتے جبکہ حقیقی حکمران عوام کی خوشحالی اور اجتماعی مفاد کے لیے قوانین اور ضابطے بناتے ہیں جن سے عوام کی سماجی زندگی میں سکھ آتا ہے اور عوام اپنے اس حکمران کا ساتھ دیتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک ایک حقیقی سربراہ کے لیے عوام کی رضامندی کی کوئی خاص ضرورت نہیں اور اسی طرح ایک عالم فاضل اور ماہر قانون سیاسی حکمران کو ریاست کا کاروبار چلانے کے لیے پہلے سے طے شدہ یا تحریر شدہ کسی ضابطہ یا قانون کی ضرورت نہیں۔ بلکہ وہ تازہ ترین احکامات کے ذریعے حکومت چلا سکتا ہے۔ اس کا ہر ایک حکم ایک ضابطہ اور قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک قانون امیر، غریب، کمزور، یا طاقتور کے فرق کو نہیں دیکھتا حالات اور موقع کی نزاکت کو نہیں سمجھتا اس لیے حالات کو بہتر بنانے اور مسائل کو سلجھانے کے مقصد میں ناکام ہو جاتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک ایک حقیقی حکمران فنکار کی مانند ہے جو اپنے فنکارانہ ذہن سے اور فنکارانہ عمل سے آئین وقانون اور ریاست کی تخلیق کا بنیادی مقصد معاشرے کے مختلف طبقات میں سماجی اور سیاسی ہم آہنگی پیدا کرنا ہے اور یہ کام صحیح طور پر اس وقت ہو سکتا ہے جب فنکار اپنی سوچ اور عمل میں آزاد ہو۔

افلاطون کے نزدیک تعلیم دو حصوں پر مشتمل ہے ذہنی تعلیم اور جسمانی تعلیم و تربیت۔ ابتدائی تعلیم جو بنیادی طور پر اخلاقی تعلیم ہے اور جس میں نیکی اور بدی کی وضاحت ہے سب شہریوں کے لئے یکساں طور پر لازمی ہے جس کے بعد ذہنی وجسمانی صلاحیت کے مطابق ہر شخص تعلیمی مراحل طے کرتا ہے۔ تعلیمی نصاب میں تاریخ، جغرافیہ، فلکیات، ریاضی اور آخر میں فلسفہ شامل ہے۔ ہر شخص اپنی فطری ذہنی وجسمانی صلاحیتوں کے مطابق تعلیم حاصل کرتا ہے اور ایک خاص مقام تک پہنچ پاتا ہے۔ تعلیم کا انتظام ریاست کی طرف سے مفت ہے اور ہر شہری کو تعلیم حاصل کرنے کا قانونی حق ہے۔

افلاطون کے نزدیک اعلیٰ ذہنی وجسمانی صلاحیت کے حامل مردوں اور عورتوں میں شادی ہونی چاہیے جن کی اپنی الگ الگ صلاحیت اور فیلڈ ہو تاکہ اولاد میں ماں باپ دونوں کی اعلیٰ خوبیاں شامل ہوں۔

افلاطون کے نزدیک لچک دار آئین وہ ہے جس میں بدلتے ہوئے حالات یا مختلف قسم کے سیاسی مسائل کو سلجھانے کی صفت موجود ہو۔ ورنہ بے رحم قانون کے اطلاق کا خطرہ رہتا ہے۔ اس کے خیال میں ڈیموکریسی کا مطلب ریاست کے تمام شہریوں کی قانون کی نظر میں برابری' ایک منتخب اپنے اعمال کی جوابدہ انتظامیہ اور عوام کا یہ حق ہے کہ وہ بھی غور و فکر اور فیصلہ کا حق رکھتے ہوں لیکن افسوس یہ ہے کہ عوام غیر تعلیم یافتہ ہو کے باعث اس کا کام کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ان کے فیصلے غیر مناسب ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک اریسٹو کریسی کا مطلب امرا اور شرفا کی حکومت ہے لیکن یہ لوگ اپنی خاندانی عزت و وقار کے معاملہ میں بڑے حساس ہوتے ہیں اور ان خاندانوں کے آپس کے جھگڑے آخر کار خانہ جنگی کا باعث بنتے ہیں۔ بادشاہی نظام اگرچہ سماجی بہتری اور بھلائی کے لیے ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار مطلق العنان بادشاہ ایک مغرور' جاہل اور خود غرض آمر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اس کتاب میں خاصے منطقی اور کھرے انداز میں عقل اور لذت کے باہمی رشتے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی زندگی کی غرض و غائیت لذت کا حصول ہے یا دانش کا۔ نتیجے کے طور پر کہا گیا ہے کہ زندگی جس کا مطلب صرف لذت اندوزی ہو اچھی نہیں سمجھی جا سکتی۔ لیکن وہ زندگی بھی قابل تحسین نہیں ہے جس میں تمام توجہ صرف دانش کے حصول پر مرتکز ہو۔ لذت اور دانش دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ البتہ لذت کو دانش کے تابع ہونا چاہیے بحث کے دوران خالص و مخصوص لذتوں اور وحدت و اکثرت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہر شے کا آسمانی عین اپنی جگہ لیکن ناسوت میں وہ کثرت کے روپ میں ظاہر ہونے پر مجبور ہے انسانی ادراک بھی اسی عالم آب و گل تک ہے اور حقائق کی وحدت اور تنزیہی صورتوں تک اس کی رسائی بہت بعید ہے۔

افلاطون نے اس کتاب میں سماج کے مختلف عناصر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ ''انسانی فطرت کے ان مختلف پہلوؤں کا تعلق انسانی مزاج کے مختلف پہلوؤں سے ہے اور معاشرے میں موجود مختلف طبقات کی موجودگی کی بنیادی وجہ بھی یہی فطرت اور مزاج کا تنوع ہے۔ افلاطون کی اس کتاب میں Republic کی طرح سوشلزم یا کمیونزم کا تصور موجود نہیں ہے۔

24۔ٹائمیس (Timeaus)

اس کتاب میں طبعی علوم کا ذکر ہے۔ٹائمیس آپس میں مربوط تین مکالموں میں سے پہلا ہے۔اس کا دوسرا حصہ کرمی قیاس نامکمل رہ گیا اور تیسرے حصے کا لکھے جانے کی نوبت ہی نہ آئی۔یہ افلاطون کی واحد تصنیف ہے جس میں کونیاتی اور انسانیاتی مباحث اور طبعی علوم سے التفات کیا گیا ہے۔یورپی فکر کی تاریخ میں اسے ایک اہم دستاویز کا رتبہ حاصل ہے۔بیانیہ حقائق، مشاہدات، اساطیر اور خیال آفرینیوں کا پرتکلف ملغوبہ ہے۔اسلوب ایک خاص وضع کے معرفت آمیز وقار کا حاصل ہے۔نثر کو سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔اس مکالمہ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ دنیا جہاں کو ایک الوہی ہستی نے بنایا۔اسی ہستی کو مکالمہ میں کہیں باپ، کہیں بنانے والا اور کہیں صناع کہا گیا ہے۔یہ خالق نہ تو لائق پرستش قرار دیا گیا ہے نہ وہ یونانی دیوتاؤں کے مہادیوتا زیوس کا ہم پلہ ہے اور نہ ہی یہودی یا مسیحی روایات کے قادر مطلق سے کوئی نسبت رکھتا ہے۔اعیان ثابتہ اس سے بالاتر ہیں۔وہ تنہا بھی نہیں کیونکہ اسی نے دوسری آسمانی ہستیوں، دنیا اور ستاروں کی روحوں اور انسانی روح میں ابدی جوہر کو تخلیق کیا ہے اس مکالمہ میں زیادہ توجہ بعض فلسفیانہ اصولوں، فلکیاتی امور، عناصر اربعہ اور انسانی نفسیات اور عضویات پر مرکوز ہے۔طبعی علم کی ریاضیاتی بنیادوں کا جائزہ بہت دلچسپ انداز میں لیا گیا ہے۔ٹائمس کے مطابق اس کی باتوں وقرین قیاس افسانے سمجھنا انصاف ہوگا کیونکہ پر لحظہ تغیر آمادہ طبعی دنیا کے موجودات اور معاملات کو جچے تلے سائنسی انداز میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

25۔کرائیٹیس (Critias)

اس کتاب میں مثالی ریاست کا شاہی طرز حکومت سے موازنہ کیا گیا ہے۔اس مکالمہ میں اتلانٹس کے گم گشتہ براعظم کا قصہ ہے۔اتلانٹس میں پہلے مست جگ کی سی فضا تھی لیکن وہاں کے باسیوں نے دیوتاؤں کو فراموش کر دیا اور یوں خود آسمانی قہر کو دعوت دی۔دیوتاؤں نے اس براعظم کو سمندر میں غرق کر دیا۔افلاطون نے یہ کہانی ادھوری چھوڑ دی

ہے۔

26۔ قوانین اور اپی نومس

(Laws and Epinomus)

اس کتاب میں نظریہ امثال کی روشنی میں دنیاوی ریاست کے قوانین اور عام آدمی کی زندگی کے بارے میں بحث کی گئی۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب افلاطون کی آخری تصنیف ہے یہ بارہ ابواب پر ایک ضخیم، بے ادق، بے رس اور الجھی ہوئی کتاب ہے۔ اس تصنیف میں تین شرکاء، جن میں ایک کا تعلق ایتھنز، دوسرے کا تعلق کریتے اور تیسرے کا تعلق سپارٹا سے ہے اور جوزیوس سے منسوب غار اور ملجا کی زیارت پر جاتے ہیں کے درمیان مکالمہ ہے جو دراصل ایتھنز کے شریف زادے کی طوالانی تقریر کی صورت میں ہے جس کے دوران کبھی کبھی ساتھی بھی بول اٹھتے ہیں۔

قوانین میں جس مثالی ریاست کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اس پر قوانین کا مکمل راج ہے۔ اس مکالمہ میں قوانین کی جو وضاحت شامل ہے وہ عام طور پر معاصر ایتھنزی قانون سے مستعار لی گئی ہیں۔ تاہم انہیں وضع کرتے وقت قوانین کے دوسرے مجموعوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ بڑے بڑے اصولوں کا تعین کرتے ہوئے قانون سازی کی گئی ہے۔ شر سے بچنے کے لئے مثالی ریاست میں سخت سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ سرکاری رقوم کے غبن، جنسی جرائم، غداری، دہریت، بارعت اور مقدس چیزوں کی بے حرمتی کی سزا موت تجویز کی گئی ہے۔ کسی فرد کو سونا چاندی رکھنے کی اجازت نہیں ہے لوگ صرف روزمرہ کی ضروریات کے لئے اپنے پاس ریزگاری رکھ سکتے ہیں۔ جہیز لینے دینے پر مکمل پابندی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی یکساں تعلیم کا انتظام ہے۔ غلاموں سے بیگار لی جائے گی اور غیر ملکیوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جائے گا۔ دراصل اس تصنیف کے ذریعے افلاطون نے مثالی ریاست کے خدوخال متعین کرنے کی دوسری بار کوشش کی اس کتاب کے حوالہ سے ایک طنز نگار لوکیانوس نے اپنی ایک تحریر میں زیوس کو یہ واویلا کرتے دیکھایا ہے کہ ''انسانوں نے

مجھے بھلا دیا ہے اور میری قربان گاہیں افلاطون کے قوانین سے بھی زیادہ ٹھنڈی نظر آ رہی ہیں۔"

اس کتاب میں افلاطون کے تجربے کا دھیماپن موجود ہے اور موضوعات کی ترتیب بھی غیر واضح ہے پہلی چار جلدیں تمہیدی مواد پر مشتمل ہیں، جن میں سے دو میں گانے، ناچ اور شراب کے تعلیمی نظام جبکہ دوسری دو جلدوں میں تاریخی لحاظ سے ریاست کی تخلیق اور ارتقاء کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد چار جلدیں ایک آئین کی تیاری کے مواد پر مشتمل ہیں اور ان میں نظام تعلیم اور معاشرتی تعلقات پر بحث کی گئی ہے۔ ان کے بعد ان کی تین جلدوں (9 سے 11) میں ایک قانونی ضابطہ پیش کیا گیا ہے جو اس کتاب کا اہم ترین حصہ ہے جبکہ آخری جلد میں نئے سیاسی اداروں کو متعارف کروایا گیا ہے اس کتاب میں افلاطون نے مذہبی قوانین اور جزا و سزا پر بھی بحث کی ہے اور قانون کے بنیادی اصول بیان کیے ہیں اور ایک مکسڈ آئین جس میں مونارکی اور ڈیموکریسی دونوں موجود ہیں پیش کرتے ہوئے اس آئین کو تصور اور حقیقت کا درمیانی راستہ قرار دیا ہے۔

اس کتاب میں جو سول اور کریمنل قوانین اور ضابطے دیئے گئے ہیں وہ دراصل ایتھنز کے قدیم قوانین کی ترتیب و تالیف نو ہیں۔ ان قدیم قوانین میں افلاطون نے بڑی فلسفیانہ اور قانونی مہارت سے ایسی جدت پیدا کی کہ اس سے نہ صرف یونان بلکہ روم بھی مستفید ہوا۔

افلاطون کے نزدیک بنیادی چیز یہ ہے کہ قانون ساز قانون سازی کا کام شروع کرے تو اس کے ذہن میں مکمل نیکی کا تصور موجود ہونا چاہئے۔ ریاست اور ریاستی قوانین شہریوں کی اخلاقی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہیں جو تمام پہلوؤں سے ہونی چاہیے۔

افلاطون کے خیال میں عقل و دانش اور دتدبر کا دارومدار ضبط نفس پر ہے اور عقل ہمارے ذہن یا ریاست میں صرف اسی صورت کام کرتی ہے جب ہم آہنگی موجود ہو جو بزات خود ضبط نفس کی پیداوار ہے۔ یہ اصول اس لیے اہم ہے کہ Appetite کا عنصر Reason کے عنصر کے سامنے رضا کارانہ اطاعت اختیار کرتا ہے اور یہی ہم آہنگی

کی بنیاد ہے جو ایک قانون کی حکمران کو تسلیم کرنے والی سیاست کی اولین ضرورت ہے اور یہی سماجی اور سیاسی ہم آہنگی عمل و نظریہ کی آزادی کا جوہر ہے کوئی بھی ریاست جو ضبط نفس کے اصول کی بجائے کسی اور نیکی کے اصول کے تحت قائم ہے وہ اصولی طور پر غلط ہے۔

افلاطون کے نزدیک اصل بہادری کی بنیاد ضبط نفس سے ہے اور ضبط نفس کے لیے دانش اور انصاف جیسی صفات ہونا ضروری ہے۔ اصل بہادری یہ نہیں کہ ریاست کے اندرونی خلفشار کو جو جہالت اور بے انصافی کی پیداوار ہوتا ہے نظر انداز کر کے دوسری ریاستوں سے جنگ چھیڑ دی جائے جن کا آخری نتیجہ تباہی اور ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ریاست کو ضبط نفس کے اصول کے تحت لایا جائے تا کہ ریاست کے اندر امن اور قانون کی بالادستی قائم ہو۔

افلاطون کے نزدیک جنگ ایک سیاسی بیماری کی مانند ہے اور جو ریاستیں جنگ ہی کو اپنا نصب العین بناتی ہیں وہ اپنے اس عمل سے ثابت کرتی ہیں کہ وہ اصولی طور پر مکمل ریاست کا درجہ نہیں رکھتیں اور ان کا نظریاتی وجود نامکمل ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ”ریاست میں کوئی قلعہ بندی نہیں کرنی چاہیے یہاں تک کہ شہر کی فصیل بھی نہیں ہونی چاہیے“۔

اس کتاب کی نویں جلد میں وہ قانون کی تمہید بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ انفرادی طور پر ہمارا ذہن اس قابل نہیں ہے کہ وہ سوچ سکے کہ معاشرتی زندگی کے لیے کیا بہتر ہے اور جب یہ شعور پیدا ہو جائے اور ہمارا انفرادی مزاج اتنا بہتر ہو کہ ہمیں سماجی اور اجتماعی بھلائی کی طرف راغب کر سکے تو اس وقت قانون کی ضرورت ہے انسان کو جس اچھائی کی تلاش ہے وہ اجتماعی بھلائی کا اصول ہے اور یہی اصول انسان کی سماجی زندگی کی بنیاد ہے۔ ہمیں قانون کی ضرورت کے ساتھ ساتھ اس قوت کی بھی ضرورت ہے جو اسے نافذ کر سکے۔ قانون ہی وہ اصول ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔

افلاطون کے خیال میں انفرادی مفاد اور خود غرضانہ مفادات کے اس چکر میں اگر کوئی شخص خدا کے فضل اور مہربانی سے خدا کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں کی بنیاد پر اجتماعی نیکی کی جستجو کرے تو ایسے شخص کو بظاہر راہنمائی کے لیے قانون کی ضرورت نہیں کیونکہ فطری نیکی اور عقل و دانش سے بڑھ کر دوسرا کوئی قانون نہیں اس لحاظ سے ایک دانش مند اور آزاد

ذہن اپنا راہنما خود ثابت ہوتا ہے اور اسے کسی دوسری راہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ ایک دیوتائی خواب ہے قانون علمی وعقلی تدبر کی تخلیق ہے اور اپنی ذات میں ہمہ گیر ہونے کے باعث درست سمت میں راہنمائی کرتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک انسان اپنی خواہشوں کے باعث ایک کھلونا ہے۔ ایک طرف اسے انفرادی خواہشوں کی ڈوریاں کھینچتی ہیں تو دوسری طرف روحانی ڈوری' جس کا تعلق عقل وتدبر سے ہے اپنی طرف کھینچتی ہے اور یہی ریاست کے عمومی قانون کی بنیاد ہے۔

افلاطون کے نزدیک جب بہت سارے خاندان کسی ایک جگہ اکٹھے ہوئے تو مختلف خاندانوں کے مختلف رسم ورواج کے ٹکرانے سے قانون سازی کی ابتدا ہوئی اور پھر قابل عمل رسم ورواج کو منتخب کرتے ہوئے ان کے مطابق قانون سازی کی گئی۔ اس کے نزدیک قانون سازی کے کچھ لوازمات ہوتے ہیں اور یہ لوازمات مخصوص قسم کے حالات ہوتے ہیں جو قوانین کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔

اس کتاب میں افلاطون نے اپنے فلسفیانہ نظریات تواریخی حوالوں کی مدد سے پیش کئے ہیں جس میں وہ اپنے فلسفیانہ تدبر کے ذریعے انسان کی سماجی زندگی کے ارتقا کے اصولوں پر علمی اور عقلی بحث کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ ایک سوشل سائنس ہے۔ افلاطون تاریخ کا آغاز طوفان عظیم سے شروع کرتا ہے۔ اور پھر اپنے دور تک انسانوں کی سماجی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ طے کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کس قسم کی ریاست اور کسی قسم کے قوانین انسان کی سماجی اور سیاسی زندگی کو ترقی دینے کے باعث ہیں اور وہ کون سے قوانین تھے جن کے باعث تباہی وبربادی ہوئی اور قوانین میں کسی قسم کی تبدیلیاں لاکر ریاست کو خوشحال بنایا جاسکتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک گو جمہوریت میں جہالت بھی علم کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ لیکن آزادی کی نعمت جمہوریت ہی کی مرہون منت ہے۔ بادشاہت اپنی بڑی شکل میں انسان کی فطری آزادی کی دشمن ہوتی ہے لیکن اپنی حقیقی صورت میں عقل ودانش اور تدبر کی حکمرانی کی نمائندہ ہوتی ہے۔ علم ودانش' آزادی اور خوشحالی ہی ایک ریاست کو حقیقی ریاست بناتی ہیں۔

افلاطون کے خیال میں ہر شہر کو خود کفیل ہونا چاہیے اور اسے اپنی ضروریات کی ہر چیز خود پیدا کرنی چاہیے۔ اس کے نزدیک سمندری فوج یا سمندری راستے سے تجارت قوم کے مزاج کو بگاڑتے ہیں۔ سمندر کسی شہر کو بھی تجارتی مرکز اور بندرگاہ بنا سکتا ہے جس سے لوگ دولت کے پجاری بن جاتے ہیں یہ کاروباری ذہنیت جس طرح ریاست کے اندر اہم آہنگی کو ختم کر دیتی ہے اسی طرح دوسری ریاستوں سے بیرونی تعلقات بھی بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک ریاست کا اقتصادی ڈھانچہ ایسا ہونا ہے کہ اس پر اچھے قانون کی بنیاد رکھی جا سکے۔ آئین بادشاہت اور جمہوریت کا مرکب ہو اور اس میں حکم کا عنصر موجود ہو۔ مختلف طبقات کے درمیان مفاہمت اور ہم آہنگی قائم کرے۔ اس کے خیال میں آئین کے تین درجے ہوتے ہیں اعلیٰ ترین دوسرے درجے کا اور تیسرے درجے کے آئین۔ میں بہترین آئین اقتصادی اشتراکیت پر مبنی ہوتا ہے جبکہ دوسرے درجے کے آئین میں بہترین کے بنیادی اصول شامل کیے جاتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک ہر شہری کی جائیداد دو حصوں میں تقسیم ہونی چاہئے کچھ حصہ شہر کے اندر اور کچھ حصہ سرحد کے قریب۔ ریاست کے تمام شہریوں کی جائیداد ان کی ذاتی ملکیت ہوتے ہوئے بھی ریاست کی اجتماعی ملکیت تصور ہوگی اور ریاست کے اجتماعی مفاد کے پیش نظر استعمال ہوگی۔ سونا چاندی قومی ملکیت تصور ہونگے۔ ایسی علاقائی کرنسی زیر استعمال لائی جائے گی جو دوسرے ملکوں یا علاقوں میں قابل استعمال نہ ہو۔ قرضہ دینے والا اپنی ذمہ داری پر قرض دے گا اور اس کے لیے کوئی قانونی ضمانت بہتر ہوگی۔

افلاطون کے خیال میں قانون کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو دولت کے پیچھے دوڑنے سے روکے جس سے ریاست اور عوام دونوں کا بھلا ہوگا۔ زراعت صرف اس قدر ہونی چاہیے جس قدر عوام کو خوراک کی ضرورت ہو۔ ریاست کے شہریوں کا کام صرف سیاسی فرائض ادا کرنا ہے جب کہ غیر ملکی لوگ صنعت و تجارت کریں۔ درآمدات اور برآمدات پر ٹیکس نہیں ہونا چاہئے۔ اور غیر ضروری تعیش کے سامان کی درآمد پر پابندی ہونی چاہیے۔

افلاطون کے خیال میں تمام سماجی اور سیاسی معاملات میں خواتین کو بھی مردوں کے

شانہ بشانہ کام کرنا چاہئے اور خواتین کو مردوں کے ساتھ ریاست کی عملی سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔ عورتوں کو بھی مردوں ہی کی طرح مشترکہ دسترخوان پر کھانا چاہیے اور انہیں مردوں جیسی عمومی تعلیم و تربیت حاصل کرنا چاہیے۔ خواتین کو مردوں کی طرح فوجی تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ خواتین کو مردوں کی طرح فوجی تربیت حاصل کرنی چاہیے اور مردوں کی طرح کھیلوں میں حصہ لینا چاہیے۔ عورت اور مرد کی شادی ریاست کی مرضی اور ضرورت کے مطابق ہونی چاہیے اور ایسے جوڑے منتخب کئے جانے چاہئیں جن سے ذہنی و جسمانی صلاحیت کے لحاظ سے اچھی اولاد پیدا ہو۔

افلاطون ریاست کے مستقل اداروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک حقوق یافتہ ریاست کی کل 5040 افراد پر مشتمل آبادی کی ایک عوامی اسمبلی ہونی چاہئے جو الیکٹورل اتھارٹی کے طور پر 300 ارکان پر مشتمل کونسل جرنیلوں اور انتظامی افسران کا انتخاب کرے۔ یہ عوامی اسمبلی تین مراحل میں 300 میں سے 175 امیدواروں کو گارڈینز آف دی لاء کے طور پر منتخب کرے گی جو بطور حکمران فرائض سرانجام دیں گی۔ کونسل کا انتخاب مختلف طریقوں سے ہر سال ہوگا۔ پہلے مرحلے میں 90 ارکان' دوسرے مرحلے میں 180 ارکان اور تیسرے مرحلے میں باقی ارکان شہریوں کے چاروں طبقات میں سے منتخب ہونگے۔ اس طرح افلاطون نے یہ نظام عوامی انتخاب اور طبقاتی انتخاب کے اصولوں پر مرتب کیا جسے یونان میں جمہوری انتخاب یا اشرافیہ کا انتخاب کہتے تھے۔

یہ اسمبلی حکومت اور کونسل کے ارکان اور سرکاری افسران کے انتخاب کے علاوہ عوامی عدالت کے فرائض بھی سرانجام دے گی۔ کونسل 12 حصوں پر مشتمل ہوگی اور ہر حصہ اپنی باری پر انتظامی افسران کے ذریعے ریاست کا کاروبار چلائے گی۔ افسران کی تعداد 37 ہوگی اور ہر مجسٹریٹ جس کی عمر 50 سال سے کم اور 70 سال سے زائد نہ ہوگی' 20 سال کے لیے منتخب ہوگا۔ تمام مجسٹریٹ خفیہ طور پر وزیر تعلیم کا گارڈینز آف دی لاء میں سے انتخاب کریں گے اور یہ شخص لائق ترین ہوگا۔

افلاطون کے نظام عدل میں تین قسم کی عدالتیں کام کرتی ہیں۔ پہلی وہ جو فریقین کے ہمسائے اور قریبی لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے دوئم ریاست کے 12 قبائل میں ہر قبیلے کی ٹرائل

کورٹ ہے جس کے جج کا انتخاب ووٹ کے ذریعے کیا جاتا ہے اور سوئم منتخب جج کی عدالت ہے اور لوگوں کے سامنے اپنا فیصلہ سناتی ہے۔ مختصراً افلاطون کے نظام حکومت میں ایک عوامی اسمبلی، منتخب شدہ کونسل، گارڈینز آف دی لاز کا انتظامی ادارہ، فوجی جرنیل، عدالتیں اور علاقائی افسران ہیں۔ اسمبلی کے اہم ممبران پہلے اور دوسرے طبقے کے افراد ہیں جن کی شمولیت اسمبلی میٹنگز کونسل کے انتخاب اور تشکیل میں لازمی ہے۔ تیسرے اور چوتھے طبقات کے افراد بھی عوامی اسمبلی کے باقاعدہ ممبر ہوتے ہیں لیکن یہ اتنے اہم نہیں ہیں۔ کونسل بارہ حصوں میں تقسیم ہے اور ہر ایک ماہ کے لیے اپنے فرائض ادا کرتا ہے۔ گارڈینز آف دی لاء کا انتخاب چاروں طبقات کے افراد مشترکہ طور پر کرتے ہیں جبکہ فوجی جرنیلوں میں کچھ کا انتخاب اور کچھ کو نامزد کیا جاتا ہے۔ عدالت کا انتخاب بھی عوامی سطح پر ہوتا ہے۔ اس طرح افلاطون نے اریسٹوں کریسی اور اولیگریسی کو ڈیموکریسی میں بڑی مہارت اور صفائی سے شامل کیا ہے۔ اور علم و دانش کی حاکمیت کے اصول کو دولت اور آزادی کی حاکمیت کے اصول میں مدغم کرنے کی کوشش کی ہے۔

افلاطون کے نظام حکومت میں ریاست کے شہریوں کی جائیداد اور شادیوں پر ریاست کا کنٹرول ہے اور ہر قسم کے فنکار حکومتی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔ سفیروں کے رابطہ کے لیے نو کلچرل کونسل ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ جیسے ایک زندہ جسم میں ایک دماغ ہوتا ہے اور دماغ کے لیے حواس خمسہ ہوتے ہیں اسی طرح ریاست بھی ایک جسم کی مانند ہے اور یہ نو کلچرل کونسل اس کا دماغ ہے جبکہ ریاست کے دوسرے ماتحت ادارے اس کے مددگار ہیں ذہن خود بھی ایک ہے۔ اس کی مخصوص سوچ بھی ایک ہے اور یہ اپنے ایک خاص مقصد کو اپنے سامنے رکھتا ہے اور وہ نیکی اور اچھائی ہے جو مرکب چیز ہے اس مجموعی نیکی یا اچھائی کے حصول کا واحد طریقہ علم ہے اور ایک ریاست کے لیے حقیقی اچھائی صرف حقیقی حکمران کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے اور جب تک ایک حکمران کے پاس مجموعی نیکی کا علم نہ ہو وہ فطری حکمران نہیں ہے۔ مجموعی نیکی کے آفاقی تصور کے عرفان کے لیے بہت زیادہ تعلیم و تربیت اور محنت و ریاضت کی ضرورت ہے۔

افلاطون کے نزدیک تمام چیزیں ایک اجتماعی صورت میں خدا کی ذات میں مجتمع ہوتی ہیں اور وہی شخص خدا کی ہستی کا عرفان حاصل کر سکتا ہے جو نیکی کی مجموعی صورت کا عرفان

حاصل کرتا ہے۔خدا کی تخلیق پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کائناتی اکائی میں اپنی ذات کو بھی کائنات کے ایک مخصوص حصے کے طور پر جاننے کے قابل ہوں۔ہم جس علم کے ذریعے نیکی کی مجموعی صورت اور خدا کی ذات کا عرفان حاصل کرتے ہیں وہ علم فلکیات ہے۔اس علم کے ذریعے انسان مادے کی حرکت کے قانون کے تحت مادے کی حرکات کا مشاہدہ کرتا ہے اور ذہن جو مادہ کی سب سے اعلیٰ اور تجریدی صورت ہے کائنات میں بنیادی حرکت کا باعث بنتا ہے۔اس لیے انسان کو خدا کی ذات اور مجموعی نیکی کے عرفان کے لیے کائنات اور اس میں موجود اجسام کی حرکات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔انسان کو اس ذہن کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ستاروں میں متحرک ہے اور بنیادی طور پر وجود کا باعث ہے۔انسان کو ان تمام مضامین کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اس مقصد میں ہمارے معاون ثابت ہوں ہمیں اس لحاظ سے موسیقی کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ موسیقی میں موجود ترتیب اور ترکیب بھی کائنات میں موجود ترتیب جیسی ہے اور پھر ہمیں ان تمام چیزوں پر گہرائی سے غور کرنا چاہیے تاکہ ہماری سوچ میں گہرائی آئے۔

افلاطون کے نزدیک ذہانت علم ہندسہ کی مرہون منت ہے۔تمام اعمال وافکار اسی علم ہندسہ کے باعث ہیں۔یہ علم انسانیت کے لیے ایک خدائی تحفہ یا خدائی نعمت ہے اجسام فلکی بھی ذہن رکھتے ہیں جو مسلسل اور مستقل حیثیت رکھتا ہے کائنات کا تسلسل بھی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اجسام مادہ نہیں بلکہ دماغ یا ذہن ہیں اور جو اس ذہن کی ذہانت کا راز پالیتا ہے عرفان حاصل کر لیتا ہے۔علم فلکیات کا مطلب صرف سورج 'چاند کو نکلنے اور ڈوبتے ہوئے دیکھنا نہیں بلکہ اس کا مقصد اس تدبر کا مطالعہ ہے جس کے تحت یہ اجسام حرکت کرتے ہیں اور اس ذہن کے بارے میں غور وفکر کرنا ہے جو ان کو متحرک کرتا ہے۔ہر ڈائیگرام 'ہندسوں کا نظام' ہم آہنگی کا ہر منصوبہ اور ہر طرح کی مطابقت جو ان اجسام میں ہے وہ ایک اکائی کی طرح ظاہر ہونی چاہیے اور جب انسان یکسو ہو کر سوچے گا پھر ازلی ذہانت اور دانش کے ذریعے وہ سماجی اور خوشحالی حاصل کرے گا۔

اس کتاب میں نظریہ امثال کی روشنی میں دنیاوی ریاست کے قوانین اور عام آدمی کی زندگی کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔افلاطون نے اس کتاب میں عدالتوں اور سزاؤں کو

افراد کی اصلاح کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''اس سے مجرم کی نیکی میں اضافہ اور بدی میں کمی ہوتی ہے'' یہ تصنیف روسی قانون دانوں کے لیے رہبری کی حیثیت رکھتی ہے اور یورپ میں اس کا گہرا اثر موجود ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں انسان کو خدا کے کھلونے سے تشبیہہ دی گئی ہے اور انسان کو مجبور دبے بس، جرم وسزا کا پابند اور ہر وقت رہبری کا محتاج بتایا گیا ہے۔ اس کے تمہیدی چار حصوں کے ابتدائی دو حصوں میں رقص اور موسیقی کی تعلیمی قدریں تیسرے حصہ میں مملکتوں کی تاریخی نشوونما اور چوتھے حصے میں سیاسیات کے اعلیٰ اصول بیان کیے گئے ہیں۔ بعد کے تین حصوں میں دستور کی تفصیل نویں حصہ میں تقریریں دسویں حصہ میں مذہبی اور گیارہویں میں عدالتی قوانین کا ذکر ہے۔ آخری حصوں میں نئے ادارے اوران کے ضابطوں پر بڑی فلسفیانہ گفتگو کی گئی ہے۔

اس کتاب میں حاکم اور محکوم دونوں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ملکیت کا حق شہریوں کو مملکت کی جانب سے عطیہ کی شکل میں دیا گیا ہے۔ افلاطون کے خیال میں شہریوں کا ذریعہ معاش زراعت ہونا چاہیے۔ اس کے خیال کے مطابق زرعی اراضی کا ایک حصہ شہر کے قریب اور دوسرا سرحد پر ہونا چاہیے تا کہ شہری مملکت کی حفاظت بھی کر سکیں۔ دست کاری صنعت وحرفت اور تجارت ومملکت کی نگرانی غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ اس کے نزدیک مملکت کا فرض ہے کہ وہ شہریوں کو زیادہ دولت کمانے سے روکے اور سمندر کے نزدیک شہر نہ بسانے دے۔

افلاطون نے اس کتاب میں عورتوں کو نہ صرف سیاسی حقوق دیئے ہیں بلکہ مرد اور عورت کے لیے تعلیم یکساں اور لازمی قرار دی ہے۔ شادی کو ہر طبقے کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور حکمران طبقے اور سپاہیوں کو شادی کرنے اور جائیداد رکھنے کی ممانعت نہیں کی گئی ہے۔ شادیوں میں مزاج کی مناسبت کا لحاظ رکھنا اور شادی کے دس سال بعد تک میاں بیوی کو مملکت کی طرف سے مقرر کردہ تجربہ کار عورتوں کی نگرانی میں رکھنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔

اس کتاب کے تیسرے حصے میں وہ ان اصول کا ذکر کرتا ہے جس سے اس کی رائے میں مستحکم اور پائیدار دستور عمل میں آسکتا ہے۔ لہٰذا وہ دانائی اور آزادی کو ملا کر دستور پیش کرتا ہے۔ انتظامیہ ان عہدیداروں کے ہاتھوں میں دی گئی ہے جن کا چناؤ شہری ایک عام مجلس میں کرتے ہیں۔ عہدیداروں کے علاوہ محتسبوں کی بھی تقرری ضروری قرار دیتے ہوئے

وہ کہتا ہے کہ اس سے حکمرانوں کا محاسبہ اور شہریوں کو عام اخلاق کی نگرانی ہو سکتی ہے" قانون "میں خدائی وحدانیت اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان کو عقیدے اور قانون کی نئی شکل حیثیت سے ہر شہری پر لازم قرار دیا گیا ہے۔

"مثالی ریاست" کے نظریے کے تحت سسلی کا بادشاہ ڈیونی سی اوس دوم نے اسے مثالی ریاست کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کہا۔ جس کی اس نے بے حد کوشش کی مگر ناکام رہا۔ دل شکنی اور رنج والم نے اسے صاحب فراش کر دیا اور آخر کار یہ عظیم دانشمند اور مفکر د مدبر ایتھنز میں 347 ق م میں موت کی آغوش میں ابدی نیند سو گیا۔

یہ کتاب افلاطون کی آخری کتاب تھی جو اس کی وفات کے بعد اس کے شاگرد فلپ آف اوپو نے شائع کرائی۔ مدبر اور قوانین میں بیان کئے گئے سیاسی نظریات الجمہوریہ میں پیش کئے گئے نظریات افلاطون کے آخری اور قطعی خیالات کا اظہار ہیں۔

27۔ خطوط (Letters)

افلاطون سے جو نثری سرمایہ منسوب ہے اس میں تیرہ مکاتیب بھی شامل ہیں۔ موجود دور کے محققین کا خیال ہے کہ ان میں سے تیسرے ساتویں اور آٹھویں میں مکتوب کے اصلی ہونے کا قوی امکان ہے ساتواں مکتوب جو ویون کی ہلاکت کے بعد اس کے دوستوں کو لکھا گیا تھا طوالت کے لحاظ سے باقی بارہ مکاتیب کے مجموعی حجم کے برابر ہے۔ افلاطون کی زندگی کے حالات کے حوالے سے یہ نہایت دقیع دستاویز ہے۔ یہ مکتوب موجود نہیں ہوتا تو افلاطون کی ذاتی زندگی کے بارے معلوم نہ ہو سکتا۔ اس مکتوب میں افلاطون نے اپنی ابتدائی زندگی، عوامی سیاست سے کنارہ کشی اور صقلیہ کی عملی سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ تیسرا مکتوب بادشاہ دیونی سی اوس دوم کے نام ہے۔ یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب بادشاہ اور ویون کے تعلقات کشیدہ تھے۔ آٹھویں مکتوب میں ویون کے دوستوں کو سیاسی نوعیت کے بعض مشورے دیئے گئے ہیں۔ افلاطون کی کہی گئی چند نظمیں بھی ملتی ہیں جس سے اس کی شعری استعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

افلاطون کے اقوال زرّیں

اقوالِ زرّیں (SMS)

(متفرق نظریات وفلسفہ افلاطون ایک نظر میں)

ریاست سے متعلق

(1) حکومت صرف عالموں کا حق ہے۔

(2) سیاستدان کہلانے کا وہی مستحق ہے جو اخلاقی اقدار سے باہر ہو اور قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھائے۔

(3) ریاست کے تینوں طبقے روح کے تینوں طبقوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ نچلا طبقہ نفس امارہ یعنی شکم، فوجی طبقہ نفس لوامہ یعنی دل اور حاکموں کا طبقہ نفس مطمئنہ یعنی دماغ ہے۔

(4) مملکت اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انسانی ذہن تین اجزاء یعنی اشتہا، حوصلہ اور عقل کا مجموعہ ہے جبکہ مملکت کے تینوں طبقے معاشی طبقے، فوجی طبقے اور حکمران طبقہ اسی ذہنی عکس کی پیداوار ہے۔

(5) مثالی مملکت کے سب سے قریب طرز حکومت Timocracy ہے اور یہ حکومت عقل کی برتری پر قائم ہے۔

(6) مملکت محور کل ہے اور فرد کی فریادیت کی ضامن ہے۔

(7) فرد مملکت کا ایک ادنیٰ جزو ہے اور جزو ہونے کے ناطے اس کا صرف اتنا کام ہے کہ وہ ایک کل کی مکمل تکمیل کے لیے دیگر افراد کے ساتھ مل کر سرگرم عمل رہے۔

(8) مملکت وہ اعلیٰ و برتر ادارہ ہے جس کی تکمیل کے لیے دوسرے ادارے اور افراد اپنا سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔

(9) جمہوریت محض دھوکہ اور فریب ہے۔ عام لوگوں کی رائے کو حقیقت یا علم کا درجہ دینا جہالت ہے کیونکہ رائے تعصب اور تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں۔

(10) جمہوریت مستقل کشمکش اور فتنہ وفساد ہے۔

(11) مملکت کے زوال کی پہلی وجہ نام ونمود' نمائش اور شان وشوکت کی خواہش ہے۔

(12) رعایا کی بھلائی ہی حکمرانوں کی بھلائی ہے۔

(13) ریاست اچھائی کے فروغ اور بہتر عوامی زندگی کے لیے تشکیل دی جاتی ہے۔

(14) انسان نے ریاست اپنی ضروریات کی تکمیل کی خاطر تشکیل دی۔

(15) ریاست فرد کی طرح ایک عنصرتی ' فرد ہے۔

(16) ریاست کا یہ فرض ہے کہ افراد کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق جسمانی اور روحانی نشوونما کے لیے بہترین موقع فراہم کرے۔

(17) کوئی ریاست اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی جب تک حکومت ایسے اشخاص کے پاس نہ ہو جو یہ جانتے ہوں کہ ریاست کی بہتری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔

(18) ایک فرد میں وہ تمام خواص چھوٹے پیمانے پر موجود ہوتے ہیں جن کا بڑے پیمانے پر ایک معاشرہ حاصل ہوتا ہے۔

(19) معاشرہ نہ صرف ایک شخص کے پھیلاؤ کا نام ہے بلکہ ایک فرد ریاست کا اختصار بھی ہے۔

(20) حکمرانوں اور سپاہیوں کے پاس نجی املاک ہونی چاہیے اور صرف املاک اور کنبہ کے بارے میں اشتراکیت کا نظام مناسب حالات پیدا کرسکتا ہے۔

(21) حکمرانی کامل مشکل ترین فنون میں سے ہے لہٰذا حکومت کی باگ ڈور مملکت کے ان لوگوں اور ذہنی اعتبار سے اعلیٰ ترین افراد جن میں وسیع النظری اور معاملہ فہمی کی استعداد موجود ہو کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے۔

(22) مسرتوں سے ہمکنار ہونے کے لیے ہر شخص سے اہلیت' صلاحیت اور گنجائش کے مطابق کام لینا ضروری ہے۔

(23) شہری زندگی' زندگی کے حقائق کا مجموعہ اور سچائی سے بھرپور منظم زندگی ہوتی ہے۔

(24) مثالی شہری میں جسمانی حسن' ذہنی بالیدگی' حصول علم کی قابلیت وخواہش' ذوق جمال' برائی سے نفرت' ذہنی اختراع' اچھائی کی پہچان' جسمانی توانائی اور حاضر دماغی جیسی صفات موجود ہونی چاہئے۔

(25) مثالی مملکت وہ ہے جس میں اچھائیوں کو فروغ' انصاف کی تکمیل' کائنات کے ہمہ گیر روحانی نظام کے تحت موجودات کی حقیقت جاننے کی جستجو اور نیکی کے حصول کے لیے عملی جدوجہد ہو۔

(26) اچھا آدمی صرف اچھی ریاست پیدا کرتا ہے۔

(27) حکمران کے پاس علم کا ہونا ضروری ہے۔

(28) حکومت کا قیام اصل مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور یہ اصل مقصد بلاشبہ عوام کا مفاد اوران کی بہبود اور انہیں بہترین اور اخلاقی زندگی فراہم کرتا ہے۔

(29) مملکت کا دستور جس قدر گہرا ہوگا مملکت کے شہری اسی نسبت سے سچی خوشی حقیقی مسرت اور سکون سے دور ہونگے۔

(30) مثالی مملکت کا حقیقی مقصد عدل یا انصاف ہے۔

(31) سمندر کے نزدیک شہر نہ بسائے جائیں۔

(32) اقتدار 50 سے 70 سالہ عمر کے 37 منتخب عوامی نمائیدوں کے ہاتھ ہونا چاہئے جن کی ذمہ قانون سازی کے علاوہ سرکاری شعبوں کی نگرانی بھی ہونی چاہیے۔

(33) دنیا میں سب انسان مساوی اور برابر نہیں ہیں۔

(34) راست عمل صرف اچھائی کے تصور کے باعث ممکن ہے۔

(35) حقیقی مملکت کی تکمیل ہی انسانی زندگی کا اولین مقصد ہے۔

(36) ارباب علم اور اصحاب عمل فلسفی بادشاہ ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں ہی جاہل اور خودغرض سیاستدانوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔

(37) فلسفی ہی نظارہ حقیقت سے بہرہ یاب ہیں۔ ان پر نہ قانون کی پابندی لاگو ہے اور نہ بے جا رسم ورواج کی بندش۔

(38) ریاست ذہن انسانی کی ایک خارجی تشکیل ہے اور اس کی حقیقت اصلاح

ذہن کی اصلاح سے ممکن ہے۔

(39) حکومت اگر فن ہے تو ہر فن کی طرح اس کا مقصد بھی اپنے موضوع کے نقائص کو رفع کرنا ہوگا۔

(40) سچے حکمران کو بے غرض اور محکوموں کے مفاد کا ضامن ہونا لازمی ہے۔

(41) اشتہا کا نمائندہ معاشی طبقہ خاندان رکھ سکتا ہے تا کہ اس طبقہ کی عورتیں حکمران اور فوجی طبقہ کی دیگر مادی ضروریات کی طرح جنسی خواہشات بھی پوری کرسکیں۔

(42) مملکت کو ایک خاندان کی طرح ہونا چاہیے۔

عدالت سے متعلق

(43) سرکاری غبن' جنسی جرائم' غداری' دہریت' بدعت اور مقدس چیزوں کی بے حرمتی کی سزا موت ہونی چاہیے۔

(44) عادل شخص ظالم سے زیادہ دانش مند زیادہ قوی اور زیادہ خوشحال ہوتا ہے۔

(45) عدل کل کا جوہر ہے اور تمام محاسن اخلاق کی شرط اول ہے۔

(46) محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ حکمت کی روشنی میں ریاست کے لیے مقاصد کا تعین کرے اور اس کے وسائل تجویز کر کے ریاست سے ان پر عمل کروائے۔

(47) مددگار محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ شجاعت و جرات سے ریاست کی حفاظت کرے۔

(48) دولت مند گروہ کا عدل یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی کے کل پرزوں کو اعتدال کے مطابق چلائے۔

(49) سزاؤں سے مجرم کی نیکی میں اضافہ اور بدی میں کمی ہوتی ہے۔

(50) انسان مجبور' بے بس اور جرم و سزا کا پابند ہے۔

(51) اجتماعی زندگی میں سچا اصول عقل ہے۔

(52) عدل روح کی ایک صفت اور ذہن کی ایک عادت ہے۔

(53) عدل اسی وقت تک قائم ہوسکتا ہے جب ہر شخص کا تعلق اپنی فطری صلاحیت اور استعداد کے مطابق کسی نہ کسی طبقہ سے ہو۔

(54) سیاسی عدل کی اصل غرض ہر طبقے کے تمام افراد کو ان کاموں میں مصروف رکھنا ہے جن کے لیے وہ فطری مناسبت اور صلاحیت کی بنا پر موزوں ہیں۔

(55) انسانی قدریں اور اخلاق کا تعلق ضمیر سے ہے اور انسانی ضمیر کو جبر واستبداد اور سزا کے ذریعے کام پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

(56) انصاف ایک اندرونی قوت ہے جو انسان کے فطری رجحانات سے منسوب ہے۔

(57) انصاف یا عدل یہ ہے کہ مختلف افراد اور طبقوں میں ان کی ذہنی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق فرائض تفویض کیے جائیں اور وہ طبقہ یا افراد ان تفویض کردہ فرائض کو اپنے متعین کردہ دائرہ کار میں رہتے ہوئے سرانجام دیں دوسروں کے فرائض میں مداخلت نہ کرے اور نہ ہی اپنے دائرہ کار سے تجاوز کرے۔

(58) کسی حقدار کو حق دینا ایک Universal Thought ہے انصاف نہیں۔

(59) انصاف کا تعلق انسانی روح سے ہے اور وہ ایک داخلی مکمل اور غیر متبدل ہے۔

(60) انصاف ایک مقصد ہے اور اس کی تکمیل معاشرہ کے لیے فرض کی حیثیت رکھتی ہے۔

(61) عدل ایک اعلیٰ ترین نیکی ہے۔

(62) آسمانی توفیق شامل نہ ہو تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

(63) لذت اور دانش دونوں لازم وملزوم ہیں۔ البتہ لذت کو دانش کے تابع ہونا چاہیے۔

(64) ہر شے کا آسمانی عین اپنی جگہ لیکن ناسوت میں وہ کثرت کے روپ میں ظاہر ہونے پر مجبور ہے انسانی ادراک بھی اسی عالم آب وگل تک ہے اور حقائق کی وحید اور تنزیہی صورتوں تک اس کی رسائی بہت بعید ہے۔

(65) صرف دل ودماغ پر تکیہ کرنے سے علم کا حصول ممکن نہیں۔

(66) احساس کی حقیقت خود اپنے تک محدود ہے اور خیالات الٹ پھیر ہیں۔

(67) دنیا ایک الوہی ہستی نے تخلیق کی اور اسی نے دوسری آسمانی ہستیوں دنیا اور ستاروں کی روح میں ابدی جوہر کو تخلیق کیا ہے۔

فلسفہ وعقل سے متعلق

(68) تصورات ہی حقیقت ہیں۔

(69) حقیقی عشق وہی ہے جو فلسفی ہو اور حیات کی دنیا سے بلند ہو کر جی سکے۔

(70) ایک صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے۔

(71) تصور ہی حقیقت ہے۔

(72) حواس خمسہ صرف انفرادی اشیاء کو محسوس کرواتے ہیں جبکہ ذہن اس چیز کا ایک عمومی آفاقی تصور پیش کرتا ہے۔

(73) ایک خیال یا تصور اپنی ذات میں مکمل چیز ہے اور خود اپنی وضاحت ہے۔

(74) خیالات کا جہاں اصل حقیقت اور سچائی ہے اور یہی حتمی وجود ہے۔

(75) حواس خمسہ کا جہاں ایک مکمل یا حتمی غیر حقیقت یا عدم وجود ہے۔

(76) خوبصورتی سے محبت کا جذبہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

(77) فلسفہ خود ایک عظیم مقصد ہے۔ فلسفہ کسی شے کے لیے نہیں بلکہ سب چیزیں فلسفے کے لیے ہیں۔

(78) تصور حتمی اور آفاقی ہوتا ہے اور یہ کسی فرد کی ذاتی رائے یا تاثر کا تابع نہیں ہوتا۔

(79) تصور ایک معروضی حقیقت ہوتا ہے اور اس کا اپنا وجود اور اپنی حقیقت ہوتی ہے۔

تعلیم سے متعلق

(80) تعلیم کا مقصد خود آگاہی ہے اس لیے دوران تعلیم روح کی شکل پذیرائی کا اہتمام ضروری ہے۔

(81) اصل تعلیم 50 سال کے بعد شروع ہوتی ہے کیونکہ اس عمر میں انسان کی عمر پختگی کے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔

(82) تعلیم فرد کی روح اور ذہن کو جلا بخشتی ہے اور وہ خیر وشر نیکی و بدی اور اچھے اور برے کی تمیز کر سکتا ہے۔

(83) مردوں اور عورتوں کے لیے تعلیم یکساں ہونی چاہیے۔
(84) تعلیم ہی ایک ذریعہ ہے جس سے ناقص معاشرے کو نئے سرے سے نئی بنیاد پر استوار کیا جا سکتا ہے۔
(85) تعلیم ہی وہ بہترین ذریعہ ہے جس سے نیک اور بہترین انسان پیدا ہو سکتے ہیں۔
(86) ہر شخص میں خیر سگالی کے جذبہ کے ساتھ ساتھ اچھائی اور برائی لے جانچنے کا علم موجود ہونا چاہیے۔
(87) تعلیم ایک بنیادی چیز ہے اور اس پر فلسفیانہ ضابطوں کے تحت کنٹرول ضروری ہے۔
(88) تعلیم روح کی پیدائش اور اس کی نشو نما کا نام ہے۔
(89) نظام تعلیم مکمل طور پر ریاست کے قبضے میں ہونا چاہیئے۔
(90) فلسفیوں میں فہم و ادراک عقل سلیم اور وجدان موجود ہوتے ہیں ان کا عمل راست عمل ہوتا ہے وہ ہر وقت سچائی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں لہذا انہیں حکمران ہونا چاہیئے انہیں دنیاوی خواہشات اور اقتصادی مشکلات سے آزاد ہونا چاہیئے۔

عشق سے متعلق

(1) روحانی صعود کے مراحل میں پہلے کسی فرد کی ظاہری خوبصورتی ہے پھر اس جسمانی حسن سے جو مجموعی طور پر نسل انسانی کو لاحق ہوا ہے اور آخر میں روح کے جمال سے عشق کیا جائے۔
(2) عشق دیوتاؤں کی دین ہے جو انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے۔

فن و ادب سے متعلق

(1) لفظوں کو براہ راست اشیاء کی ماہیت مشتق سمجھنا بہت مشکوک ہے اور لفظوں کی مدد سے اشیاء کی ماہیت کو سمجھنا بھی ممکن ہے۔
(2) بعض فنون جھوٹے اور سچے ہوتے ہیں۔ اسی طرح لذتیں بھی جھوٹی اور سچی اچھی اور بدی پر مبنی ہوتی ہیں۔

(3) خطابت پردازی ناقص اور گمراہ کن فن ہے۔

(4) ایک فنکار یا ادیب اپنے فن یا ادب کو عقلی استدلال کے تحت تخلیق نہیں کرتا بلکہ وہ ایک وجدانی کیفیت میں سب کچھ کہتا ہے۔

(5) شاعری اور فنون لطیفہ جذبات کو برانگیختہ کر سکتے ہیں جس سے معاشرے میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

(6) شاعری اور فنون لطیفہ طبعی دنیا کی نقل ہے اور اس حساب سے وہ نقل کی نقل ہے اور اصلیت سے بہت زیادہ دور ہونے کے سبب اعتبار کے قابل نہیں۔

(7) موسیقی جس میں ادب اور فن بھی شامل ہے مملکت کے اخلاقی مقاصد کی تکمیل میں مدد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔

(8) موسیقی کا مقصد ذہن کی براہ راست تربیت کرنا' جذبات کی اصلاح کر کے متوازن بنانا اور قوت استدلال کو صورت اظہار بخشنا ہے۔

(9) موسیقی فرد کی روح کو ایسے ماحول سے روشناس کرواتی ہے جس کی بدولت انسان پیش آنے والے مسائل کو اپنی طرز پر حل کر سکتا ہے۔

(10) حواس خمسہ کے محسوسات یا حواس خمسہ کا عمل علم نہیں بلکہ یہ ایک دھوکا اور فریب ہے۔

اخلاق سے متعلق

(1) کائنات اور اس کے مظاہر ایک بامقصد تخلیق ہے۔

(2) فطرت کا کوئی آزاد وجود نہیں ہے۔

(3) حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہونے والا علم نامکمل اور غیر یقینی ہوتا ہے۔

(4) حقیقی، مستند اور پائیدار علم صرف دلیل پر مبنی ہوتا ہے۔

(5) انسانی عقل علم کے ذریعے معنیٰ اور ترتیب تلاش کر کے موجودات کی نوعیت اور ان کی حقیقت کو خود پر عیاں کرتا ہے۔

(6) نیکی، بھلائی، سچائی اور خوبصورتی کی حیثیت ونوعیت غیر متغیر اور ابدی ہوتی ہے۔

(7) ایک مثالی زندگی ایک مثالی معاشرے میں ہی ممکن ہے۔

(8) برائی نہ صرف پورے معاشرے کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ اس سے کائنات کی ابدی روح کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

(9) برائی ایک نامکمل اچھائی اور کائنات کی بے ترتیبی اور بے قاعدگی کا نتیجہ ہے۔

(10) حسن اپنی ہیت میں وسیع روحانی نظام کی فطرت کا عکس ہے۔

(11) نیکی یا فضیلت علم ہے اور بے علم وجدانی فیصلے بعض اوقات غلط ثابت ہوتے ہیں۔

(12) اچھائی وہ ہے جس پر صحیح عمل کا انحصار ہو جو دوسروں کو سکھائی جا سکتی ہو اور جو وجدانی نہ ہو۔

(13) تخلیق انسانی ذہن کا ایک اسلوب ہے۔

(14) نیکی یا اخلاق بذات خود ایک مقصد ہے اور ان کا حصول انسانی زندگی کا نصب العین ہے۔

(15) دوسروں کو دیکھ کر نیکی کرنے والے نقال اور معمولی درجے کے ایماندار ہوتے ہیں۔

(16) اصل خوشی کسی کمزور اور مظلوم کی مدد کرنے اور حق بات کہنے سے حاصل ہوتی ہے چاہے اس کے لئے مال وجان کی قربانی دینی پڑے۔

(17) ہماری جستجو دنیا کے سب سے اہم مسئلے یعنی نیک اور بد زندگی سے متعلق ہے۔

وحدت سے متعلق

(1) خدائی ودیعت اور اس کی قدرت کاملہ پر ایمان لانا ہر شہری پر لازم ہے۔

(2) موجودہ مادی کائنات اپنی ہیت کے اعتبار سے حقیقی نہیں بلکہ اس حقیقی کائنات جو ماورائے کائنات میں حقیقت مطلقہ کی صورت میں موجود ہے کا عکس ہے۔

(3) بنیادی طور پر انسانی روح ایک ایسی خارجی قوت ہے جو عرش سے پھوٹ رہی ہوتی ہے جو اپنی فطرت میں لافانی ہے اور اس کا تعلق اس حقیقی کائنات سے ہے جو ہمارے حواس سے بالاتر کہیں اور موجود ہے۔

افلاطون کی موت

347ق م میں افلاطون اسی برس کا ہو گیا تھا۔ لکھنے لکھانے کا کام ختم ہو جانے کے باعث وہ اکثر اپنے شاگردوں میں گھرا رہتا۔ ایک دن وہ اپنے ایک شاگرد خاص کی شادی پر مدعو تھا۔ نوجوان شاگرد شادی کی خوشیوں میں شریک تھے اور وہ ایک کونے میں کرسی پر براجمان ان کی خوشیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ رات گئے شادی کا ہنگامہ ختم ہونے پر جب شاگرد اپنے استاد کے پاس آئے تو وہ اپنے ہونٹوں پر ایک دائمی مسکان اور چہرے پر اک ابدی سکون لئے گہری نیند سو رہا تھا اور اس کی روح جہان خیالات میں اپنے استاد سقراط کے پاس جا چکی تھی۔ دوسرے روز لوگوں نے اس کی قبر پر یہ اقرار کیا کہ اس ''عظیم فلسفی کی چھوڑی ہوئی یادیں رہتی دنیا تک قائم رہیں گی''۔

افلاطون کی زندگی کے آخری ایام میں اکیڈیمی کی سربراہی کے لیے جھگڑا پیدا ہوا۔ ارسطو کی خواہش تھی کہ وہ اپنے استاد کے بعد اس اکیڈیمی کا سربراہ بنے اور استاد کے کام کو آگے بڑھائے لیکن افلاطون کی موت کے بعد اس کی خواہش اور وصیت کے مطابق اس کا بھتیجا سپسی پس (Speusippus) جو ریاضیاتی اعداد کا قائل اور اکائی کو تکوینی عقل اور خیر مطلق سے الگ تصور کرتا تھا اکیڈیمی کا سربراہ بنا جس پر ارسطو دل برداشتہ ہو کر ایشیائے کوچک کی طرف چلا گیا۔

افلاطون کی وفات کے بعد اکیڈیمی کے جملہ اراکین میں سے اس کی وصیت کے مطابق صدر کا انتخاب عمل میں لایا جاتا رہا۔ یہ سلسلہ برسوں تک چلتا رہا حتیٰ کہ 529ء میں شہنشاہ جسٹی نین نے اسے ختم کر دیا۔ افلاطون نے ساری زندگی شادی نہیں کی بلکہ مرتے دم تک اس اکیڈیمی میں درس وتدریس کے ذریعے ریاست کی تعمیر نو کے لیے نئی نسل تیار کرتا رہا۔ زندگی کے آخری دور میں اس نے شہرت کی بلندیوں کو چھوا اور اس کی قائم کردہ اکیڈیمی ایک وسیع مجلس علم اور درسگاہ تسلیم کر لی گئی۔

افلاطون کا جانشین ۔ ارسطو

یونانی فلسفی اور اسائنس دان ارسطو بھی افلاطون اور سقراط کی طرح قدیم فلسفیوں میں مشہور ترین ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ وہ مقدونیا میں Stagira کے مقام پر ایک شاہی طبیب کے گھر پیدا ہوا۔ 17 سال کی عمر میں افلاطون کی اکیڈمی میں پڑھنے کی غرض سے ایتھنز چلا گیا۔ 347ق م میں افلاطون کی وفات پر وہ ایشیائے کوچک کے ایک شہر آسوس (Assos) منتقل ہوا جہاں اُس کے ایک دوست دہرمیاس کی حکومت تھی۔ وہاں اُس نے ہرمیاس کے مشیر کا عہدہ سنبھالا اور اُس کی بھانجی اور پالک بیٹی پاتھیاس سے شادی کرلی۔ 345 قبل مسیح میں جب فارسیوں نے رہرمیاس وکو پکڑ کر سزائے موت دے دی تو ارسطو مقدونیا کے دارالحکومت پیلا (Pella) چلا آیا اور بادشاہ کے نوجوان بیٹے سکندر کا اتالیق بن گیا۔ 355 قبل مسیح میں جب سکندر بادشاہ بنا تو ارسطو نے واپس ایتھنز آ کر اپنا مکتبہ لائسیم قائم کیا۔ چونکہ اُس کے اسکول میں اساتذہ اور طلبا زیادہ تر بحثیں چلتے پھرتے ہوئے کرتے تھے اس لیے یہ Peripatetic (چہل قدمی کرنے والوں کا) مکتب مشہور گیا۔ 323 قبل مسیح میں سکندر کی وفات کے بعد ایتھنز میں مقدونیا کے خلاف جذبات میں بہت شدت آ گئی اور ارسطو یوبیا (Euboea) میں واقع خاندانی جاگیر پر چلا گیا اور اگلے سال وہیں فوت ہوا۔

ارسطو نے علم منطق اور خصوصی علم کی متعدد شاخوں کی بنیاد رکھی۔ کارل مارکس نے اُسے ''قدیم دور کا عظیم ترین مفکر'' قرار دیا تھا۔ اُس نے افلاطون کے نظریۂ اعیان (تھیوری آف آئیڈیاز) پر تنقید کی لیکن اُس کی عینیت پر پوری طرح غلبہ نہ پاسکا اور عینیت اور مادیت کے درمیان ہی ڈانواں ڈول رہا۔ فلسفہ کے میدان میں ارسطو نے تین اہم کام سرانجام دیے:

1۔ تھیوریٹیکل یا نظری پہلو: وجود، اس کے عناصر ترکیبیں، علتوں اور ماخذوں کے حوالے سے غور فکر؛

2۔ عملی پہلو: انسانی سرگرمیوں کے حوالے سے؛ اور

3۔شاعرانہ پہلو؛ جس کا تعلق تخلیقیت سے تھا۔

سائنس کا مطمحِ نظر عمومی نوعیت کا ہے، یعنی جو ذہن کے ذریعہ قابلِ حصول ہو۔تاہم ،عمومی چیز صرف حسیات کے ذریعے ادراک میں آنے والے افراد میں موجود ہے اور اس کے ذریعہ ہی اسے شناخت ملتی ہے۔عمومی کے ادراک کے لیے استقرائی عمومیت (Inductive Generalisation) شرط ہے جو کہ حسی ادراک کے بغیر ناممکن ہے۔ارسطو نے چار اساسی علتوں کو شناخت کیا۔۔۔(1)۔مادہ دیا ہست ہونے کا مجہول امکان؛ (2)۔۔جوہر یا ہیئت، جس کی حقیقت مادے میں محض ایک امکان ہے؛(3)۔۔حرکت کا آغاز؛اور (4)۔مقصد۔

ارسطو ساری فطرت کو''مادے'' سے''ہیئت''اور پھر واپس''ہیئت'' سے''مادے'' کی جانب تبدیلیوں کے طور پر دیکھتا ہے۔تاہم ،اُس نے مادے میں صرف مجہول اُصول (Passive Princilple)ہی دیکھا اور تمام فعالیت (activity) کو ہیئت کے ساتھ جوڑ دیا۔اُس کی نظر میں فعالیت کا مطلق منبع خدا ہے۔۔۔''غیر متحرک ازلی محرک۔''بایں ہمہ''مثال کے بارے میں ارسطو کا معروضی عینی نظریہ کئی حوالوں سے افلاطون کی عینیت کی نسبت زیادہ دُور رس، زیادہ عمومی اور زیادہ معروضی ہے۔وہ مادیت کے بہت قریب قریب پہنچا۔

ارسطو کی روایتی منطق نظریہ علم اور اور نظریہ صداقت کے ساتھ قریبی طور پر منسلک ہے، کیونکہ اُس نے منطقی امثال میں وجود کی اشکال بھی دیکھیں۔نظریہ علم میں اُس نے واضح طور پر تسلیم شدہ اور ممکن کے درمیان فرق کیا۔بہر حال وہ عالم کی ان دو صورتوں کو زبان کے ذریعہ مربوط کرتا ہے۔ارسطو کے مطابق تجربہ''آراء'' کی تصدیق کے عمل میں حتمی مرحلہ نہیں،اور سائنس کے اعلیٰ دعوے کی سچائی حسیات کے بجائے ذہن کے ذریعہ جانچی جاتی ہے۔تاہم،قیاس کے ذریعہ قابلِ تحصیل آفاقی مقولے (Axioms) ہمارے اذہان میں خلقی طور پر موجود نہیں۔سائنس کا حتمی مقصد موضوع (subject) کا تعین کرنا ہے اور اس کے لیے استخراج (Deduction) اور استنباط (Induction) شرط ہے۔چونکہ کوئی ایسا تصور موجود نہیں جو دیگر تمام تصورات کی توثیق کرے اور نتیجتاً مختلف تصورات کو ایک

عمومی صورت میں واحد زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ لہٰذا ارسطو نے زمرے (کیٹگریز) یعنی اعلیٰ تر گروہ پیش کیے جن کے ساتھ حقیقی طور پر موجود دیگر تمام گروہوں کا تعلق ہے۔

تکوینیات (Cosmology) میں ارسطوں نے فیثا غورث کے پیروکاروں کا نظریہ مسترد کرتے ہوئے ایک کرۂ ارض پر مرکوز پیش کیا جو سورج کو مرکز قرار دینے والے نکولس کا پرنیکس کے دور تک تمام مفکرین اور سائنس دانوں کے ذہنوں پر چھایا رہا۔ اخلاقیات میں ارسطوئی تفکر (مراقبہ) کو اعلیٰ ترین ذہنی سرگرمی قرار دیا۔ اس کی وجہ غلاموں کی جسمانی محنت کو ذہنی تعیش سے الگ کیا جانا تھا۔ یہ ذہنی سہولت صرف آزاد یونانیوں کے لیے مخصوص تھی۔

ارسطو کے مطابق اخلاقیات کا مثالی نمونہ خدا تھا۔۔۔ کامل ترین فلسفی، ''خود متفکر فکر۔'' اُس کے نظریۂ معاشرت میں غلامی کی جڑیں تھیں، ریاستی اتھارٹی کی اعلیٰ ترین صورتیں وہ تھیں جن میں طاقت کا خود غرضانہ استعمال نہ ہو سکے اور جن کے تحت حکام سارے معاشرے کو فائدہ پہنچائیں۔

فلسفے میں ارسطو کی حیص بیص کا نتیجہ بعد میں اُس کے دورُخے کی صورت میں سامنے آیا۔ مادیت پسندانہ رجحانات نے جاگیردارنہ معاشرے کے فلسفہ میں ترقی پسندانہ خیالات کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کیا، اور عینیت پسندانہ عناصر کو قرون وسطیٰ کے اہل کلیسیا نے وسعت دی اور ارسطو کی تھیوریز کو محض الٰہیاتی بنا کر پیش کیا۔

افلاطون کی طرح ارسطو نے بھی اکیڈمی میں اپنے ابتدائی سالوں کی دوران باقاعدگی سے مکالمات کو استعمال کیا، لیکن افلاطون جیسی تخیلاتی صلاحتیوں سے عاری ہونے کے باعث اُس نے غالباً کبھی بھی اس جیسا انداز نہ پایا۔ بعد کے مصنفین کی تحریروں میں چند ایک شذروں کے سوا اُس کے ڈائیلاگ میں سے کوئی بھی ہم تک نہیں پہنچا۔ ارسطو نے کچھ مختصر ٹیکنیکل نوٹس بھی لکھے، مثلاً فلسفیانہ اصطلاحات کی لُغت اور فیثا غورث کے عقائد کا خلاصہ تاہم، ارسطو کے لیکچر نوٹس آج بھی موجود ہیں جو اُس نے علم اور آرٹ کی تقریباً ہر شاخ کے حوالے سے لکھے تھے، یہی نوٹس ارسطو کی شہرت کی بنیاد ہیں۔

روم کے زوال کے بعد مغرب میں ارسطو کی تحریریں کھو گئیں۔ 9ویں صدی عیسوی

کے دوران عرب محققین نے ارسطو کو عربی میں ترجمہ کر کے اسلامی دنیا میں متعارف کروایا۔ بارہویں صدی عیسوی کا ہسپانوی، عربی فلسفی ابن رُشد اُن عرب محققین میں سے مشہور ترین ہے جنہوں نے ارسطو کا مطالعہ کیا اور اُس کی تشریح و توضیح کی۔ تیرہویں صدی میں لاطینی مغرب نے ارسطو کے کام میں دوبارہ دلچسپی لی اور سینٹ ٹامس آکوینس کو اس میں عیسائی فکر کے لیے ایک فلسفیانہ اساس مل گئی۔ کلیسیائی حکام نے شروع شروع میں ٹامس آکوینس پر اعتراض کیا۔ ارسطو کا فلسفہ اپنی دریافت نو کے ابتدائی مراحل میں کچھ شک کی نگاہ سے دیکھا گیا جس کی بڑی وجہ یہ خیال تھا کہ اُس کی تعلیمات دنیا کے مادیت پسندانہ نکتۂ نظر پہ منتج ہوتی ہیں۔ بہرکیف آکوینس کی تحریروں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور بعد کا فلسفۂ علم الکلام آکوینس کی پیدا کردہ روایت پر ہی قائم رہا جس کی بنیاد ارسطوئی فکر پر تھی۔

ارسطو کے فلسفہ کا اثر ہمہ گیر ثابت ہوا۔ حتیٰ کہ اس نے جدید زبان اور فہم عامہ کی تشکیل میں بھی مدد دی۔ اُس کے نظریہ ''ازلی محرک'' بطور حتمی علت نے الٰہیات میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ 20ویں صدی سے پہلے تک منطق کا مطلب ہی ارسطو منطق تھا۔ نشاۃ ثانیہ سے بعد تک بھی ماہرین فلکیات اور شعرا اُس کے تصور کائنات کو مانتے رہے۔ اُنیسویں صدی میں برطانوی سائنس دان چارلس ڈارون نے انواع کے غیر متغیرین کے نظریے کو بدلا، لیکن اُس سے پہلے تک زوالوجی کا انحصار ارسطو کے کام پر ہی رہا۔ 20ویں صدی میں ارسطو کے طریقۂ کار اور تعلیم کے ساتھ اس کے تعلق کی ایک نئی جہت کو سامنے لایا گیا۔

نہ صرف شعبہ زوالوجی بلکہ بحیثیت مجموعی علمی دنیا کا جائزہ لینے پر ڈارون کا یہ کہنا بالکل درست نظر آتا ہے کہ اُس کے اپنے دور کے عقلی ہیروز ''بوڑھے ارسطو کے مقابلے میں محض طفلِ مکتب تھے۔''

احمد عقیل روبی رکھتے ہیں۔

جڑی بوٹیوں اور دوائیوں کی ملی جلی خوشبوؤں کی فضا میں سانس لینے والا یہ بچہ آگے چل کر بہت بڑا آدمی ثابت ہوا۔ عظمت اور کارکردگی کی اونچی فصیل پر اس نے اپنے نام کی تختی لٹکائی۔ صدیاں گزر گئی ہیں مگر اس تختی پر لکھے اس کے نام کے حروف اب بھی ستاروں کی طرح روشن اور تابندہ ہیں۔ انسانی علم کی وہ کونسی شاخ ہے جس کے نام کا پھول نہیں مہک

رہا۔فزکس، بیالوجی، زوالوجی، فلسفہ، خطابت، شاعری، تنقید، موسیقی، ڈراما تھیٹر، اخلاقیات، نفسیات، سیاست، رموزِ سلطنت، سائنس، جمالیات غرض ''چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں اس کی''۔

تین چراغ ایک دوسرے سے روشنی لے کر روشن ہوئے اور اب تک روشن ہیں۔ سقراط، افلاطون کا استاد تھا، افلاطون نے یہی علم سقراط سے لے کر ارسطو کو دیا اور پھر تینوں نے یہ علم و ہنر انسانی نسلوں کو منتقل کیا۔ان کا فیض قیامت تک آنے والی نسلوں میں جاری رہے گا۔

ارسطو کا باپ مقدونیہ کے بادشاہ Amyntas کے دربار سے منسلک تھا Amyntas فلپ کا باپ اور سکندر اعظم کا دادا تھا)۔ارسطو کی پرورش بڑے شاہانہ انداز میں ہوئی۔18 سال کی عمر میں اسے ایتھنز میں افلاطون کی اکیڈمی میں پڑھنے کے لیے بھیجا گیا۔افلاطون کی تربیت نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ارسطو بہت ذہین تھا۔افلاطون اسے اپنی اکیڈمی کا ''موتی'' کہا کرتا تھا۔ارسطو کو اپنے استاد کے چند نظریات سے اختلاف بھی تھا، جس کا وہ دبے دبے الفاظ میں کبھی کبھی اظہار بھی کیا کرتا تھا، افلاطون ہنس کر ٹال دیتا تھا۔افلاطون کا ایک فقرہ تو ایتھنز کی گلیوں میں بہت مشہور بھی ہوا تھا:

''ارسطو وہ بچھڑا ہے جو ماں کا سارا دودھ پی کر ماں کو دولتیاں مار رہا ہے''

واقعہ یوں ہے کہ افلاطون سے ایک بار ایک طالب علم نے ارسطو کی شکایت کی اور کہا کہ ارسطو اس کے کچھ نظریات کا مذاق اڑاتا ہے اور سرعام کہتا ہے:

''افلاطون کے مرنے سے فلسفہ مر نہیں جائے گا''

افلاطون نے شاگرد کی بات سن کر قہقہہ لگایا اور کہا:

''اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔دراصل ارسطو وہ بچھڑا ہے جو ماں کا سارا دودھ پی کر ماں کو دولتیاں مار رہا ہے۔''

بچھڑا ماں کو دولتیاں مارتا رہا۔ماں ہنس ہنس کر بچھڑے کی دولتیاں برداشت کرتی اور پیار سے دیکھتی رہی۔ارسطو افلاطون کے پاس 20 سال تک رہا۔جب 347 قبل مسیح میں افلاطون فوت ہوا تو ارسطو نے اپنے استاد کی قبر کا کتبہ لکھا۔بعدازاں وہ اپنے دوست اور

افلاطون کے ایک شاگرد ہرمیاس کے پاس ایشیائے کوچک کی ایک ریاست Atameus چلا گیا۔ ہرمیاس اس ریاست کا بادشاہ تھا۔ یہ وہی ہرمیاس ہے جس نے افلاطون کو اپنے پاس بلایا تھا اور پیش کش کی تھی کہ افلاطون ریاست کو اپنی مثالی ریاست (Republic) کے مطابق چلائے۔ افلاطون وہاں گیا لیکن ناکام واپس لوٹا۔

ارسطو تھیوفرائٹس (Theopdhratus) کے ساتھ جزیرہ Lesbos بھی گیا۔ وہاں زوالوجی اور باٹنی کے بے شمار تجزیے کیے۔ واپس آ کر ہرمیاس کی بھتیجی پیتھیاس (Pythisas) کے ساتھ شادی کی اور ہرمیاس کی موت تک وہاں تجربات میں مشغول رہا اور خوشحال زندگی بسر کرتا رہا۔ 343 قبل مسیح کے ابتدائی دنوں میں اسے مقدونیہ کے بادشاہ فلپ دوئم کی طرف سے ایک خط موصول ہوا۔ خط کی تحریر کچھ یوں تھی:

''فلپ دوئم کی طرف سے ارسطو کو سلام۔

آپ کی اطلاع کے لیے تحریر ہے کہ دیوتاؤں نے مجھے ایک بیٹا عطا کیا ہے۔ میں دیوتاؤں کا شکر گزار ہوں۔ اس بات پر نہیں کہ مجھے بیٹا عطا کیا بلکہ اس پر کہ وہ آپ کے زمانے میں پیدا ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ آپکی تربیت اور رہنمائی میں ایک بہتر اور اچھا بادشاہ ثابت ہوگا۔''

ایک فلاسفر کو ایک بادشاہ کا یہ خط فلاسفر کی عظمت کا اعتراف تھا۔ ارسطو نے اس دعوت نامے کو قبول کیا اور فلپ دوئم کے بیٹے سکندر اعظم کا اتالیق بننا منظور کر لیا۔ ارسطو کی عمر اس وقت 30 سال تھی۔

ارسطو چند سال اپنی تجربہ گاہ میں تجربات کرتا رہا اور پھر اسے دوبارہ سے سکندر کی باقاعدہ تربیت کا بلاوا آ گیا۔ ارسطو کو سکندر کی پیدائش پر فلپ سے کیا ہوا وعدہ نبھانا پڑا اور وہ مقدونیہ چلا گیا۔ ایک مصنف نے بادشاہ اور فلسفی کے اس بندھن کے بارے میں بڑی اچھی بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اس ملاپ اور بندھن سے دو باتیں سامنے آئیں۔ بادشاہ کا بیٹا طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا اور پوری دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ فلسفی انسانی دماغ کے سامنے فکر و خیال کی ایک نئی دنیا دریافت کرنا چاہتا تھا۔ دونوں اپنی اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں کامیاب

رہے۔''

ارسطو نے مقدونیہ جا کر Pellas کے قریب Mifza کے مقام پر اپنا سکول قائم کرلیا اور درختوں کے جھنڈ میں سکندر اور دیگر امیر آدمیوں کے بیٹوں کو تعلیم دینے لگا۔ سب ارسطو کی پتھریلی نشست کے گرد جمع ہو جاتے اور اس کی گفتگو سن کر حیران ہوتے رہتے۔ ارسطو دنیا بھر کے علوم اور مسائل کی گرہیں کھولتا رہتا اور نوجوان مستفید ہوتے رہتے، نہ استاد روائتی انداز میں پڑھاتا تھا اور نہ شاگرد روائتی انداز میں پڑھنے کے عادی تھے۔ سکندر استاد کی باتیں سن سن کر بڑا عقل مند ہو گیا تھا اور اپنے فیصلے خود کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔

ایک دن ارسطو نے اپنے ایک شاگرد سے پوچھا:

''بادشاہ بننے کے بعد اگر تم کچھ مسائل میں گھر جاؤ اور تخت کو کچھ خطرات کا سامنا درپیش ہو تو تم کیا کرو گے۔''

شاگرد نے جواب دیا:

''میں بزرگ اور تجربہ کاروں سے مشورے لے کر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

دو ایک شاگردوں نے بھی کچھ ایسے جوابات دیئے۔ جب ارسطو نے یہی سوال سکندر سے کیا تو اس نے جواباً کہا:

''میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ نہ ہی کوئی دوسرا آدمی دے سکتا ہے۔ جب ایسا وقت آ جائے تو اس سوال کا جواب میں حالات کے مطابق دوں گا۔ پتا نہیں حالات کیا ہوں اور خطرات کیا''

ارسطو نے سکندر کو بادشاہی رموز اور درباری صورتحال سے نمٹنے کے گُر سکھائے۔ علم و فلسفے کی مسرت سے اسے آگاہی دی۔ سکندر کے دل میں عظیم یونانی شاعر ہومر (Homer) کی محبت کے بیج بوئے۔ سکندر ساری عمر ہومر کی عظمت کا قائل رہا۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر جب بھی کسی فوجی مہم پر جاتا تو ہومر کی دونوں کتابیں (ایلیڈ اور اوڈیسی) بکس میں اپنے ساتھ رکھتا اور اپنی فوجوں کو میدان جنگ میں اسی طرح ترتیب دیتا تھا جس طرح ہومر نے یونانی

فوجوں کوٹرائے کی جنگ میں دکھایا تھا۔

سکندر کے والد فلپ نے ارسطو کی بہت عزت کی۔سٹاگیریا کا شہر(جوکسی پرانے بادشاہ نے حملہ کر کے برباد کر دیا تھا) ازسرِنو تعمیر کرایا اور وہاں کے لوگوں کو عزت اور خوشحالی کی بے بہا دولت بخشی۔

سکندر جب سکندر اعظم بن گیا تب بھی ارسطو کے احترام میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔وہ اکثر کہا کرتا تھا:

''میرے باپ نے مجھے زندگی دی ہے لیکن ارسطو نے مجھے اس زندگی کو اچھا اور بہتر بنانے کا فن سکھایا ہے''

ارسطو جب اپنی 40 میل لمبی تجربہ گاہ میں جانوروں، مویشیوں، پرندوں، مچھلیوں اور وحشی جانوروں کی عادات وخصائل پر تجربے کر رہا تھا تو سکندر نے دو ہزار آدمیوں کو ارسطو کی حفاظت میں دے دیا تھا کہ وہ ارسطو کا ہاتھ بٹا سکیں مسودے اور کتابیں اکٹھی کر کے ارسطو کی خدمت میں پیش کیں، جن تک رسائی ارسطو کے بس میں نہ تھی۔

جب سکندر ایشیا فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا تو ارسطو ایتھنز چلا آیا اور وہاں اپنا اسکول Lycemu قائم کر لیا،علم کے پیاسے جوق در جوق اس سکول کی طرف آنے لگے۔ارسطو نے 12 سال تک Lyceum میں مختلف علوم کی تدریس کا کام جاری رکھا اور وسیع پیمانے پر ایسے مسودے اور مقالے لکھے جو طالب علموں کے لیے بھی مددگار ثابت ہوئے اور اس کے بعد آنے والی نسلوں نے بھی اس سے استفادہ کیا اور آج تک کر رہی ہے۔ان علوم میں

1)Physics 2)Metaphyscis 3)Politics

4)De Anima (on the soul) 5)poetics

شامل ہیں۔فزیکل سائنس میں ارسطو نے

1)Anatomy 2)Astronomy 3)Embryology 4)Geography

5)Geology 6)Meteorology 7)Physics 8)Zoology

کے موضوعات پر کتابیں لکھیں۔علاوہ ازیں

1)Philosophy 2)Ethics 3)Politics 4)Metaphysics

5)Economics 6)Psychology 7)Theology 8)Rhetoric

پر رسائل اور کتابیں لکھیں۔ ارسطو نے تمام علوم پر مباحث کیے، لیکچر دیے، مسودات مرتب کیے۔ اس کے علاوہ اس نے رسومات، ادب اور شاعری پر مقالے بھی لکھے۔ کہا جاتا ہے کہ ارسطو شاید واحد آدمی تھا جس نے ہر وہ علم حاصل کیا جو اس کے عہد میں موجود تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اپنے عہد میں جاری اور موجود علم کو حاصل کیا بلکہ اس نے علم میں اضافہ کر کے اسے وسیع کیا اور آگے بڑھایا۔

سکندر اعظم اپنی زندگی کے آخری برسوں میں ارسطو کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار ہو گیا تھا۔ اسے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ شاید ارسطو اس کے مخالف گروپ میں شامل ہو گیا ہے سکندر نے ارسطو کو خطوط لکھ کر اس بات کا اظہار بھی کیا تھا۔ سکندر کے پاس اس کا ثبوت بھی موجود تھا۔ اور وہ ثبوت ارسطو کا بھتیجا کالیستھینز تھا، جسے سکندر نے غداری کے جرم میں موت کی سزا دے دی تھی۔ ایک اڑتی ہوئی خبر یہ بھی تھی کہ سکندر کی موت کے پیچھے ارسطو کا ہاتھ بھی شامل تھا، لیکن اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

سکندر کے خلاف ایک گروپ سرگرم عمل تھا اور اس کی سرگرمیاں سکندر کے مقدونیہ سے غائب رہنے کی وجہ سے اور تیز ہو گئی تھیں۔ یہ گروپ سکندر کی خاص عنایات کی وجہ سے ارسطو کے بھی خلاف تھا۔ سکندر اعظم کی موت کے بعد مقدونیہ اور ایتھنز میں یہ گروہ اور مشتعل ہو گیا۔ ارسطو نے حالات کا جائزہ لیا اور ایتھنز چھوڑ کر اپنی والدہ کے شہر چلا گیا اور جاتے جاتے یہ کہہ گیا:

"میں ایتھنز کے لوگوں کے ہاتھوں فلسفے کو دوبارہ موت کے گھاٹ نہیں اترنے دوں گا۔"

پہلی بار وہ سقراط کے ساتھ یہ سلوک کر چکے تھے۔ ارسطو نے ایتھنز سے بھاگ کر Euboea میں پناہ لی۔ چند روز بیماری میں مبتلا رہا اور 322 قبل مسیح میں فوت ہو گیا۔ اس نے اپنے ایک شاگرد کو وصیت کی کہ مجھے میری بیوی کے پہلو میں دفنایا جائے۔

ارسطو کے علمی، تحقیقی اور تجرباتی کارنامے قابل رشک ہیں۔ ارسطو نے 147 تحقیقی مقالے، رسالے یا کتابیں لکھیں۔ جن میں سے صرف 47 اب لائبریریوں میں محفوظ

ہیں۔یوں تو ارسطو کا ہر مقالہ اس کی تحقیقی کارکردگی ایک اعلیٰ مثال ہے مگر Meataphsics,on the soul,Organon اور Topics بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔جن میں منطق، بیالوجی اور نفسیات کے بارے میں اس کے خیالات سے زمانہ اب تک مستفیض ہورہا ہے۔اس کا رسالہ Poetics دنیائے ادب میں تنقید کی پہلی کتاب ثابت ہوئی۔جدید زمانے کی تنقید اب تک اسی کے اردگرد گھوم رہی ہے مشہور انگریز دانش اور جان ڈرائیڈن Jhon Dryden نے ارسطو کی عظمت کو ایک فقرے میں یوں قلم بند کیا ہے:

He Made his Torch Universal Light

ارسطو کی مشعل نے ایسی عالم گیر روشنی کا روپ دھارا کہ صدیوں سے زمانہ اس کے خیالات کی چاندنی میں اپنا راستہ بنا رہا ہے۔Thomson کہتا ہے:

"For Two Thousand Years and Through out All Lands Men Have Come to Aristotle, and Found in Him Information and Instructions That Which they Desired".

(Lesbos) جزیرے میں ارسطو نے بہت کام کیا۔انسان کو چھوڑ کر پرندوں، جانوروں اور مچھلیوں پر تجربے کئے۔وہ کہا کرتا تھا کہ میں نے صرف آدمی کے جسم کو نہیں کھولا ورنہ ہر جانور اور پرندے کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا ہے ارسطو کے جانوروں اور پرندوں پر تجربے بہت کامیاب رہے۔اس نے

1)History of Animals

2)Generations of Animals

3)Parts of Animals

لکھ کر آنے والی انسانی نسلوں کے لیے کام بہت آسان کر دیا۔سمندری جانوروں کی زندگی پر اس کے تجربے بہت کامیاب رہے۔کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ سب کچھ لکھ کر اپنے وقت سے دو ہزار سال پہلے تحقیق کا ڈول ڈالا۔انیسویں صدی تک تحقیق اسی کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں چلتی ہے۔اس نے

1) Cati Fish　　2) Electric Fish
3)Torpedo　　4) Angler Fish
5)Octopus　　6) Sepia (Cuttle Fish)

کے بارے میں بنیادی اطلاعات فراہم کیں اوران پر تجربے کیے۔اس کے علاوہ اس نے زندہ رہنے والی اشیا کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا۔اور Animals with bloodاور Animals without bloodکے خانوں میں تقسیم کیا۔جدید سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ارسطو کے ہاں تحقیق کی کچھ اغلاط پائی جاتی ہیں لیکن اس کی بنیادی تحقیق سے انکار ممکن نہیں۔

عملی فلسفے میں ارسطو کا کام بہت اہم نوعیت کا ہے۔اس نے آدمی، ریاست اور شہری زندگی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔(Politics) میں وہ ریاست، حکومت، انسان اور معاشرے کے باہمی تعلق پر اپنے خیالات کا کھل کر جائزہ لیتا ہے۔وہ شہری زندگی اور آدمی کے تعلق کو ایک باہمی اشتراک قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اشتراک ایک نیک عمل کی خاطر ہے تا کہ آدمی اچھی اور بہتر زندگی گزار سکے۔

فرد اور ریاست یا شہر کا یہ اشتراک اچھے کاموں کے لئے ہونا چاہیے۔صرف اکٹھے اور مل جل کر رہنے کے لئے نہیں۔یہ معاہدہ عمرانی موت کے خوف سے بھی کیا جاتا ہے اور ریاست سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ شہری یا دفرد کی زندگی کی حفاظت کرے۔

افلاطون عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ دیتا ہے جبکہ ارسطو کا خیال ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔اس کا خیال ہے کہ عورتیں شہری زندگی میں مردوں جتنا کام نہیں کرتیں جبکہ افلاطون کا خیال ہے کہ اگر گھوڑا چھکڑا کھینچ سکتا ہے تو گھوڑی بھی چھکڑا کھینچنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ارسطو مسرت کے حصول میں عورتوں کو مردوں کے برابر جگہ دیتا ہے اور کہتا ہے:

''وہ معاشرہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا جس میں عورتوں کو مردوں کے برابر حصول مسرت کے مواقع نہ دیے جائیں''

اپنی کتاب RHETORIC میں وہ سپارٹا کی مثال دے سکتا ہے کہ سپارٹا کا

معاشرہ اس لئے ترقی نہیں کر سکتا کہ وہاں عورتوں کی حالت مردوں کے مقابلے میں بہت بدتر ہے اور عورتیں بدحالی میں جی رہی ہیں۔

ارسطو کے تحقیقی کاموں کا جائزہ بے حد مشکل کام ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو ارارسطو کا کام اتنا وسیع ہے کہ آدمی دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے جبکہ دوسری وجہ ان علوم کے حوالے سے لاعلمی ہے جن پر ارسطو نے تحقیق کی۔ میں عاجز اور بے بس ہوں کیونکہ ان علوم سے آشنائی پیدا کرنے کے لئے ایک عمر چاہیے۔ میں نے ارسطو کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک دانا اور عقل مند آدمی کی بات پر عمل کیا ہے اس نے کہا تھا:

''کتاب سے جھگڑا مت کرو کتاب پڑھتے ہوئے الجھن میں مت پڑو۔ کتنی سمجھ میں آئی ہے سنبھال لو۔''

میں نے بھی یہی کیا ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق ارسطو کو پڑھا اور جتنا ہو سکا یادداشت میں سنبھال کر رکھ لیا۔

ارسطو کی ایک کتاب (Poetics) تنقید کی بہت اعلیٰ اور مستند کتاب ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو تنقیدی نظام کی پہلی کتاب ثابت ہوئی۔ تنقیدی نظریات کی پرچھائیاں ہومر Homer کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ تنقیدی اشارے افلاطون کے مکالموں میں بھی ملتے ہیں مگر باقاعدہ تنقیدی نظام ان دونوں کے ہاں نہیں ہے۔ اس باقاعدہ نظام کی بنیاد ارسطو نے بوطیقا (Poetics) لکھ کر رکھی اور بعد میں آنے والوں نقادوں نے اس بنیاد پر اپنے اپنے محلات بنائے اور سرخرو ہوئے۔

ارسطو کا تنقید شعر پر لکھا ہوا یہ مقالہ جس کا نام اس نے Concering.the art of poetry رکھا تھا۔ دراصل یہ مقالہ اس نے اپنے طالب علموں کی رہنمائی کے لئے لکھا تھا۔ نقادوں کی نظر میں یہ نامکمل اور ادھورا مقالہ ہے۔ ارسطو نے اس میں کچھ باتوں کو مکمل لکھا ہے۔ کچھ پر سرسری بات کی ہے اور کچھ کو ادھورا چھوڑ دیا ہے۔ اس کی دوسری دو کتابوں (RHETORIC) اور (politics) کے مقابلے میں بوطیقا (poetics) کا اسلوب اکھڑا اکھڑا سا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل کلاس نوٹس تھے۔ جنہیں بعد میں اکٹھا کر کے کتاب بنا دیا گیا۔ اس خامی کے باوجود بوطیقا فلسفیانہ انداز میں لکھی ہوئی

تنقید کی پہلی مکمل کتاب ہے۔ یہ کتاب ادبی تنقید کا ایک مکمل نصاب ہے جس میں ارسطو طالب علموں کو ڈرامائی شاعری کے بارے میں ہدایات دیتا ہے۔ شاعری کی تعریف، ابتدا، شاعری کی اقسام اور شاعری کی ارتقائی صورتحال پر بات چیت کرتا ہے۔ شعری ڈرامے کی تشکیل میں ضروری عناصر کی نشاندہی کرتا ہے اور شاعری پر کیے گئے نقادوں کے اعتراضات کا جواب دیتا ہے۔ اس وقت شاید افلاطون واحد آدمی تھا جس نے شاعری کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ارسطو نے اس کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ بوطیقا کو نقادوں نے افلاطون کے تنقیدی نظریات کا جواب نامہ کہا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے مثال کے طور پر:

1۔ افلاطون شاعری کو نقل کی نقل قرار دیتا ہے۔ ارسطو مثال دے کر وضاحت کرتا ہے کہ شاعری عظیم سچائی سے تین منزلیں دور ہے لیکن ارسطو اسے ایسی نقالی قرار دیتا ہے جس میں آفاقی سچائی موجود ہے۔ شاعری کا طریقہ کار تاریخ سے زیادہ قابل قدر ہے۔ تاریخ کا مقصد صرف حقائق بیان کرنا ہے جبکہ شاعری حقائق کی انتہائی صورت کو بیان میں لاتی ہے۔

2۔ افلاطون کا خیال ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ اس مسرت سے نہیں لگانا چاہیے، جو کسی فن پارے کو پڑھ کر محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ اس سچائی سے لگانا چاہیے جو نقل پیش کرتی ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ ہر چیز کی مکمل نقالی ہی اصل سچائی کا سبب ہے۔

3۔ افلاطون کا خیال ہے کہ شاعری جذبات میں اشتعال پیدا کرتی ہے چنانچہ اسے قید اعتدال میں رہنا چاہیے۔ ارسطو کا دعویٰ یہ ہے کہ شاعری جذبات کی تطہیر اور تزکیہ نفس کرتی ہے۔ اور جذبات کی شدت میں کمی پیدا کرتی ہے۔

ارسطو نے بوطیقا کے شروع ہی میں اپنے دائرہ کار کا اعلان کر دیا ہے۔ کتاب کے پہلے دو ابواب میں ارسطو نے نقالی اور نقالی کے ذرائع پر بحث کی ہے۔ اگلے دو ابواب میں اس نے شاعری کے آغاز، شاعری کی اقسام، المیہ اور رزمیہ اور طربیہ پر بحث کی ہے۔ باب نمبر 6 میں ارسطو المیہ پہ بحث کرتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے المیہ کی نوعیت اور اصل پر گفتگو ہے پھر اس کے عناصر پلاٹ، کردار، آرائش پر اظہار خیال کیا ہے۔ اگلے باب میں پلاٹ پر روشنی ڈالی ہے کہ اسے مکمل ہونا چاہیے یعنی اس میں ابتدائی، درمیانی اور آخری حصہ

موجود ہو۔ باب نمبر 8 میں وحدت عمل اور باب نمبر 9 میں شاعری اور تاریخ کے فرق کی وضاحت کی ہے۔ باب نمبر 13 اور 14 میں رحم اور دہشت کے عناصر پر گفتگو کی ہے۔ اگلے دو ابواب میں کردار پر بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ پلاٹ کے مقابلے میں کرداروں کی اہمیت بہت کم ہے۔ باب نمبر 16 میں انکشافات اور اگلے دو ابواب میں المیہ نگاروں کے لئے کچھ ہدایات اور اصول تحریر کئے ہیں۔ باب نمبر 22 ,21 ,20 میں زبان کے استعمال، اہمیت اور استعارے پر بحث کی ہے۔ آخری چار ابواب میں رزمیہ (Epic) شاعری کے، پلاٹ اور ڈھانچے پر بحث کی ہے اور تجزیہ کیا ہے۔ المیہ اور رزمیہ کا موازنہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ المیہ ہر صورت میں رزمیہ سے بہتر اور اعلیٰ قسم کی شاعری ہے۔

بوطیقا ایک نامکمل کتاب ہے۔ اس کتاب کی ابتداء میں جو عنوانات قائم کئے گئے ہیں ان پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے آخری حصے شاید ضائع ہو چکے ہیں۔ اس نامکمل کتاب میں موجود مواد ہی مکمل تنقیدی نصاب بن کر اب تک نقادوں کو روشنی دکھا رہا ہے۔ کتاب اگر مکمل ہوتی تو نہیں ارسطو کن کن مفاہیم کی نشان دہی کرتا۔

ارسطو نے اپنے عہد میں موجود تمام علوم پر کاملیت حاصل کی۔ وہ اپنے عہد کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ پورے ایتھنز میں سب سے بڑی لائبریری ڈراما نگار یوری پیڈیز کی تھی، دوسری بڑی لائبریری ارسطو کی تھی۔

ارسطو کی علمی قابلیت، ذہانت، تحقیق، دانش اور فلسفیانہ صلاحیت، سائنسی، عمرانی تاریخ، تنقیدی طاقت کو ہر عہد کے انسان نے تسلیم کیا اور رہنمائی حاصل کی ہے۔ کولرج نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کسی بھی عہد کا انسان افلاطون اور ارسطو کے اثر سے نہیں بچ سکتا۔

ارسطو عالمی علوم کا پروفیسر تھا۔ مغرب، یورپ اور عربوں نے اس سے استفادہ کیا۔ مشہور دانش ور THOMPSON کے الفاظ پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں:

"A TEACHER OF ETERNAL VERITIES, TELLING OF SLEEP AND DREAMS, OF YOUTH AND AGE, OF LIFE AND DEATH, OF GENERATIONS AND CORRUPTION, OF GROWTH AND DECAY, A GUIDE TO THE BOOK OF NATUR, A REVEAL OF SPIRIT, A PROPHET OF THE WORKS OF GOD"

تذکرہ مکالمہ نگارانِ مکالماتِ افلاطون

(1) ایڈمینٹس (ADEMANTUS)

(432ء تا 382ء ق م / دور حیات)

ایتھنز کے آرسٹون کے بیٹے اور افلاطون کے سب سے بڑے بھائی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے افلاطون کی ''الجمہوریہ'' میں فعال کردار ادا کیا۔ اپالوجی، پیرمنیڈائٹرز میں بھی اس کا اہم رول ہے، ایڈمینٹس ''الجمہوریہ'' میں جب بحث میں مدخل ہوتا ہے تو وہ تشویشی ذہن کا حامل معلوم ہوتا ہے وہ مثالی شہر کے حکمرانوں کی خوشنودی کا ضامن لگتا ہے۔ وہ ایک اچھی زندگی گزارنے کا حامی نظر آتا ہے، اسی وجہ سے وہ دولت کا متلاشی اور چیزوں کی طلب کی طرف راغب دکھتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ہر معاملہ میں محتاط طرز فکر کا حامل ہے، اس کا بھائی گلاؤکون سقراط کی آخری 9 کتب میں سادہ ذہن کا طرفدار اور کم تخلیقی معلوم ہوتا ہے، یہ کالیٹوس کا رہائشی تھا۔

(2) اگاتھن (448ء تا 400ق م / دور حیات)

یہ ایک شاعر تھا، مگر اس کا کیا کام گم ہو چکا ہے، یہ افلاطون کی کتاب سمپوزیم میں نمایاں نظر آتا ہے، اور اس کا مکالمہ نگار ہے، 416ء ق م کو لیناایا میں ان کو ایک معرکہ سر کرنے پر ایک جشن کی تقریب میں جہاں ان کو انعام دیا گیا اور ضیافت کا اہتمام تھا، وہاں ان کا مکالمہ ہوتا ہے، اور بطور مزاحیہ کردار کے بھی جانے جاتے رہے، اس کے والد کا نام ٹسامنئس تھا۔

(3) السی بیاڈیز (دورِ حیات/450 تا 404ء ق م)

مشہور سیاستدان اور جنگجو تھا، انہوں نے ایک اسٹریجک مشیر، فوجی کمانڈر اور سیاسی رہنما کے طور پر اہم کردار ادا کیا، PELOPONNESIAN جنگ کے دوران انہوں نے 410 ق م کو ایک جارحانہ خارجہ پالیسی کی طرف داری کی۔ اور سسلی کی مہم کا زبردست حامی تھے، اور پھر سپارٹا بھاگ گئے، ان کے سیاسی دشمنوں نے ان پر اویتر یقون کا الزام عائد کیا، سپارٹا میں بطور اسٹریجک مشیر مقرر ہے، ایتھنز میں جنرل بھی رہے۔

415ء تا 412ء ق م سپارٹا اور 412 تا 411ء ق م پرسیا میں رہے، انہوں نے 410 ق م میں منعقدہ دو اہم جنگوں (1) ابیڈوس (2) سیزیکوس میں نمایاں کردار ادا کیا، اور 408 ق م میں بائیز انٹیم کے محاصرہ میں بھی مرکزی کردار تھے، اس کے والد کا نام کلینیاس تھا۔

(4) انٹی فون (480 تا 411 ق م)

5 ویں صدی ق م کی آخری دہائیوں میں ایتھنز میں رہے، ان کے مکالمات ''پیر منڈیز'' میں موجود ہیں۔ اس کے والد کا نام پیرلیامپس تھا۔

(5) اینی ٹس

انہوں نے PELOPONNESIAN کی جنگ میں بطور جنرل خدمات انجام دیں، اور وہ ایتھنز میں جمہوری تحاریک کے اہم حامی تھے، اور اس میں ٹائرنٹس کے پیچھے OLIGARCHIC افواج کی مخالفت کی۔ وہ سقراط کے استغاثہ میں سے ایک شامل تھا، اور افلاطون کے مکالمہ ''مینو'' میں بطور کردار مکالمہ نگار ہے، اس کا تذکرہ اپالوجی میں بھی ہے، اس کے والد کا نام اینتھمین تھا۔

(6) اپولوڈرس

سقراط کا ممتاز پیروکار، قدیم ایتھنک طالب علم فلسفی تھا، وہ افلاطون کے مکالمہ

سمپوزیم میں نظر آتا ہے، اس میں وہ افلاطون کے بھائی GALUCON (429 ق م) کی تاریخ ولادت کے مطابق ہونے کے طور پر نظر آتا ہے، وہ ایتھنز کی ایک بندرگاہ PHALERON کا رہائشی تھا، وہ ایک مالدار اور صاحب ثروت شخص تھا، سقراط کی موت کے وقت وہاں موجود تھا، اور پھر اس کی تعلیمات کے علمدار رہے، افلاطون اور دیگر مصنفین نے اس کا تذکرہ جذباتی طور پر غیر مستحکم اور سادہ ذہن رکھنے والے ایک فرد کے طور پر کیا ہے۔

(7) اریسٹائیڈز

اس کا تذکرہ افلاطون کے مکالمہ LACHES اور THEAGES میں نمایاں ملتا ہے۔

(8) اریسٹوڈیموس (5 ویں قبل مسیح صدی)

وہ افلاطون کی ''سمپوزیم'' میں ایک عمدہ کردار اور داستان گو نظر آتا ہے، علاوہ ازیں XENOPHON اور ARISTOPHANIS ONTENTS میں بھی نمایاں تذکرہ ہے، سقراط کا پیروکار تھا۔

(9) اریسٹوفینز (445 تا 384 ق م)

یونان قدیم کا طربیہ ڈرامہ نویس، چالیس سے زیادہ ڈرامے لکھے لیکن 7 محفوظ رہے، ہر ڈرامے کا موضوع ہم عصر سیاسی ومعاشرتی زندگی ہے، قدامت پسند تھا، اور سقراط کا مخالف، ایک طنزیہ اور مزاحیہ ڈرامے میں سقراط کا مذاق اڑایا ہمیشہ اپنے دور کی بڑی بڑی شخصیات کو تضحیک کا نشانہ بنایا تھا۔

(10) اریسٹوٹل

افلاطون کے مکالمہ پیرینائڈز میں اس کا ذکر موجود ہے، جہاں بطور مکالمہ نگار ہے۔

(11) اپاشیا (470 تا 400 ق م)

یہ ایک بااثر اور دولت مند عورت تھی، بعض اس کو فاحشہ کہتے ہیں۔مگر حقیقت میں شادی شدہ عورت تھی، جس کا بیٹا یونانی فوج میں ملازم ہوا، اس کا ذکر افلاطون نے اپنے مکالمہ میں کیا ہے۔

(12) ایگزیوچس (وسط 5 ویں صدی قبل مسیح)

یہ سکیمنائیڈ کا مکین تھا، اور لسیسائیڈ کا بیٹا تھا یہ ایلکمائنائیڈ خاندان کا فعال سیاسی کردار تھا، یہ ایلسبیڈیس (جنرل) کا چچا تھا، جو اسے امور داخلہ وخارجہ میں ساتھ رکھتا، اپاشیا کا بھتیجا، کلیپاس کا بھائی بھی تھا، 406 ق م کی جنگ آرگوناسی میں وہ جرنیلوں کا محافظ نظر آتا ہے، افلاطون نے اپنا ایک مکالمہ اسی کے نام سے منسوب کیا ہے، جس میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔

(13) کیلیاس 3

افلاطون نے اس کا تذکرہ اپالوجی اور پروٹا گورس مکالمات میں کیا ہے، یہ ایلوپلیس کا رہنے والا تھا، اور ہپونیکس کا فرزند تھا، ان کا خاندان مالدار تھا، اور یونان میں صاحب حیثیت تھا، کیلیاس بطور کمانڈر بھی تعینات رہا، 371 ق م میں سپارٹا کے امن معاہدہ میں بھی شریک تھے۔

(14) کیلکس (484 تا 405 ق م)

سیاسی فلسفی، افلاطون کے مکالمہ جارجیا میں نمایاں ہے، اور مستند شخصیت کا حامل تھا، ایک نوجوان طالب علم کا تاثر اس کے علوم سے ہوتا ہے، عدل کا حامی اور ظلم کا مخالف ہے، وہ قانون فطرت اور تخلیقات قدرت کا طرف دار دکھائی دیتا ہے، اس کے پاس اگرچہ کم ذرائع تھے، مگر اس کے باوجود جدید سیاسی فلسفے پر اثر نقوش چھوڑے افلاطون کے مکالمہ ''جارجیا'' میں اس کے مکالمے درج ہیں۔

(15) سیبز (430 تا 350 ق م)

افلاطون کے مکالمہ "فائڈو" میں اس کے مکالمے درج ہیں اس کو سقراط کے شاگرد کے طور پر یاد کیا جاتا ہے اور اپنے فن فلسفہ کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے۔

(16) سیفالس (کلازومینائے کا بیٹا)

یہ پرمینائڈز کا سپیکر ہے۔

(17) سیفالس (سائیروکس کا بیٹا)

یہ ریپلکا کا مکالمہ نگار ہے، فائیڈس میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔

(18) چائریفین (سفیٹس کا رہائشی)

چمیاڈس، جارجیا اور ہالسیان میں یہ بطور مکالمہ نگار ہے، 470 تا 399 ق م دور حیات ہے، سقراط کا شاہی رفیق تھا، لکھاری بھی تھا۔

(19) چارمائیڈس

اس کا تذکرہ پانچویں صدی عیسوی قبل مسیح میں ملتا ہے، افلاطون کا انکل تھا۔
زنوفن، سمپوزیم اور میمورپلا میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔ ایک بااثر آدمی تھا، 403ء کو جنگ میونیشیا میں مارا گیا تھا، ایتھنز کا شاہی فرد رہا، یہ گلاوکن کا بیٹا تھا، اور ایتھنز کا رہنے والا تھا۔

(20) کلینیاس

کنوسس کا رہنے والا، اپینومس اور لاء میں اس کا نام بطور سپیکر ملتا ہے۔

(21) کلینیاس

سکیمونائیڈ کا رہائشی ایگزیکس کا بیٹا، اس کے مکالمات ایگزیکس اور ایتھیڈمس میں

موجود ہیں۔

(22) کلٹیفون

ایتھنز کا مکین تھا، اریسٹونیمس کا بیٹا، کلیٹفون اور ریپبلک میں بطور مکالمہ نگار ہے، 5 ویں صدی کے وسط سے چوتھی صدی کے اوائل ق م تک دورِ حیات ہے۔ دانشور تھا، سقراط کا شاگرد بھی رہا۔

(23) کراٹی لس

(ایتھنز کا رہائشی / سمکرین کا بیٹا / کریٹاس اور ٹائمیوس کا مکالمہ نگار۔

(24) کراٹی آس (ایتھنز کا رہائشی / کیلکرس کا بیٹا مکالمات)

چارمیڈس اور پروٹوگورس کا مکالمہ نگار / 460 تا 403 ق م دورِ حیات / افلاطون کے انکل تھے، سقراط کا معاون تھا اور ممبر تھرٹی ٹائرنٹس تھا۔

(25) کراٹی آس

(ایتھنز کا رہائشی / لیڈاس کا بیٹا / کریٹاس اور ٹائمیوس کا مکالمہ نگار تھا)۔

(26) کریٹو

ایلوپیس کا مکین تھا، یہ بطور مکالمہ نگار، کریٹو خ ایوتھیڈمس اور فائیڈو میں ہے۔

(27) کٹیسپز

پائیانیا کا رہنے والا تھا، ایوتھیڈمس اور لائسس میں مکالمہ نگار ہے۔

(28) ڈیموڈوکس

اینجیرس کا رہنے والا تھا، اس کا ذکر بطور مکالمہ نگار روی ایجز میں ملتا ہے۔

(29)ڈینوسٹودورس

چیوس کامکین تھااورتھوری میں بھی قیام پذیر رہا، ایتھیڈمس میں اس کا مکالمہ ملتا ہے۔

(30)ڈائیوٹیما

یہ مانٹیناکا رہنے والا تھا، سمپوزیم میں اس کا مکالمہ افلاطون کے ساتھ ملتا ہے۔

(31)ایکریٹس

یہ فلس کا رہنے والا تھا، فائیڈرو کا مکالمہ نگار تھا۔

(32)ایراسیسٹر یٹس

یہ ایتھنز کا رہنے والا تھا، ایریکسیا ئز میں اس کے مکالمے افلاطون کے ساتھ ملتے ہیں۔

(33)ایریکسیا ئز

یہ اسٹیریا کا مقیم تھا، ایریکسیا ئز میں اس کے مکالمات افلاطون کے ساتھ ملتے ہیں۔

(34)ایریکز ماچس

یہ ایتھنز کا رہائشی تھااور ایکومینس کا بیٹا تھا، سمپوزیم میں بطور مکالمہ نگار ہے۔

(35)ایوکلائیڈز

میگارا کامکین تھا، تھیاٹیٹس میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔

(36)ایوڈیکس

ایتھنز کا رہنے والا تھا، اپیمانٹس کا بیٹا تھا، ہپاس میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔

(37) ایوتھیڈمس

یہ چیاس کا رہنے والا تھا، اورتھری میں بھی رہائش پذیر رہا۔

(38) ایوتھی فرو

یہ پروسپالٹا کا رہنے والا تھا، یہ بطور سپیکر مکالمات ایتھفرو میں موجود ہے۔

(39) گلاؤکن

کالیٹس کا مکین تھا اور اریسٹن کا بیٹا تھا، مکالمات پرمینڈس اور ریپبلک میں بطور سپیکر (مکالمہ نگار) افلاطون سے ہم کلام نظر آتا ہے، 445 تا 4 ویں صدی قبل مسیح دور حیات ہے۔ یہ افلاطون کا بڑا بھائی تھا، یہ سقراط کا اہم جانکار تھا۔

(40) گارجیاس

یہ لیونٹینی کا رہنے والا تھا، اور چارمینیڈ اس کا بیٹا تھا، گارجیا میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔

(41) ہرموکریٹس

سائراکیوز کا رہنے والا تھا، ہیمون کا بیٹا تھا، کریٹاس اور ٹیمائیوز میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔

(42) ہرموجینس

5 ویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کا ایک فلاسفر تھا، سقراط کا قریبی دوست تھا، اور افلاطون کے ساتھ اس کے مکالمات کریٹیس میں ملتے ہیں۔ یہ ہپونکس کا بیٹا تھا اور ایلوپیسے میں رہتا تھا۔

(43)ہپیاس

ایلس کا رہنے والا تھا، ڈیوپیتھس کا بیٹا تھا، ہپیاس اور پروٹوگورس میں اس کے مکالمات درج ہیں۔

(44)ہپوکریٹس

یہ ایتھنز کا مکین تھا، اپالوڈورس کا بیٹا تھا۔ پروٹوگورس (مکالمات) میں یہ افلاطون سے بطور مکالمہ نگار موجود ہے۔

(45)ہپوتھیلس

یہ بھی ایتھنز کا مکین تھا، ہیرونمس کا بیٹا تھا، اس کا تذکرہ لائسز میں بطور مکالمہ نگار ملتا ہے۔

(46)راین

ایفیسز کا رہنے والا تھا، اس کا تذکرہ اِین (ION) مکالمات میں بطور مکالمہ نگار ملتا ہے۔

(47)لیچس

اگیزون کا رہنے والا تھا، میلانوپس کا صاحبزادہ تھا، لیچس میں یہ بطور مکالمہ نگار ہے۔

(48)لائسیاس

تھوری اور ایتھنز میں رہنے والا یہ یونانی سیفالس کا پسر تھا، فائیڈرس میں اس کے مکالمے درج ہیں۔

(49)لائسٹی میکس

ایلوپیے کا باشندہ تھا، اریسٹائڈز کا بیٹا تھا، لیچس میں اس کے مکالمات موجود ہیں۔

(50) لائسز

ایگزونے کا رہنے والا تھا، ڈیموکریٹس کا بیٹا تھا، لائسز میں اس کے افلاطون کے ساتھ مکالمے موجود ہیں۔

(51) میگالسز

سپارٹا کا مکین تھا۔ لاز میں ان کے مکالمات موجود ہیں۔

(52) میلی سیاز

ایلوپیے کا رہنے والا تھا۔ تھوسیسیاڈائڈز کا بیٹا تھا۔ لیچز میں ان کا مکالمہ ہے۔

(53) میلیٹس

پتھوس کا رہائشی تھا، میلٹس ہی والد کا نام تھا۔ اپالوجی میں اس کا مکالمہ درج ہے۔

(54) مینو

فارسولوس کا رہنے والا تھا، الگزیمڈز کا بیٹا تھا، مینو میں ان کے مکالمات افلاطون کے ساتھ موجود ہیں۔

(55) پولس

اکارگاز کا رہنے والا تھا۔ گارجیا میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔

(56) دی ایٹسٹوس

سونیم کا رہنے والا تھا۔ ایفورونیس کا بیٹا تھا، سوفسٹ اور تھائیٹیس میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔

(57) زانتیھپے

سقراط کی بیوی تھی، الوپیے کی رہنے والی تھی، فائیڈو میں اس کے مکالمات افلاطون کے ساتھ موجود ہیں۔

(58) زینو

یہ الیا کا رہنے والا تھا۔ پرمنائیڈز میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔

(59) دی ایجز

یہ اینا گرس کا رہنے والا باشندہ تھا، ڈیموڈکس اس کے باپ کا نام تھا۔ دی ایجز میں اس کے مکالمے افلاطون کے ساتھ موجود ہیں۔

(60) ٹرپسن

یہ میگارا کا رہنے والا تھا، تھیاٹیٹس میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔

سقراط

ایلوپیے کا تھا۔ سٹیٹس مین میں اس کے مکالمے موجود ہیں۔ سوفرونکس اس کے باپ کا نام تھا۔

اس کے افلاطون کے ساتھ حسب ذیل مکالمے موجود ہیں۔

(1) الیسبیڈز

(2) الیسبیڈز 2

(3) اپالوجی

(4) ایگزیوچس

(5) چارمیڈس

(6) کلیٹوفون

(7) کریٹلس

(8) کریٹیاس

(9) ڈیموڈکس

(10) اریکسیائز

(11) ایوتھیڈمس

(12) ایوتھی فورو

(13) گارگیاس

(14) ہیلیکان

(15) ہپارچس

(16) ہپالیس

(17) ائین

(18) لیچس

(19) لائسز

(20) میکنیسز

(21) مینو

(22) آن جسٹس

(23) مینوس

(24) آن ورچ

(25) پرمیڈس

(26) فائیڈو

(27) فلیبس

(28) پرٹوگورس

(29) ریپلک

(30) رائیول لورز

(31) سیسی فس

(32) سوفسٹ

(33) سمپوزیم

(34) تھیاٹیٹاس

(35) دی ایجز

(36) ٹائمیاس

افلاطون کی ازدواجی زندگی

افلاطون نے تمام عمر شادی نہ کی، بمطابق انٹرنیٹ وہ عورت سے ذاتی تعلق کو ترجیح نہ دیتا تھا، بلکہ وہ ہم جنس پرستی کی طرف مائل تھا۔ چونکہ وہ تمام عمر مجرد رہا اسی لئے اس کی اولاد بھی نہ تھی۔

کلام اقبال میں افلاطون کا تذکرہ

ضمیرِ پاک وہ نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں
(بال جبریل/غزلیات (حصہ دوم) غزل 3، شعر نمبر 5 / اقبال)

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
(ضرب کلیم = (اسلام اور مسلمان) مدنیت اسلام: 4)

مکالماتِ افلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں
(ضرب کلیم = عورت: 3)

تڑپ رہا ہے، افلاطوں میانِ غیب و حضور
ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے، اعراف
(بال جبریل = غزل 3:60/اقبال)

مرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب میں افلاطوں کی تیزیٔ ادراک
(ضرب کلیم = (ادبیات) جلال و جمال، شعر نمبر 1)

کتابیات

(ماخذ ومصادر/جن کتب سے کتاب کی تیاری میں مدد لی)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مترجم	ناشر	سن اشاعت
1	ایک سو عظیم فلسفی	سید یاسر جواد	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	N.D
2	فلسفہ وعلم الکلام	صفدر علی	ایورنیو بک پیلس اردو بازار، لاہور	N.D
3	علم ودانش کے معمار	احمد عقیل روبی	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	2011ء
4	ریاست (افلاطون)	مترجم: ڈاکٹر ذاکر حسین	فکشن ہاؤس، لاہور	2000ء
5	عالمی انسائیکلوپیڈیا	یاسر جواد	الفیصل ناشران، لاہور	2012ء
6	سو عظیم آدمی	مائیکل ہارٹ/محمد عاصم بٹ	تخلیقات لاہور	2002ء
7	فلسفہ اسلام	ڈی اولیری/احسان احمد	بک ہوم، لاہور	2003ء
8	فلسفہ کے مسائل	ایس ایم شاہد	ایورنیو بک پیلس اردو بازار، لاہور	س-ن
9	جدید مغربی فلسفے کی تاریخ	ایس ایم شاہد	ایورنیو بک پیلس، لاہور	س-ن
10	اسلام اور فلسفہ	ایس ایم شاہد	ایورنیو بک پیلس، لاہور	س-ن
11	مسلم فلسفہ	صفدر علی	ایورنیو بک پیلس، لاہور	N.D
12	فلسفہ جدید کے خدوخال	پروفیسر خواجہ غلام فاروق	شعبہ فلسفہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور	1978
13	افلاطون	شاہد مختار	شاہد پبلشرز، چوہدری سینٹر، لاہور	N.D

افلاطون (427 تا 347 قبل از مسیح)

افلاطون کا اصل نام ارسٹوکلیز تھا لیکن اپنے کسرت بھرے جسم اور چوڑے شانوں کی وجہ سے افلاطون کے نام سے مشہور ہوا یونانی زبان میں Plato کا مطلب بھی چوڑے شانوں والا ہے۔

افلاطون 427 قبل از مسیح میں ایتھنز کے ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوا۔ افلاطون یونان کے موثر ترین فلسفیوں میں سے ایک ہے۔ قدیم یونانی فلسفی افلاطون کی فکر مغربی سیاسی فلسفہ اور بہت حد تک اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی فلسفہ کے نقطۂ آغاز کو ظاہر کرتی ہے۔ فن مکالمہ نگاری کو ایک اچھوتے انداز میں متعارف کروانے اور بعد ازاں اسے درجہ کمال تک پہنچانے میں افلاطون کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ افلاطون عظیم فلسفی سقراط کا شاگرد تھا نوجوانی میں افلاطون کی سقراط سے ملاقات ہوئی جو بعد میں افلاطون کا دوست اور رہنما بن گیا۔ ایک سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے خاندان کے چشم و چراغ اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل افلاطون کے بارے میں گمان کیا جاتا تھا کہ وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کسی بڑے عوامی عہدے سے کرے گا لیکن افلاطون نے اس کے برعکس سیاسی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور سیاسی اقتدار پر فلسفیانہ غور و فکر کو ترجیح دی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ سقراط کے قتل کے ضمن میں جو ناانصافیاں ہوئی تھیں انہوں نے افلاطون کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ افلاطون کے الفاظ میں سقراط دانا ترین، عادل ترین اور ان سب لوگوں میں سے بہترین ہے جن سے آج تک میں مل پایا ہوں۔ سقراط کی موت کے کچھ عرصے بعد ہی افلاطون نے ایتھنز چھوڑ دیا اگلے دس یا بارہ برس سفر میں گزارے افلاطون نے مصر اور دیگر ممالک کا بھی سفر کیا افلاطون نے دنیا میں پہلی یونیورسٹی قائم کی جس کا نام "اکیڈمی" تھا۔ افلاطون کے مکالمات ان کی اہم ترین تحریریں ہیں افلاطون کے مکالمات تین ادوار کا احاطہ کرتے ہیں ممتاز فلسفی ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا۔ ارسطو نے افلاطون کی اکیڈمی میں تعلیم حاصل کی افلاطون کی سب سے مشہور کتاب "Republic" ہے۔ جس میں افلاطون نے ایک آئیڈیل سوسائٹی کو پیش کیا ہے۔

محمد اسد

کامران اعظم ولد محمد اعظم جنجوعہ 20 دسمبر 1976 کو تاریخی قصبہ سوہدرہ (تحصیل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے، میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول سوہدرہ سے 1993 میں کیا، انٹر (1995) کے بعد محکمہ تیل و گیس (OGDCL) میں ملازم ہو گئے، (1996 تا 2000) ضلع چکوال، (2000 تا 2009) ضلع ڈیرہ بگٹی، (بلوچستان) 2009، تا حال ضلع گھوٹکی (سندھ) میں تقرری ہے۔ 2006 میں اولین کتاب عمر بن عبدالعزیز طبع ہوئی۔ اس کے بعد کامران اعظم کا قلم رکا نہیں ان کے قلم سے 50 کے قریب کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

جن میں تاریخی شخصیات، قرآن کی صورتوں کی مختلف تفسیریں بھی شامل ہیں۔ ان کا قلم ابھی تک رواں دواں ہے۔ ان کے لکھنے کی بھوک بڑھتی جا رہی ہے۔

ادارہ سٹی بک پوائنٹ کے لئے کامران اعظم مختلف کتابوں پر کام کر رہے ہیں اس سلسلے کی اک کڑی یہ کتاب ہے خدا کامران اعظم کو مزید کتب لکھنے اور ترتیب دینے کی ہمت عطا کرے۔

ادارہ